

ابنِ صفحی

جاسوسی دنیا

27- چارشکاری

28- بے گناہ مجرم

29- لاشوں کا آبشار



پیشہ

جو داستان پیش کی گئی ہے اپنی دلچسپی کے اعتبار سے ابن صفی کے دوسرے کارناموں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ اس ناول میں سرجنت حید نے صحیح معنوں میں خود کو فریدی کا جانشین ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک خوفناک سازش کا شکار ہو کر قانون کی نظروں میں مجرم بن جاتا ہے اور اُسے روپوشنی اختیار کرنی پڑتی ہے.... ایک ایسی لڑکی قتل کر دی جاتی ہے، جو سرجنت حید کو کسی ریاست کا شہزادہ سمجھتی ہے.... کیوں سمجھتی تھی؟.... اس پر خود حید کو بھی حیرت تھی.... ایک بینک کا ذریعہ من سونا خاک ہو جاتا ہے.... ایسے شکاری جو کوؤں کا شکار کھلتے تھے.... بھلا سونے کی خاک اور کوؤں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے.... لیکن فریدی اپنی حرمت انگیز معلومات کی بناء پر دونوں کا تعلق ڈھونڈتی نکالتا ہے.... حید تھا مجرموں کا مقابلہ کرتا ہے اور ایک جگہ شراب پی کر وہ کتوں کی طرح بھونکتا ہے.... مجبوراً فریدی کو اس پر مٹھندا اپنی ڈالنا پڑتا ہے.... چاروں شکاری کیا کر رہے تھے.... انہوں نے جوڑھوگ پھیلایا تھا اس کے لئے پس منظر میں کیا تھا؟

میراد عویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو بار بار پڑھیں گے۔

(پبلش)

شامت

تمن موڑ سائیکلیں برابر سے سڑک پر دوڑ رہی تھیں۔ سرجنت حید نے کئی بار کوشش کی کہ اپنی موڑ سائیکل ان کے درمیان سے نکال لے جائے لیکن کامیاب نہ ہوا۔ وہ تینوں رہ رہ کر ایک ساتھ اس طرح لہریں لیتی تھیں کہ سڑک کی پوری چوڑائی ان کے جذبہ عمل میں آجائی تھی۔ حید ہارن پر ہارن دیتا رہا لیکن ان تینوں سواروں کے کافنوں پر جوں تک نہ رہ سکی۔ حید کو تاؤ آگیا۔ اگر وہ تنہا ہوتا تو شاید اُسے تاؤ نہ آتا لیکن بات دراصل یہ تھی کہ پچھلی سیٹ پر اُس نے ایک خوبصورت سی لڑکی کو بھی لادر کھا تھا اور وہ راستے بھر اُسے طرح طرح کے کرتے دکھا کر اُس کی سریلی چینیں سنتا آیا تھا۔ ایک بار تو اس بھاری کو بالکل بیچن ہو گیا تھا کہ وہ دونوں موڑ سائیکل سیست چکتا چور ہو جائیں گے۔ ہوا یہ کہ حید نے ایک سائیکل سوار کے قریب سے گذرتے وقت اُس کی ثوپی اچک لی۔ تو ازان جو گڑ بڑا تو موڑ سائیکل سڑک کے نیچے آتی گئی۔ اگر حید نے فوراً ہی پینٹل نہ سنبھال لیا ہوتا تو موڑ سائیکل دس پندرہ فٹ گھری کھائی میں چل گئی ہوتی۔

اس نے تو وہیں سے واپسی کے لئے بلوچان اشروع کر دیا تھا لیکن حید پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ بالی کمپ کے اکلوتی ریسٹوران میں اسٹیک کھائے بغیر والجی کا سوال ہی نہ پیدا ہو گا۔ اس لڑکی کا نام سارہ تھا۔ یہ انگلو اٹھین تھی لیکن اردو اتنی صاف بولتی تھی کہ اہل زبان کا دھوکا ہوتا تھا۔ البتہ بعض اوقات باتوں کی رو میں لہجہ نہ سنبھال پاتی تھی۔ اس کے اور حید کے تعلقات کے متعلق

صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ اس کی نئی دریافت تھی۔ ایک رقص گاہ میں ان کی ملاقات ہوئی اور پھر دونوں میں گاؤں گھی چھنے لگی۔

آج اتوار تھا۔ حید فریدی سے کٹ کر سارہ کے ٹھکانے پر پہنچا اور اسے بالی یکپ کی طرف لے اڑا۔ بالی یکپ جنگ کے زمانے میں یقیناً یکپ رہا ہوا لیکن اب تو وہاں لو ہے کے کئی کارخانے قائم ہو گئے تھے اور ان بار کوں میں مزدور رہنے لگے ہیں جن میں کبھی فون رہا کرتی ہو گی۔ بہر حال پر فضا جگہ ہونے کی بناء پر اب اسے تفریق گاہ کی حیثیت سے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ تاریخ میں جانے والی سڑک کی ایک شاخ مشرق کی طرف مرگی ہے۔ یہی بالی یکپ والی سڑک کا راستہ ہے۔ اس سڑک کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔ نہ جانے کیوں؟ یہ اب تک صرف ”بالی یکپ والی سڑک“ کہلاتی ہے اس کے شروع پر ایک کھبے پر ایک تیر نصب ہے جس پر ”بالی یکپ“ لکھا ہے اور اس سڑک کے دونوں طرف سر بزریلے ہیں جن پر اکثر بھیڑوں کے رویوڑ کھائی دیتے ہیں۔ تاریخ میں سڑک سے کٹنے کے بعد بالی یکپ تک درمیان میں کوئی آبادی نہیں ملتی۔

”سارہ ڈار لگک...!“ حید گلگتیا۔ ”مکرا دوں...!“ کسی سے۔

”میں نہیں جانتی۔“ سارہ کے ٹیکھ میں جلاہٹ تھی۔ ”میری نس نس ٹوٹ گئی ہے۔“

”سارہ ڈار لگک! اس وقت زندگی کا حسن بڑھ گیا ہے۔“

”تم سور ہو...! اب میں کبھی تمہارے سامنے نہ نکلوں گی۔“

”اوہو...! تو تمہیں یقین ہے کہ تم آج زندہ جاؤ گی۔“

سارہ نے جلا کر اس کی پشت پر کے جھاڑنے شروع کر دیئے۔ حید نے موڑ سائیکل کو ایک گہری لہر دی اور آگے جانے والی موڑ سائیکلوں کے درمیان سے صاف نکال لے گیا لیکن وہ اپنے پیچھے بیٹھی ہوئی سارہ کی حرکات و سکنات سے قلعی لاعلم تھا۔ اس نے اس سے اپنے نکال کی دبو ضرور چاہی مگر یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ ان تینوں کو کسی قسم کا اشارہ کر کے پھر اس کی پیٹھ پر دھولیں جانے لگی تھی۔

”روکو! اسے روکو...! میں مری...!“ دفعتاً اس نے چینا شروع کر دیا۔

حید نے رفتار کم کر کے موڑ سائیکل سڑک کے کنارے لگادی۔

”ہائے...!“ سارہ سڑک کے کنارے بے تحاشہ گر کر رہا ہے۔

”کیا ہوا...?“ حید اس پر جھک پڑا۔

”ہائے...!“ سارہ سڑک کے کنارے بے تحاشہ گر کر رہا ہے۔

”کیا ہوا...?“ حید اس پر جھک پڑا۔

”ہائے...!“ وہ کسر پر ہاتھ رکھ کر اینٹھ گئی۔ ”پتہ نہیں... کیا ہو گیا... اف... ہائے۔“

تینوں موڑ سائیکلیں نظر سے او جھل ہو گئی تھیں اور سڑک بالکل بنسان تھی۔

حید اسے سہارا دے کر ٹیلوں کی طرف لے گیا۔

وہ گھاس پر لیٹ گئی۔

”آخر بتاؤنا...!“

”پیلوں میں... نہ جانے کیا ہو گیا... ہائے۔“

”یہ تو بہت بُرا ہوا۔“ حید نے بوکھلا کر کہا۔ ”اب یہاں کیا کیا جا سکتا ہے۔“

”مجھے دفن کیا جا سکتا ہے۔“ سارہ جھلکا کر بولی۔

”یہ بھی مجھے اکیلے کے بُس کاروگ نہیں۔“

”سور ہوتا... چپ رہو... ہائے... ہائے۔“

”اچھا تو چلو...! اب یکپ تھوڑی دور ہے... وہاں ڈسپنسری بھی ہے۔“

”چھوڑو! مجھے... ٹپے جاؤ یہاں سے۔ اُس نے گھاس پر لوٹ گا۔“

”یعنی تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤ۔“

”اُف... ہائے... ہائے... چپ پر ہو۔“

”اچھا چپ ہوں... مگر...!“

”ہائے... چپ...!“

”اُرے... پھر چپ...“

حید نے کمی بار جھنجلا کر اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ کیا لیکن.... کامیاب نہ ہوا۔ سارا برابر کراہی ہے جاری تھی۔ نہ وہ موڑ سائیکل پر بیٹھ کر بیچہ رات سڑک پر رضامند ہوتی تھی اور نہ یہی بتاتی تھی کہ تکلیف کی نو عیت کیا ہے۔ وہ سر اسیکی کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ نیلے کی دوسری جانب سے ایک آدمی ان کی طرف آتا نظر آیا۔ سارہ کو زمین پر تڑپتے دیکھ کر وہ

رک گیا۔ پھر اُس نے جواب طلب نظر وہ سے حید کی طرف دیکھا۔ وضع قطع سے کسی اچھی سوسائٹی کا فرد معلوم ہوتا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ اُس نے حید سے پوچھا۔

”اچاک دنوں پسلیوں میں کچھ..... نہیں بلکہ نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”اوہ.... مطلب ہی پر تو میں بھی غور کر رہا ہوں۔“

”خیر! میرے لائق کوئی خدمت۔“ اُس نے تشویش ناک لمحے میں پوچھا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“ حید پر جھلائیت سوار ہو رہی تھی۔

”میرے خیال سے انہیں ادھر لے چلے۔“ اُس نے میلے کی دوسری طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ہمارے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی ہے۔“

میلے کی دوسری طرف والے نشیب میں تین چار آدمی مختلف قسم کی تفریحات میں مشغول تھے۔ ان کے ساز و سامان سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس طرف پنک کی غرض سے نکل آئے ہیں۔

ٹھوڑے فاصلے پر ایک خوبصورت سی کار بھی کھڑی ہوئی تھی۔

حید اور سارہ کو دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔ سارہ ہولے ہولے کراہتی ہوئی حید کے سہارے چل نہیں بلکہ ریگ رہی تھی۔ ان کے ساتھ والے آدمی نے اپنا کوٹ اتار کر زمین پر بچھاؤ اور سارا کروٹ کے بل گر کر ہائپنے لگی۔

”ڈاکٹر....!“ حید کے ساتھ والے نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کو مخاطب کیا۔

”اچاک ان کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے۔“

”اوہ....!“

”ڈاکٹر....!“ حید نے اپنے ذہن میں دہرایا اور بغور اُس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ خدو خال کچھ جانے بچانے سے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ آخر اُس نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ جب کچھ یاد نہ آیا تو اُس نے اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالیہ نشان کو تاریک گوشوں میں دھکیل دیا۔

ڈاکٹر سارہ پر جھکا ہوا اُس سے تکلیف کی نوعیت معلوم کر رہا تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد اُس نے ر

انھا کر کہا۔

”کوئی تشویش ناک بات نہیں! اکثر اچاک جھکلوں کی بنا پر رگوں اور پھونوں میں اس قسم کی تکلیف ہو جاتی ہے۔ میرے خیال سے تھوڑی سی براثنی مناسب رہے گی۔“

”براثنی....!“ حید نے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہمارے پاس موجود ہے۔“ ایک آدمی باسکٹ میں ہاتھ ڈالتا ہوا بولتا۔

اُس نے گلاس میں تھوڑی سی براثنی انڈیل کر سارہ کی طرف بڑھا دی۔ سارہ نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر کے زمین پر لٹڑھ کا دیا اور پھر لیٹ گئی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ حید شدت سے بور ہو رہا تھا۔ سارہ تفریح کر کر ری ہو کر رہ گئی تھی۔ اب بالی کیپ پہنچنے سے زیادہ اُسے واپسی کی فکر تھی۔ لیکن سارہ کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کم از کم ایک آدمی گھنٹے سے قبل واپسی کے لئے تیار نہ ہو سکے گی۔

حید مجبور امور سائیکل بھی اسی طرف دھکیل لایا۔

”شاید آپ اسٹوڈنٹ ہیں۔“ ڈاکٹر نے حید کو مخاطب کیا۔

”میں ہاں۔“ حید نے خاکسار ان انداز میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ لوگوں کی تفریح میں غلط پڑا۔“

”میں بالکل نہیں۔“ ڈاکٹر نہ کربولا اور اپنے آگے رکھے ہوئے گلاس میں براثنی انڈیلے نگاہ بقیہ لوگوں نے بھی اپنے گلاس سنپھال رکھتے تھے۔

”آپ بھی بیجھے۔“ ڈاکٹر نے اپنا گلاس حید کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”میں... شکریہ... میں نہیں پیتا۔“

”مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔“ ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔

”حقیقت عرض کر رہا ہوں۔“

”میا آپ نے کبھی نہیں پی۔“

”یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔“

”دیکھئے میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔“ ڈاکٹر نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ عادی نہیں۔ لیکن خیر جانے دیجئے بعض کمزور دماغ کے آدمی بیکنے کے خوف سے پینے سے گریز کرتے ہیں۔“

اس جملے پر حمید کو تاؤ آگیا اور پھر اُس نے یہ ثابت کرنے کے لئے گلاس اٹھایا کہ وہ اعصابی کمزوری کا شکار نہیں ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ اسے ایک ہی سانس میں خالی بھی کر دیا۔ اس نے فاتحانہ انداز میں سارہ کی طرف دیکھا اور وہ ڈاکٹر کو مخاطب کر کے بولی۔

”میا آپ کی براثتی مفت کی ہے۔“

”نہیں تو... کیوں؟“

”آپ نے بہت بُرے آدمی کو دعوت دی ہے۔“ اُس نے ہس کر کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”آپ کو پوری بوٹل کی یاد میں آنسو بہانے پڑیں گے۔“

”نہیں.... خیر.... اتنے پیکر نہیں معلوم ہوتے۔“ ڈاکٹر حمید کی طرف دیکھ کر رہا۔

”حمید نے انتہائی بے تکلفی سے بوٹل اٹھا کی اور کافی مقدار میں براثتی انٹیلیں کر سوڑے کی بوٹل کھولنے لگا۔ ڈاکٹر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حمید کو دعویٰ دے کر حقیقی حمایت کر بیٹھا ہو۔

”معاف کیجیے گا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”دو تین گپ میں تو میرے کان بھی گرم نہیں ہوتے۔“

اُس نے دوسرا گلاس بھی پیا نہیں بلکہ پیٹ میں انٹیلیں لیا۔ ٹھیک میں آکر اُس نے یہ حرکت کر ڈالی لیکن یہ سوچ رہا تھا کہ میں کی خراش عرصے تک تکلیف کا باعث نہیں رہے گی۔ براثتی کافی تیز اور پرانی معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے آدمیوں کے چہروں پر تحریر کے آثار دیکھ کر اُس نے تیرے گلاس کے لئے بوٹل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور سارہ ہٹنے لگی۔

”معاف کیجیے گا۔“ ڈاکٹر نے بوٹل اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ بڑی بے دردی سے پی رہے ہیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“

اس نے بوٹل باسکٹ میں ڈال دی۔

”دیکھئے آپ مہمان نوازی کی روایات کو پانی پلا رہے ہیں۔“ حمید ہس کر بولا۔ پھر وہ غذا سے احساس ہوا کہ واقعی چڑھ رہی ہے۔ وہ ”پانی پھیرنے“ کے محاورے کو غلط بول گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ نہیں میں اُس نے روایات کو پانی پلا دیا۔ اس نے دوبارہ اپنے جملے پر غور کیا تو اُسے بڑے زور سے ہٹی آگئی۔

وہ لوگ بھی بہنے لگے اور حمید اپنے ذہن سے کشتی لڑنے میں مشغول ہو گیا۔ شراب واقعی بہت تیز تھی۔ اُسے اپنا جسم ہوا میں پینگیں لیتا ہوا معلوم ہونے لگا تھا۔ اُسے اپنی حمایت پر غصہ آیا اور نئے کی تیزی کچھ اور بڑھ گئی۔ اور پھر جب شام کی خندنی ہوانے اُس کے کان سہلانے تو مزہ ہی آگیا۔

”اب چلو اٹھو۔“ اُس نے سارہ کو اس طرح ڈالنا جیسے وہ اس کی بیوی ہو۔

”میری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہوئی۔“ سارہ جھلا کر بولی۔

”ایسی جلدی بھی کیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”ابھی بہت وقت ہے۔ پانچ ہی تو بچے ہیں۔“

پھر وہ سب سارہ اور حمید کو لڑتے چھوڑ کر آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ یہ گفتگو سیاسی معاملات پر تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے حمید وغیرہ کی آمد سے قبل بھی اُن کا موضوع گفتگو سیاست ہی رہا ہو۔

ڈاکٹر شاید اپنے ساتھیوں کی کٹ جھنی سے عائز آگیا تھا۔ اُس نے زیج ہو جانے والے انداز میں کہا۔ ”بھی جیسے بعض سرکاری معاملات کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے اب تمہیں کس طرح سمجھا گا۔ اچھا سے یوں سمجھ لو!“ ہتھرے آدمیوں کو معلوم ہے کہ دلاور گزر سے سونے کی بھاری مقدار بیہاں آنے والی ہے۔ لیکن شاید انہیں یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کس تاریخ کو اور کس ٹرین سے آئے گی۔

”معلوم کیوں نہ ہو گا۔“ ایک آدمی بولا۔

”قطیعی نہیں۔“ ڈاکٹر نے سر ہلا کر کہا۔ ”عوام کو ایسی باتیں نہیں معلوم ہونے پاتیں۔“

دفعتہ حمید فاتحانہ انداز میں ان کی طرف مڑا۔ اس کا داماغ اس وقت اس کی کھوپڑی کے اوپر لہر رہا تھا۔

”کیا.... فر.... میا آپ نے! عوام کو.... یہ باتیں نہیں معلوم.... ہا.... ہا.... پھس میں بھی عوام ہوں.... لیکن.... پھس.... میں جانتا ہوں۔“

ڈاکٹر ہٹنے لگا۔

”اس وقت تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ خلیل خاں آج کل شتر مرغ اڑاتے ہیں۔“

”ہاں.... آپ.... اڑاتے تو ہیں۔ خلیل خاں میرے چھاپیں۔“ حمید اپنے سینے پر ہاتھ مار

کربولا۔

"واقعی چیز ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور سب ہنسنے لگے۔ حمید کو غصہ آگیا۔

"تم پر چھڑا گئی ہے۔" وہ گرج کربولا۔ "میں بتا سکتا ہوں کہ سوتاک آ رہا ہے۔"

"یار مت کان کھاؤ۔" ڈاکٹر بُرا اسمانہ بتا کر بولا۔ "تمہیں پلا کر میں نے اپنے سر عذاب مول لے لیا۔"

"خداقشم.... وہ تیرہ تاریخ کو سترہ ڈاؤن سے آئے گا۔"

وہ سب حلق پھاڑ کر ہنسنے لگے۔ حمید نے غصے میں اپنے ہی منہ پر تھپٹر مار لیا اور اتنا زور دار کہ اسے لڑکھا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ جانا پڑا۔

"شکر کرو کہ یہ تھپٹر میرے ہی منہ پر پڑا ہے۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"یار کیا آفت مول لی ہے۔" ڈاکٹر نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "اب اگر ان حضرت نے اس وقت موڑ سائیکل استعمال فرمائی تو سیدھے ملک الموت سے بخل کیر ہو جائیں گے۔"

"چوپ راو۔" حمید جھومنتا ہوا بولا۔ "آؤ سارہ ڈار لنگ چالیں۔"

"ہرگز نہیں اسی غلطی بھی نہ سمجھے گا۔" ڈاکٹر نے سارہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہمیں.... تم میری محبوبہ پر.... عاشق ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔" حمید ڈاکٹر کو مکا دکھا کر بولا۔ "ہمیاں چور کر دوں گا۔"

"صاحب زادے ہوش میں آؤ.... ورنہ....!"

"معاف کر دیجئے....!" سارہ گھبرا کر بولی۔ "یہ نئے میں ہیں۔"

"ڈار لنگ.... ڈار لنگ.... تم میری توہین کر رہی ہو۔"

"چپ رہو۔" سارہ نے اسے ڈانتا۔

"ہائے تم بھی ڈاکٹر ہو گئیں۔" حمید گلوگیر آواز میں بولا۔

"میں کہتی ہوں، بالکل زبان بند رکھو۔"

"ارے تو بتاؤنا کہاں بند رکھوں۔"

"آپ واپس کس طرح جائیں گی۔" ڈاکٹر نے سارہ سے پوچھا۔ "یہ تو بالکل بیکار ہیں۔"

"اگر میں بیکار ہوں تو تم واہیات ہو۔" حمید حلق کے مل جیتا۔

"اگر آپ انہیں اور مجھے اپنی کار میں شہر تک پہنچا دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔" سارہ نے کہا۔

"اور آپ میں سے کوئی ان کی موڑ سائیکل پر بیٹھ لیں۔"

"ٹوپ پر بیٹھ لیں۔" حمید مکاتباں کر سارہ کی طرف بڑھا۔

"آپ عجیب آدمی ہیں۔" ڈاکٹر نے اسے پکڑ لیا۔

"ہاٹ... جاؤ... میں اسے مارڈا لوں گا۔"

ان سب نے حمید کو پکڑ کر بٹھایا۔ سارہ بے تحاشہ ہس رہی تھی۔

"ہانتی ہو... گویا میں کتنے کا پلا ہوں۔"

"چپ رہئے جتاب.... آپ تو واقعی....!" ڈاکٹر بے بیس سے بولا۔

"تائیں چپ رہتا جتاب.... آپ خود جتاب۔"

ڈاکٹر کے ساتھی بہت زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا بھی کہ ان دونوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا دیا جائے لیکن انہوں نے دھیان نہ دیا۔

"آپ کاتام کیا ہے جتاب!"

"کبھی نہیں.... بتاؤں گا.... تم لوگ مجھ کو الو سمجھتے ہو۔"

"نہیں نہیں.... ہم آپ کو انو سے بھی بڑی چیز سمجھتے ہیں۔"

"میں چیز ہوں....؟" حمید بگڑ کر بولا۔ "آپ خود چیز ہیں.... چیز ہیں.... چیزوں.... چیزوں۔"

"میرے خیال سے آپ انہیں چھوڑیے اور چلے ہمارے ساتھ۔" ایک نے سارہ سے کہا۔

"نہیں یہ ناممکن ہے۔" سارہ بولی۔

"دیکھا تم نے.... دیکھا۔" حمید اس کے چہرے کے سامنے انگلی نچا کر ہنسا۔ تاریکی پھیلنی جاری تھی۔ حمید زمین پر داہنی کہنی بیک کر سارہ اکی آنکھوں میں ویکھنے لگا۔

"لیا کہتی ہیں آپ۔" ڈاکٹر نے سارہ سے پوچھا۔

"پچھے ناہیں کہتی.... جاؤ.... چالے جاؤ۔" حمید نے ہاتھ جھنک کر کہا۔

"مان جاؤ ڈار لنگ۔" سارہ اس کا سر سہلا کر بولی۔

"ہائے.... ایسے بولوں ہا۔ مان گیا.... چالو۔"

حمد لڑکھا اتا ہوا اٹھا اور وہ سب زمین پر بکھرا ہوا سامان سینے لگے۔

کار میں بیٹھتے ہی حمید کا نشہ ہرن ہونے لگا کہ سارہ اسے اس حالت میں اپنے کوارٹر میں تو ہر گز نہ لے جائے گی۔ سارہ فریڈ کے متعلق آج تک کچھ نہ بتایا تھا۔ پھر فریدی اوز اس کی باز پرس کا خیال آتے ہی اس کے جسم پر کچھی طاری ہو گئی! وہ شروع ہی سے اس جدوجہد میں مصروف تھا کہ نئے کرپنے میں پر گلے نہ آنے والے گزرہ رہ کر اٹھنے والی اس لہر کو کیا کرتا، جو اسے بیکن پر مجبور کر رہی تھی اچانک ذہن نے پھر پلانا کھایا اور اسے اپنے اوپر غصہ آنے لگا کہ آخر وہ فریدی سے اتنا ڈرتا کیوں ہے، یہ بزدلی ہے۔ کمزوری ہے۔... بالکل کمزوری ہے۔

”میں پیوں گا.... اور پیوں گا....!“ وہ حلق پھاڑ کر چینا۔ ”کسی کے باپ کا ساجھا۔“

”خرید کر پینا.... برخوردار....!“ داکٹر مسکرا کر بولا۔

”خرید کر پیوں گا.... پرید کر خیوں گا۔ سمجھتے ہو۔ میں بزدل نہیں ہوں۔“

مرمت

کپاڈنڈ میں شور سن کر فریدی بامن نکل آیا۔ دو تین نوکر کتے خانے کے قریب کھڑے نہ رہے تھے۔ وہ اس طرف اندر ھیرا ہونے کی بناء پر اُن کے چہرے نہ دیکھ سکا لیکن ہر ایک کی آواز“ بخوبی پچان رہا تھا۔

”کیا بات ہے....!“ اُس نے بلند آواز میں پوچھا۔
شانا چھا گیا۔ تو کر خاموش ہو گئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اُس نے کسی آدمی کو کتوں کی طرح بھوکنے سنا۔

”میا بیوڈگی ہے۔“ اس نے چھپلا کر کھا۔ تینوں نوکر دہاں سے ہٹ کر پور میکوں میں آگئے۔
بھوکنے کی آواز بدستور جاری تھی۔

”کیا ہے....؟“ فریدی کو غصہ آگیا۔

”حمد صاحب۔“ ایک نوکرنے کیا اور بے ساختہ نہیں پڑا۔

”اندر جاؤ۔“ فریدی انہیں گھور کر بولا۔ پھر اس نے حمید کو آواز دی لیکن وہ برابر بھوکر رہا۔
فریدی چھپلا ہٹ میں آگے بڑھا۔
حمد کتے خانے کے کٹھرے سے منہ ملائے زمین پر بیٹھا بھوک رہا تھا۔
”یہ کیا حرکت....!“
”بھوں....!“ حمید نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔
فریدی نے اس کی گردن پکڑ کر اسے ایک جھیلکے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔
”چیاں.... چیاں.... چیاں.... چیاں....“ حمید اس طرح چالیا جسے کوئی کتا پتھر کھا کر بھاگتے وقت اوازیں نکالتا ہے۔

”یہ بات ہے۔“ فریدی آہتہ سے بڑھا۔ حمید کے منہ سے بو آرہی تھی۔ اتفاقاً اس کا ہاتھ س کے کوٹ کی جیب سے نکلا گیا۔ جس میں حمید نے بوتل ٹھونس رکھی تھی۔
ہوا یہ کہ شہر پتھر کر حمید نے موڑ سائیکل تو دولت گنج کے تھانے میں چھوڑ دیا اور وہاں سے ٹیکسی کر کے ہوٹل ڈی فرانس میں آیا۔ بیہاں اس نے ڈرائی جن کی ایک بوتل خریدی۔
بو تھانی بوتل وہیں صاف کر دی اور بقیہ جیب میں ڈال کر پھر ٹیکسی پر بیٹھا اور گھر آگیا۔
”کیوں سور.... یہ کیا حرکت۔“ فریدی نے ایک ہاتھ سے اس کی گردن دیپتی اور دوسرا سے بوتل نکال کر زمین پر ٹھنڈی۔

”میں بزدل نا میں ہوں۔“ حمید پوری قوت سے چینا۔

”تائیں کے پیچے ابھی بتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور اسے کھینچتا ہوا اندر لے چلا۔

”اوی.... سارہ.... ڈارنگ۔“ حمید دردناک آواز میں چالیا۔

فریدی نے اسے برآمدے کے فرش پر دھکیل دیا۔ سارے نوکر اکٹھا تھے۔

”اپنے اپنے کمروں میں جاؤ۔“ فریدی ان کی طرف مڑ کر بولا۔

وہ سب چپ چاپ ٹپے گئے۔

”کیوں سور.... تم نے پھر شراب پی۔“ فریدی نے اس کے دونوں کان چھپوڑ کر کہا۔
”اکھڑ گئے.... ہائے اکھڑ گئے۔“ حمید گالوں پر کان ڈھونڈ رہا تھا۔
”میں آج تمہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔“

پھر وہ اُس کے سونے کے کمرے میں لے آیا۔ حمید کا نشہ تو خاک اترتا البتہ اُس کا سار آہستہ
آہستہ بھاری ہوتا جا رہا تھا اور وہ خاموشی سے فریدی کو اس طرح آنکھیں یہاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا
جیسے وہ اُس کے لئے کوئی اچھی ہو۔ فریدی نے اس کا سر تو لئے سے جنگ کیا اور یہیکے ہوئے کپڑے
اندازے لگا۔

”تمہاری حرکتیں اب بتا قابل برداشت ہوتی جاتی ہیں۔“

حمدیکھنہ بولا۔ دراصل فریدی کا یہ جملہ ایک بے معنی بے ربطی کے ساتھ اس کے ذہن
میں اترتا۔ اُس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ذہن کا بوجھ اس کی زبان پر بھی حاوی ہو گیا اس کی سب سے
بری خواہش یہ تھی کہ وہ اب چپ چاپ سو جائے۔

دوسری صبح وہ دونوں ایک دوسرے سے ایتنے ہوئے تھے۔ حمید کو پچھلی رات کی ساری
باتیں ایک بے ربط خواب کی طرح یاد تھیں۔ حمید شرمندہ بھی تھا اور وہ حقیقتاً فریدی کا سامنا
کرتے ہوئے پچھا رہا تھا۔ ناشتے کی میز پر بھی دونوں خاموش ہی رہے حمید محضوس کر رہا تھا کہ
فریدی اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت گوار نہیں کر رہا ہے۔

ناشتہ ختم کرنے کے بعد حمید لیکسی کر کے دولت گنج چلا گیا تھا۔ تھانے سے موڑ سائکل لئی
تھی۔ تھانے کا سینٹ آفیسر اس کا گھر ادost تھا اس نے حمید کو چھیڑا۔ لیکن حمید کا مودہ اس قابل
بھی نہیں تھا کہ وہ تھوڑی دیر رک کر اس سے گپ لڑاتا۔

وہ دولت گنج سے سیدھا آفس پہنچا۔ فریدی کی کیڈیلیاک تو کپکاونڈ میں موجود تھی۔ وہ اپنے
کمرے میں نہیں تھا۔ سرجنت رمیش اپنی ڈسک پر سر جھکائے کسی فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔
حمدیکی آہٹ پر چوک پڑا۔

حمدی اپنی ڈسک کی طرف بڑھا۔

”سناتو یار ذرا۔“ رمیش نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”کارا ہوں۔“ حمید نے مڑے بغیر جواب دیا۔

”آنچ صاحب کا مودہ اتنا بگڑا ہوا کیوں ہے۔“

”رات زیادہ پی گئے ہوں گے۔“ حمید نے لاپرواٹی سے کہا۔

”تو کیا پیتے بھی گے ہو۔“

”سارہ ڈار لنگ.... اوہ ہو ہو۔“

فریدی اُسے دوبارہ اٹھا کر دھکے دیتا ہوا اندر لے جا رہا تھا۔

”اپنے ساتھ مجھے بھی بدنام کرتے ہو۔“

”میں پیوں گا.... پھر پیوں گا.... مجھے کوئی نہیں روخ سلت۔“ حمید جھومتا ہوا بولा۔

”میں اپنے باپ کی گود میں بیٹھ کر پیوں گا۔“ پھر اُس نے کان پر ہاتھ رکھ کر ہاٹک لگائی۔

”پینے کے دن آئے پینے جا۔“

اس کے بعد شاندہ کر پر ہاتھ رکھتا پہنچ کر رہا تھا کہ فریدی نے اُس کی ٹانگوں میں اپنا
پیر ازادیا اور وہ حڑام سے زمین پر گر پڑا۔

”مار ڈالوں گا۔“ حمید اٹھ کر فریدی کی طرف چھپا اور فریدی کو بھی آگئی اس نے پھر اپنی
ٹانگ آگے بڑھا دی اور حمید پھر گر پڑا۔

اس پاروہ خود سے نہ اٹھ سکا فریدی نے کھنچ کھانچ کر اُسے سیدھا کیا۔

”بوتل نے.... بوتل میں نہیں ہے، میں نہیں.... اڑے ہاں۔“

”تم نے پچھلی بار قسم کھائی تھی نا۔“ فریدی نے پھر اس کا کان پکڑا۔

”پچھلی کب کھائی تھی۔“

”سارہ کون ہے؟“

”سارہ..... سارہ ہے! بارہ بارہ ہے۔ تیرہ چودہ ہے.... چودہ سیکی ایک بیاندھو ہے۔“

فریدی نے اُسے دھکے مار کر ڈار لنگ روم سے بھی نکلا اور اب وہ اسے عسل خانے کی
طرف لئے جا رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ سے حمید کی گردن پکڑی اور دوسرے سے قل کھول دیا۔

پانی کی تیز وھار حمید کے سر پر گردھی تھی۔

”ارے.... ہوئے.... ہوئے.... پھو.... پھو.... ارے مراء.... پھو....!“

”پھر پیو گے۔“

”نہیں.... ارے.... پھو.... پھو.... مراء....!“

”تھوڑی دیر تک میکی سلسلہ جاری رہا۔“

”مک نہیں پیتا تھا۔“

حمد اپنی ڈسک پر آبیخا۔ اُس کی طبیعت بھاری ہو رہی تھی اور دل چاہ رہا تھا کہ کرسی عین پر بیٹھے بیٹھے سو جائے۔ رہ رہ کر سارے جسم میں کچھ الیک لہریں دوڑتی معلوم ہو رہی تھیں جو کبھی گرم جان پڑتیں اور کبھی خندتی! نہتوں سے چکاریاں ہی نکل رہی تھیں۔

”آج ان پسکڑ صاحب بھی کچھ جھنجڑائے ہوئے ہیں۔“ ریمش بولا۔

حمد کوئی جواب دینے کی بجائے اپنی ڈسک آہستہ آہستہ کھکھٹانا لگا۔ ریمش چند لمحے اس کے طرف مفحکاند انداز میں دیکھتا رہا۔ پھر فائیل کی ورق گردانی میں مشغول ہو گیا۔

حمد ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ ایک عجیب قسم کی اکتاہٹ اس کے ذہن پر مسلط تھی۔ اے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا سارا حسن ختم ہو گیا ہو۔ کائنات کی ریگیں ٹوٹ رہی ہوں اور انہیں کے ساتھ رجایت کا وہ تانا بانا بھی ٹوٹ رہا ہو۔ جو اس نے اپنی شخصیت کے گرد پھیلا رکھا تھا۔ ایک بے نامی خلش اُس کے سینے میں رہ رہ کر چھوڑ رہی تھی۔

دفعتاً اُس کی نظریں یوں ہی غیر ارادی طور پر اُس فائیل کی طرف اٹھ گئیں۔ جسے سر جنٹ ریمش الٹ پلٹ رہا تھا۔

”ذرالٹھر و تو...!“ اس نے کہا اور تیزی سے اٹھ کر ریمش کے پاس بیٹھ گیا۔ پھر اس نے ”صحن چکلی سے کپڑا لیا جسے ریمش الٹے جا رہا تھا۔“

اس کی نظریں اسی صحن پر چکلی ہوئی ایک تصویر پر جم گئی تھیں۔ اچانک اسی کی طبیعت کا اضھلال غائب ہو گیا اور سانسیں تیزی سے چلنے لگیں۔

انتہے میں فریدی آگیا۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر حید پر ڈالی اور اپنے میر پر رکھے ہوئے کاغذات الٹے پلتے گا۔

حمد پھر اپنی ڈسک پر آبیٹھا۔ ریمش کو اس کے رویے پر حیرت تھی۔ وہ کچھ سمجھتے ہی نہ سکا اور حید یہ بھول گیا تھا کہ وہ آفس کے کمرے میں بیٹھا ہے اور وہاں اس کے علاوہ دو آدمی اور کبھی ہیں۔ ریمش تھوڑی دیر تک اسے گھوڑا رہا پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

حمد کا ذہن ایک بھورے رنگ کی ڈاڑھی کا ایک ایک بال چین رہا تھا۔ اور پھر جب وہ ڈاڑھی غائب ہو گئی تو حید بے چیزی سے پبلو بد لئے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کل ہی اسے یہاں آگیا ہو تو کہ

سے ڈاکٹر کا چہرہ جانا بیچانا سا کیوں معلوم ہو رہا تھا تو اس وقت فریدی اُسے اٹھنے کی بجائے اس کی پیٹھے ٹھوک رہا ہوتا۔

فریدی کے میز پر رکھے ہوئے فون کی تھنٹی بجی۔ اُس نے رسیور اٹھا لیا۔ ”لیں... فریدی اسپلینگ... اوه جگد لیش... کیا بات ہے... ہاں... ہاں... اچا... تو پھر... یاد مجھے ناقص تکلیف دیتے ہو... کچھ رقابت... وقابت کا سلسلہ رہا ہوگا۔ ان لوگوں کو اکثر اسی قسم کے حادثات سے دوچار ہونا پڑتا ہے... کیونکہ... یہ درجنوں چاہنے والے رکھتی ہیں... چھوڑو... چھوڑو... میں بہت مصروف ہوں... تھوڑی پوچھ گھوڑ کرو... سب معلوم ہو جائے گا... اس کے عاشقوں کی فہرست تیار کرنا زیادہ مفید ہو گا... مال پچھی رہو گے ہمیشہ... اسکے ساتھ والیوں سے پوچھو... اگر کوئی خاص دشواری ہو تو بتانا...!“ فریدی نے رسیور کھ کر سگار سلاکیا اور حید کو تیکھی نظر دوں سے دیکھتا ہوا ریمش سے مخاطب ہو گیا۔

”سول ہسپتال کی... کوئی نہ سمجھ سارہ... کسی نے اُسے قتل کر دیا۔“

”کیا...؟“ حید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی اس کافلوں لئے بغیر سگار پیتا رہا۔ حید بیٹھ گیا۔ اُس کا سر پکرانے لگا تھا۔ سارہ قتل کر دی گئی کیوں؟ کس لئے؟ کس نے قتل کیا؟ مگر ممکن ہے کوئی اور سارہ ہو! لیکن پھر بھی اس کی الجھن رفع نہ ہوئی۔ وہ اٹھ کر تیزی سے فون کے قریب آیا۔

”میلو...!“ اُس نے رسیور اٹھا لیا۔ اُس کا اندازہ پہلے ہی سے تھا کہ جگد لیش سول ہسپتال ہی سے بولا ہو گا اس لئے اس نے وہیں کے لئے رنگ کیا۔ ”سول ہسپتال... ذرا اپسکٹر جگد لیش کو فون پر بلا دیجئے۔“

اُسے نیلا ہدیریکم انتظار نہ کرنا پڑتا۔ دوسرا طرف سے جگد لیش کی آواز آئی اور حید بولے لگا۔

”میلو... میں فریدی بول رہا ہوں۔“

اس پر فریدی نے اُسے گھوڑ کر دیکھا لیکن حید بولتا ہی رہا۔ ”کیا وہ کوارٹر ہی میں پائی گئی ہے... اوه... کوارٹر کا نمبر کیا ہے... سولہ... اوه... اچھا۔“

حید رسیور کھ کر اپنے ماتھے سے پینے پوچھنے لگا۔

فریدی پہلے سمجھتا کہ شاید حیدر اسے گھنٹے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ چونکہ پرل حیدر کی آنکھوں میں سراسیکی تھی۔

”کیوں....؟“ فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔
حیدر اسے باہر چلنے کا اشارہ کر کے کمرے سے نکل گیا۔

فریدی تمیرانہ انداز میں اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں لان پر نکل آئے۔
حیدر چند لمحے فریدی کے چہرے پر نظریں جمائے رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”کل میں سارہ کے ساتھ تھا۔“

”تم....!“

”جی ہاں۔“ اور میں یہ نہیں سمجھتا کہ اس کی موت رقابت کے سلسلے میں واقع ہوئی۔

”کیوں....؟“

”کل میں نادانست طور پر... جہاں تک میرا خیال ہے ایک بہت بڑے مجرم سے جاگکر لیا تھا۔“

”یعنی....!“

”سردار صدر سے۔“

”کس سے....؟“ فریدی کے لمحے میں جرت تھی۔

”سردار صدر سے۔“ حیدر نے کہا اور پچھلی شام کی پوری روادو سنایا کہ بولا۔ ”میں دولت گنج کے قہانے میں اتر گیا تھا اور وہ لوگ اسے اس کے کوارٹ سک پہنچانے پلے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ڈاکٹر... سردار صدر ہی تھا۔“

”ہو سکتا ہے تمہیں دھوکا ہوا ہو۔“ فریدی بولا۔ ”تم نے فائل میں صرف تصویر دیکھی تھی یا رپورٹ پڑھنے کی بھی زحمت گوارا کی تھی۔“

”نہیں میں نے رپورٹ نہیں پڑھی۔“

”آن سے چھ ماہ قبل سردار صدر ایک حادثے کا شکار ہو کر مر چکا ہے۔“

”ہو گا! لیکن ان معاملات میں میری نظریں بہت کم دھوکا کھاتی ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اس تصویر سے ڈاکٹر نکال دی جائے تو اسی ڈاکٹر کا چہرہ برآمد ہو گا۔“

”ہوں.... لیکن وہ نہ...“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”میا تم کل اسے اس کے کوارٹ سے

لے گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

”ظاہر ہے کہ وہاں کچھ لوگوں نے تمہیں اس کے ساتھ ضرور دیکھا ہو گا۔“

”یقیناً....!“

”چلو یہی اچھا ہوا کہ تم دولت گنج ہی میں اتر گئے تھے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”وہ تمہارے متعلق سب کچھ جانتی رہی ہو گی۔“

”نہیں.... میں نے اُسے اپنا نام شاہد بتایا تھا۔“

”ہوں.... مگر تمہیں کبھی عقل نہ آئے گی۔“

”حیدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ فریدی تھوڑی دیر بعد بولا۔“

اگر تمہاری پاس تسلیم کر بھی لی جائے تو یہ کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ سارہ کے قتل میں انہیں لوگوں کا ہاتھ ہے۔“

”کسی طرح نہیں۔“

”پھر....؟“

”پھر یہ کہ..... میں غول ہسپتال جا رہا ہوں۔“

”دمغ خراب ہوا ہے۔“ فریدی اسے گھوڑتا ہوا بولا۔ ”اگر کسی نے پہچان لیا تو زحمت میں پڑو گے۔“

”تو پھر آپ جائیے۔ میں نے اپنی زندگی کے چند بہترین لمحے اسکے ساتھ گزارے ہیں۔“

”آخری لمحہ بھی اُسی کے ساتھ گزارتے تو بہتر تھا۔“ فریدی ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

شہزادہ

تھوڑی دیر تک حیدر پر گزرنے کے بعد فریدی سول ہسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ اسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ سارہ کے کوارٹ کے سامنے خاصی بھیڑ تھی اور وہاں کھڑے ہوئے کاشیبل بڑی دیر سے جمع ہنانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن انہیں اس میں کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

"بہت اچھا ہوا کہ آپ آگئے۔" انپکٹر جکد لیش فریدی کی طرف بڑھتا ہوا بولے۔
"میا کوئی خاص بات ہے۔"

"بہت ہی خاص.... قتل تو زیادہ الجھا ہوا نہیں مسном ہوتا۔ مگر تمہرے! میرے ساتھ
آئے.... لاش اس کمرے میں ہے۔"

جکد لیش اسے لاش والے کمرے میں لے گیا۔ انگلو انڈین نرس فرش پر چلت پڑی تھی۔ کسی
نے اس کا گلا گھونٹ کر خاتمه کر دیا تھا۔ ڈاکٹر بھی تک لاش کے قریب ہی موجود تھا۔ اس نے بتایا
کہ موت بچھلی رات کو دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔
"دروازہ باہر سے بند تھا۔" جکد لیش نے فریدی کو بتایا۔

"ہوں....!" فریدی نے بے خیال میں سر ہلا دیا۔ اس کی نظریں اس میز پر جھی ہوئی تھیں
جس پر بچھلی رات کا کھانا چتا گیا تھا۔... دو کرسیاں آئنے سامنے پڑی تھیں کھانا دو آدمیوں کا معلوم
ہوتا تھا اور شاید اس میں سے کچھ بھی نہیں کھایا گیا تھا۔

"تمہارا اندازہ کیا ہے۔" فریدی نے جکد لیش کو مخاطب کیا۔

"قاتل.... مقتول کے لئے ابھی نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہاں بچھلی رات کو
غیر متوقع طور پر نہیں آیا تھا کیونکہ میز پر دو آدمیوں کا کھانا جیوں کا تیوں موجود ہے۔"
"قیاس غلط نہیں معلوم ہوتا۔" فریدی آہستہ سے بولا۔

"لیکن کھانے سے قبل ہی قاتل اس پر حملہ کر بیٹھا۔" جکد لیش نے کہا "اور اسے ختم کرنے
کے بعد چپ چاپ نکل گیا۔ مگر میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں۔"
"کیوں....!" فریدی اسے گھورنے لگا۔

"اوھر آئیے۔" ریمش نے اسے دوسرے کمرے میں چلنے کو کہا۔
اور پھر فریدی کو ایک تحریر خیز بات سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں دو ٹاپ کئے ہوئے
خطوط اور ایک تصویر تھی اور تصویر بھی کس کی؟ میاں حید کی۔

"یہ ساری چیزیں مقتول کے بکس سے برآمد ہوئی ہیں۔" جکد لیش نے کہا۔
فریدی اُن دونوں خطوط کو پڑھ رہا تھا۔ ان میں حید نے سارہ کو دھکی دی تھی کہ اگر تم نے
اس کا ساتھ نہ چھوڑا تو میں تم دونوں کو قتل کر دوں گا۔ خطوط کے نیچے اُس نے اپنے پورے دستخط

نہیں پہن سے کئے تھے اور نام کے ساتھ سرجنٹ بھی لکھا تھا اور دوسری بات یہ کہ وہ دونوں

یط خود فریدی ہی کے رائینگ پیڈ کے کاغذوں پر ٹاپ کئے گئے تھے۔

"اور سنئے۔" جکد لیش آہستہ سے بولا۔ "کل دن کو یہ ایک آدمی کے ساتھ موڑ سائیکل پر
ل گئی تھی۔ دیکھنے والوں نے اس آدمی کا جو حلیہ....!"

"وہ حلیہ بھی حید ہی کا ہے۔" فریدی پر سکون لجھ میں بولا۔

"جی ہاں.... میں بڑی الجھن میں پڑ گیا ہوں لیکن مقتولہ کی ساتھ والی نرسوں نے اس آدمی
ام شاہد بتایا تھا۔"

"ہوں.... کیا ان میں سے کسی کو یہ تصویر بھی دکھائی ہے۔"

"جی نہیں.... قطعی نہیں.... ان خطوط اور اس تصویر کا علم میرے علاوہ کسی اور کو نہیں۔"

"ٹھیک....!" فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ "ہاں تم نے مجھے کیا اسی لئے فون کیا تھا۔"

"جی نہیں! یہ چیزیں تو فون کرنے کے بعد برآمد ہوئی ہیں۔ دوبارہ آپ کو فون کرنے ہی
رہا تھا کہ آپ آگئے۔"

"میں ذرا ان نرسوں سے الگ الگ ملا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے اس کا نام شاہد بتایا ہے۔"

"میں بلواتا ہوں۔ سب میڑن کے کوارٹر میں موجود ہیں۔"

فریدی وہیں ایک کری پر بیٹھ گیا۔ جکد لیش باہر جا چکا تھا اور فریدی محسنس نظر وہیں سے
روں طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پیارے پیارے بیٹھنے والی الجھن کے آثار قطعی نہ تھے اور نہ اُسے حید
غصہ ہی آرہا تھا۔ اس پر بھی جھلائٹ نہیں تھا، کہ حید نے ان خطوط کے لئے اُس کے پیڈ
کاغذ کیوں استعمال کیا۔ جس پر اُس کا نام چھپا ہوا تھا۔

تحوڑی دیر کے بعد جکد لیش ایک نرس کے ساتھ واپس آیا۔

"تمہارا نام....!" فریدی نے اُس سے پوچھا۔

"تھیوڈور۔"

"سارہ کو کب سے جا بختی تھیں۔"

"جب سے یہاں آئی تھی۔"

"کب سے تھیں....!"

”چہ ماہ قبل....!“

”اس کے ملنے والوں سے بھی کچھ واقفیت رکھتی ہو۔“

”بپتال والوں کے علاوہ صرف ایک آدمی سے اس کے تعلقات تھے وہ بھی ابھی حال ہے۔“

”کس سے۔“

”شہد سے۔“

”وہ کہاں رہتا ہے۔“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اتنا بتا سکتی ہوں کہ میں نے آج تک شاہد کے علاوہ اسے اور کوئی دوسری آدمی کے ساتھ نہیں دیکھا۔“

”کیا وہ کل شاہد ہی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔“

”جی ہاں۔“

”تم نے دیکھا تھا۔“

”جی ہاں۔“

”اور پھر وہ دونوں واپس آئے تھے۔“

”ان کی واپسی کے متعلق میں کچھ نہیں جانتی۔“

پھر فریدی نے حمید کی تصویر جیب سے نکال کر اس کے سامنے ڈال دی۔

”اسے پہچانتی ہو۔“ اس نے پوچھا۔

”اوہ! ایسی تو وہ ہے شاہد۔“ وہ بے ساختہ یوں۔

”تمہیں کس نے بتایا تھا کہ اس کا نام شاہد ہے۔“

”خود سارہ نے۔“

فریدی نے یکے بعد دیگرے اُن ساری نرسوں سے گفتگو کی جو حمید کو بحیثیت شاہد جانتا تھیں۔ بہر حال اس کے علاوہ کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی کہ وہ شاہد کے متعلق صرف اتنا جانتی تھیں کہ اس کا نام شاہد ہے اور انہیں سارہ ہی سے معلوم ہوا تھا۔

”سارہ اُن کے متعلق کچھ اور بھی کہا کرتی تھی۔“ فریدی نے ان سے پوچھا۔

پہلے اس نے انہیں فرد افراد اُنگ بلا کر سوالات کئے تھے اور اب وہ سب ایک ہی جگہ پر تھیں۔ اس کی اس بات کا جواب فوراً نہیں ملا۔ ان میں سے بھی کے چہرے سوچ میں ڈوب گئے تھے۔

”ایک بات....! ایک نہ سبوی۔“ عجیب ہونے کی بنا پر مجھے اب تک یاد رہ گئی ہے ویسے اور کسی کا دھیان نہیں۔

”کیا....؟“

ایک بارہ باتوں کی رو میں کہہ گئی تھی کہ شاہد کی خصیت پر اسرار ہے جس دن اُس پر سے پڑھا ٹھے گا دنیا حریت زدہ رہ جائے گی۔

”اوہ....! فریدی پر خیال انداز میں اُسے دیکھنے لگا۔“ پچھا اور۔

”اور.... کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے وہ زیادہ تر اسی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ بُداخوش مزان ہے۔ انتہائی ذہین، خوش سیاقہ اور منصب وغیرہ وغیرہ۔“

فریدی نے انہیں رخصت کر دیا۔ پھر وہ جگد لیش کی طرف مرکر بولا۔ ”تیرے چھپنے میاں حمید۔“

”تو کیا حمید نے.... واقعی....! جگد لیش چوک کر بولا۔“

”میرا یہ مطلب نہیں کہ حمید نے اسے قتل کیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بھلا حمید اور رقتا ب! یار اس کی محبت رقتا والی ہوتی ہی نہیں۔ وہ تو بس لڑکیوں کا ساتھ چاہتا ہے۔ افلاطونی عشق پر یقین نہیں رکھتا۔“

”اوہ یہ خطوط۔“

”خطوط....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ذرایہ تو سوچو کہ جب اس نے مقتولہ کو اپنانام شاہد بتایا تھا تو پھر خطوط میں سر جنٹ حمید لکھنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر خطوط بھی کیسے قتل کی وجہ کی وائے۔ نہیں جگد لیش صاحب! اگر وہ ایسا کرتا بھی تو کم از کم میرے رائینگ پیڈ کا کاغذ نہ استعمال کرتا۔“

”تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ حمید صاحب قاتل ہیں۔“ جگد لیش جلدی سے بولا۔

”نہیں شب تو کرنا ہی پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور ہاں یہ بھی سنو کہ یہ دستخط حمید ہی کے نیں یا یوں سمجھو کہ بالکل ویسے ہی ہیں۔“

”تب تو...“

حیثیت سے اور پھر اچاک یہ راز کھل جائے کہ وہ ایک شہزادہ ہے ہم دونوں حسین مرغزاروں میں
شہزادے پھریں۔ بکر اس و معنوں میں اکیلے ہوں۔ میلا آسمان دور کی پہاڑیوں پر جھکا ہوا معلوم ہو اور
پہاڑوں پر ڈوبتے ہوئے سورج کی قرمزی کر نیں ہو لے ریک رہی ہوں۔ ہمارے سروں
پر قازوں کی لبی کی قطار پرواز کر رہی ہو اور ہمارے پیروں کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس ہو۔
شہزادے کی پر خواب آنکھیں میری روح کی گہرائیوں میں جھاک رہی ہوں۔ پھر وہ میرے زانو
پر سر رکھ کر سو جائے۔ کاش میرے خوابوں کی تعبیر بچ مجھے مل گئی ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ شاہد
شہزادہ ہے۔ اُس کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھ سے کچھ چھپانا چاہتا ہے۔ مجھے اس کی
فہمیت پر اسرار معلوم ہوتی ہے۔ میرا شہزادہ مجھے مل گیا ہے۔ میری حسین آزو! شاہد شہزادہ
ہے۔ ایک دن یہ راز ضرور کھلے گا۔

فریدی سورج میں پڑ گیا۔ وہ سورج رہا تھا کہ کیا حمید اُسے یہ قوف بنا رہا تھا۔ وہ کچھ بھی رہا ہو
لیکن اب یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ سارہ اسے حمید کے نام سے نہیں جانتی تھی۔ فریدی نے پوری
ڈائری دیکھ دیا۔ اس میں شاہد کا تذکرہ کئی جگہ کیا گیا تھا لیکن حمید کی اصل حیثیت کے متعلق کہیں
ہلکا سا اشارہ بھی نہ ملا۔

”اے بھی دیکھو....!“ فریدی نے وہ ڈائری جگد لیش کی طرف بڑھا دی۔
تقریباً پندرہ بیس منٹ تک سوت رہا۔ اس دوران میں جگد لیش ڈائری کی ورق گردانی
کرتا رہا اور فریدی کروں کی دوسری چیزیں اللتا پلتا رہا۔

”بھی کمال کر دیا حمید نے بھی۔“ جگد لیش آہستہ سے بڑھا۔ ”شہزادے صاحب۔“
”تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔“ فریدی بولا۔
جگد لیش استفہا میسے انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ڈائری کی کسی تحریر سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ شاہد نے خود کو کسی شہزادے کی
حیثیت سے پیش کیا ہو۔ مقتولہ خود سے شہزادہ مجھے پر مصروف کھائی دیتی ہے کس بناء پر؟ ڈائری اس
کا جواب نہیں دیتی۔“

”عجیب معاملہ ہے۔“ جگد لیش سر ہلا کر بولا۔

فریدی نے وہ ڈائری اُس سے لے کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ تصویر اور خطوط بھی اُسی کے

”نہیں اس بناء پر بھی یقین نہیں کیا جاسکتا کہ یہ حمید ہی کی حرکت ہے۔ کیونکہ ہم آئے دن
ایسے نعلیٰ دستخطوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔“
”لیکن ابھی اس زنس نے کہا تھا کہ سازہ نے شاہد کی پر اسرار شخصیت کی طرف اشادہ کیا
تھا۔“ جگد لیش نے کہا۔

”ہاں یہ بات ضرور تشویش ناک ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاہد کی اصلیت
سے واقف تھی بہر حال معاملہ پچیدہ ہے۔“

”حمدی صاحب میں کہاں۔“ جگد لیش نے پوچھا۔
”آفس میں۔“

جگد لیش خاموش ہو گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

”آپ نے ان لوگوں کو تصویر کیوں دکھادی۔“

”میں یہ بات چھپانا نہیں چاہتا کہ حمید بھی اس کیس میں مخفیہ حیثیت رکھتا ہے۔“ فریدی
نے کہا۔ ”خیر تم تو ایک بار بیاں کی تلاشی لے ہی چکے ہو! ذرا میں بھی دیکھ لوں۔“

فریدی ایک چیز کو بنظر غائز دیکھ رہا تھا۔ ایسے نشانات کی طرف سے تو اسے پہلے ہی
سی ہو چکی تھی، جو قاتل نے چھوڑے ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ قاتل نے ہاتھوں میں دستانے
ن کر سارہ کا گلا گھوٹا تھا لیکن اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ پاس پڑوس والوں کو بھی اس
اداثے کی خبر نہ ہوئی۔ سارہ ایک تند رست لڑکی تھی آسانی سے توند مری ہو گی۔

اُس کی کتابوں کی الماری دیکھتے وقت فریدی کو اعتراض کرنا پڑا کہ وہ ایک سترے مذاق کی
لوکی تھی الماری میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں تھی جو کسی گھٹیا مصنف کی ہوتی فخش قسم کا امریکی
لڑپر بھی نہیں دکھائی دیا۔

اس تلاشی کے دوران میں صرف ایک چیز کام کی مل سکی۔ یہ سارہ کی ڈائری تھی اور پھر وہ
اس کے اوراق الٹ پلٹ رہا تھا ایک جگہ شاہد کا نام دیکھ کر اُس کی دلچسپی بڑھ گئی۔
مقتول نے خالص روانی انداز میں لکھا تھا۔

”کیا بچ مجھ میرے خواب حقیقت بن جائیں گے۔ میں بچپن ہی سے ایک ایسے شہزادے کے
متعلق سوچتی آ رہی ہوں جو مجھے اچاک مل جائے، مجھے چاہنے لگے لیکن ایک ایک معمولی آدمی کی

پاس تھے۔

”بڑی دلچسپ سازش ہے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔
”سازش....؟“ جلد لیش چوک کرولا۔

فریدی خاموش ہی رہا۔ تھوڑی دیر تک وہ پچھے سوچتا رہا پھر بولا۔
”رپورٹ میں کیا لکھ رہے ہو؟“

”یہی تو سوچ رہا ہوں۔“ جلد لیش فکر منداہ انداز میں بولا۔ ”اس تصویر اور خطوط نے بڑی بھن میں ڈال دیا ہے۔“
”نہایت آسان طریقہ۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”تصویر اور خطوط کا تذکرہ سرے سے ہی نہیں۔“

”اوہ شاہد....؟“

”شاہد کا تذکرہ ضروری ہے اور اس کا بیان کیا ہوا جیسے بھی لکھو۔“

”آپ نے تصویر انہیں ناقص دکھائی۔“

”اوہ.... چھوڑو.... یہ سب دیکھا جائے گا۔“

فریدی آفس واپس آگیا۔ حید کمرے میں نہیں تھا وہ اور ریش شاید چائے پینے کے کینٹین میں چلے گئے تھے۔ فریدی اپنی میز پر بیٹھ کر کام میں مشغول ہو گیا اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی خاص بات ہوئی نہ ہو۔ پچھے دیر بعد حید اور ریش واپس آگئے۔

”اوہ شہزادے صاحب۔“ فریدی نے حید کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے ہونٹوں پر شرا آمیز مسکراہٹ تھی۔ حید نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔

”کسی نے گلا گھونٹ کر اُسے مار ڈالا۔“ فریدی نے ریش سے کہا۔

”اچھا....!“

”کل وہ شاہد ناہی ایک آدمی کے ساتھ کہیں گئی تھی۔ پو لیں کاشہر اسی پر ہے۔“

حید چوک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”شاہد کے متعلق خیال کیا جا رہا ہے کہ اس نے سارہ کو اپنے متعلق دھوکے میں رکھا تھا۔“

”وہ کس طرح....؟“ ریش نے پوچھا۔

”اس نے متولد سے کہہ رکھا تھا کہ وہ کسی ریاست کا شہزادہ ہے۔“
حید کچھ بولنے کے لئے بے چین نظر آ رہا تھا۔ لیکن فریدی اُسے الجھن میں چھوڑ کر پھر کام میں مشغول ہو گیا۔

چیزیں ہی ریش باہر گیا حید فریدی کے پاس آئیں۔ لیکن فریدی نے سر اٹھا کر دیکھنے تک کی رہت گوارا نہ کی۔

سو نے کی خاک

”شہزادے والی بات کیا تھی۔“ حید نے اکتا کر پوچھا۔
”کوئی خاص بات نہیں۔“ فریدی خلک لجھ میں بولا۔ ”عورتوں کے پیچھے دوڑنے والے عموماً اسی قسم کی حرکتیں کیا کرتے ہیں۔“

”دیکھنے مجھے زیادہ الجھن میں نہ ڈالنے۔“ حید جھنجلا کر بولا۔

”اور میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اپنے چہرے پر قبرستانی فضا پیدا کرنے کی وجاء تھی
لگائیے درست.... یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شام کے اخبارات میں شاہد کا علیہ شائع ہو جائے گا۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ حید ہونٹ سکوڑ کر بولا۔ ”شہزادے والی بات۔“

”بیتا تو چکا کہ شاہد نے خود کو شہزادہ ظاہر کیا تھا۔“

”قطیعی.... غلط ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن شہزادے والی بات میں خود آج تک نہ سمجھ سکا۔“

”کیا مطلب.....!“ فریدی چوک کر بولا۔

”وہ خود ہی اکثر مجھے پرنس کہہ کر مخالف کیا کرتی تھی.... اور قطعی سنجیدگی سے.... اکثر جھنجلا کر یہ بھی کہہ بیٹھتی تھی کہ تم آخر خود کو چھپاتے کوں ہو۔“

فریدی تھیسا نہ انداز میں حید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم نے اس سے شہزادہ سمجھنے کی وجہ نہیں پوچھی؟“

”اس کا اس نے کبھی کوئی تشکی بخش جواب ہی نہیں دیا اور میں حقیقتاً یہی سمجھتا رہا کہ وہ مجھے یو تو قہ بنا رہی ہے لیکن آپ کو اس کا علم کیوں نکر ہوا....؟“

”خوب....!“ فریدی کی آنکھیں چکنے لگیں۔ ”بہر حال وہ خود ہی تم پر عاشق ہو گئی تھی۔“
”میں مذاق کے موڈیں نہیں ہوں۔“
”اوہ....!“ فریدی اپنی باکسیں آنکھ دبا کر آہستہ سے بولا۔ ”صورت ہمارا نہیں تمہارے کیلئے
پن کا ہے۔“
حمدید بھنا کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو پیارے بیٹھو! اس وقت تم میری مٹھی میں ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں
تمہیں نہایت آسانی سے چھانی کے تختے نکل پہنچا سکتا ہوں۔“
”ہونہہ.... چھانی....!“ حمید نہیانی انداز میں نہ پڑا۔
”اس بھی میں دلیری کا اظہار ضرور ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”لیکن آج رات شاید ہی
تمہیں سوتا نصیب ہو سکے۔“

”سوتا....!“ حمید زیر لب بڑایا اور دفتا اس کے ذہن نے پچھلی شام کی دھنڈی یادوں کی
طرف جست لگائی۔ براثنی کی بو شور کی تھوں کو کلبانے لگی اور پھر ذہن کے تاریک گوشوں
میں سونے کا تصور جھلکیاں مارتا ہوا الگ ہرنے اور ڈوبنے لگا۔

”سوتا.... سوتا۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بیٹھ گیا۔
فریدی اُسے حرمت سے دیکھ رہا تھا۔
”کیبات ہے۔“

”شاید کچھ سونے کی بات تھی۔“ حمید اس طرح بولا جیسے خود سے باتیں کر رہا ہو۔
”لینگ اچھی کر لیتے ہو۔“ فریدی نے منہ بنا کر کہا۔ ”لیکن اس سے کام نہیں چلے گا۔ ہمیں
پکھننے کچھ کرتا ہی ہے۔“

”بند اسونے کی کچھ بات تھی۔“
”کومت....!“ فریدی بگڑ کر بولا۔

”میں نے کیا کیا۔.... میں نے کیا کیا۔“ حمید بے چینی سے ہاتھ مل رہا تھا۔
”تو کیا کچھ تمہیں نے۔“ دفتا فریدی کے چہرے پر سر ایسکی کے آثار پیدا ہو گئے۔
”میا کچھ....؟“ حمید اُسے گھورنے لگا۔

”اس کی ڈاڑی سے.... لیکن اس میں بھی اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔“
”عجیب معاملہ ہے۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔
”مگر بیٹے خان تمہیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔“
”دنیا....!“ حمید چوک کر بولا۔

”اُسے خط لکھنے کے لئے تمہیں میرے رائٹنگ پیڈ کا کافی نہذہ استعمال کرنا چاہئے تھا۔“
”خط....! میں نے آج تک اُسے کوئی خط لکھا تھی نہیں۔“
”تصویر دی تھی۔“
”میرا خیال ہے کہ میں نے اُسے اپنی کوئی تصویر بھی نہیں دی۔“
”لیکن یہ دونوں چیزیں اس کے یہاں سے برآمد ہوئی ہیں۔“ فریدی نے تصویر اور خط
اس کی طرف پوہنچا دیے۔

”خدا کی قسم....!“ حمید خطوط پڑھ کر بول گیا۔ ”مگر.... یہ مستحب بالکل ایسے ہی ہیں چہ
میں کرتا ہوں۔“
”مکن ہے شراب کے نشے میں کبھی لکھ کر بھول گئے ہو۔“ فریدی نے طنز آمیز لمحہ میں کہ
”کہہ لیجھا اب تو انہیں ہی گیا ہوں۔“

فریدی چند لمحے اُسے غور سے دیکھتا رہا پھر بولا۔
”اس سے تم طے کس طرح تھے؟“
”ہوٹ ڈی فرانس کے ایک رقص کے دوران میں وہ خود ہی میری طرف جھکی تھی۔“
”اس کے دوسرا دوست بھی رہے ہوں گے۔“
”مجھے اُن کے متعلق علم نہیں۔ اُس نے کبھی کسی کا تذکرہ نہیں کیا۔“
فریدی تھوڑی دیر میک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔
”اچھا گھامر خان! مجھے ان لوگوں کے متعلق بتاؤ۔ جنہوں نے تمہیں شراب پلائی تھی۔“
”ان کے متعلق بھی آپ کو سب کچھ بتا پا کا ہوں۔“
”تم نے اچانک ہی بالی کیسپ کا پروگرام بنا لیا تھا یا یہ بات پہلے ہی سے طے تھی۔“
”میں نے دو دن پہلے ہی سے طے کر کھاتا تھا۔“

”فریدی صاحب! ایں موت سے نہیں ڈرتا۔“
 ”جیتے رہو فرزند! کسی عورت کو قتل کر دینے کے بعد جو اندر ہی الگی باقی کرتے ہیں۔“
 حمید نے جلا کر اپنی ران پر پا تھا مار اور اٹھ کر اپنی ڈسک پر چلا گیا۔
 ”بیکار! تمہاری جھلائیت تمہیں بے گناہ نہیں ثابت کر سکتی۔ شہزادے صاحب۔“ فریدی
 ہن کربولا۔
 ”تو چھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی بولا۔“
 ”کیک ماہ کی چھٹی کی درخواست لکھو۔“
 ”کیوں....؟“
 ”جو میں کہہ رہوں وہ کرو۔“
 ”در حمید درخواست لکھنے لگا۔ پھر چھوڑی دیر بعد اُس نے وہ کاغذ فریدی کی طرف بڑھا دیا۔
 فریدی نے درخواست لے کر کھلی اور بولا۔
 ”اب چپ چاپ گھر چلے جاؤ۔“
 حمید چند لمحے کھڑا اُسے دیکھا رہا۔
 ”میا میا نے سن نہیں۔“ فریدی سر جھکائے ہوئے بولا۔
 ”Hamid نے بے چوں وچ امور سماں یکل اٹھائی اور گھر کی طرف چل پڑا۔ اُس کے ذہن پر سارہ
 چھائی ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس نے اس کی لاش نہیں دیکھی تھی لیکن پھر بھی تصور کی آنکھ اُس کے
 شونچ پر چھپے پر غبار آلواد چادر دیکھ رہی تھی۔ خیف سے کھلے ہوئے نرم دنالک ہونٹ جو عموماً
 خاموشی کی حالت میں بکھل جاتے تھے۔ دنالک ہوئی آنکھیں۔ وہ آنکھیں، جو سرور کی ہلکی سی لہر
 پر بھی جھگٹا گھٹتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ.... اگر وہ لوگ سازشی ہی تھے تو انہوں نے اُسے کیوں مار
 ڈالا۔ اگر وہ اُس کے گروہ سے تعلق رکھتی تھی جب بھی اُسے مار ڈالنے کی وجہ؟ پھر اُسے پچھلی
 باقی بیا آنکھیں.... آخر وہ اُسے کسی ریاست کا پرانا سمجھنے پر کیوں مصروف تھی.... ممکن ہے یہ بھی
 چال رہی ہو! لیکن.... اگر چاں تھی تو اُس نے اس کے متعلق ڈائری میں کیوں لکھا؟“
 ”وہ اُن دونوں خطوط کے متعلق بھی سوچ رہا تھا آخر فریدی کے پیڑ کے کاغذ کیوں کمر حاصل
 کئے گئے ہوں گے۔ کیا کوئی فوکر بھی اس سازش میں شریک ہے؟ پھر اس کے خیال کی رو سونے

”لیکن فرزند تم نے کب سے اخبار نہیں دیکھا۔؟“
 ”کیوں....؟“
 ”وہ سارا سوتا خاک ہو گیا۔“
 ”کب؟ کس طرح؟“
 ”کل کا اخبار دیکھا تھا۔“
 ”نہیں....!“
 ”ہاں کل تو تم بالی کیمپ کی سیر کر رہے تھے۔“
 ”سوتا خاک کس طرح ہو گیا۔“
 ”آزاد ہیک کا ڈریکھ من سوتا خاک ہو گیا اور یہ وہی سوتا خاک جو اُسی نوڑاؤں سے آیا تھا جس پر
 ڈاکر پڑا تھا۔“
 ”رکھے ہی رکھے خاک ہو گیا۔“
 ”نہیں! اُسے اینٹوں کی شکل میں ڈھانے کے لئے پکھلانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن۔“
 ”پکھلنے کی بجائے خاک ہو گیا۔“
 ”ڈریکھ من سوتا۔“ حمید آنکھیں چھاڑ کر بولا۔
 ”جباب اور آپ نے ولادِ نگر سے آنے والے سونے کی بھی مٹی پلید فرمائی کی کوشش
 فرمائی۔“
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“
 ”میں آپ کو مطلب سمجھانے کے لئے نہیں پیدا ہوں۔“ فریدی منہ سکوڑ کر بولا۔
 ”میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔“
 ”لیکن خواہ مخواہ پچھے بننے کی خواہ بھی پریشان کئے رہتی ہے۔“
 ”یہ بات نہیں جب آپ کوئی بات سمجھانے لگتے ہیں تو مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔“
 ”چاپلوسی بند حمید صاحب! میں آپ کو چھانسی سے نہیں بچا سکوں گا۔“
 ”چھانسی کی کیوں!“ حمید جھنگلا کر گالی بکتے بکتے رہ گیا۔
 ”چھانسی کی تو ہین نہ کرو کہیں اُسے کچھ غصہ نہ آجائے۔“

والے معاملے کی طرف مڑ گئی۔ فریدی کے گفتگو کے انداز سے اس نے یہ مطلب اخذ کیا تھا
ثرین پر ڈاکہ ڈالنے والوں نے شاید اصل ہونے کی جگہ ایسا سوتار کہ دیا تھا جو حدت سے کچھ لے
بجائے خاک ہو جانے کی خاصیت رکھتا تھا۔

پھر ایک نیا خیال اس کے ذہن میں ابھرایا۔ کہیں یہ سب کچھ اسی لئے تو نہیں کیا گیا کہ فریدی
اس قتل میں الجھ جائے اور سازشی اپنی مقصد برداری میں مصروف رہیں..... وہ سوچتا رہا تھا
شہزادے والا معاملہ اس ڈھانچے کے کسی خانے میں فٹ نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کیس میں نہ
طرح پھنس گیا۔ البتہ ان دونوں خطوط کی موجودگی اُسے تھوڑا بہت اطمینان دلاری تھی۔ اُس
یقین تھا کہ دستخطوں کے ماہراصل اور نقل میں بہ آسانی فرق ڈھونڈ لیں گے۔ اس کی دانستہ
ساز شیوں نے خطوط کا اضافہ کر کے ایک زبردست غلطی کی تھی! اگر کہیں انہوں نے صرف
تصویر ہی پر قیامت کی ہوتی تو اس کی گلو خلاصی مشکل ہی تھی۔ حمید کی موڑ سائکل سڑکوں
فرائٹ بھر رہی تھی۔ لب وہ غیر ارادی طور پر مختلف موڑوں پر اس کا رخ پھیرتا جا رہا تھا۔ ویسے
یہ بھی بھول گیا تھا کہ اُسے گھر جانا ہے یا کہیں اور....!

کوول کے شکاری

اُسی شام کو کرٹل فریدی حمید کے ہونٹوں اور ناک کے ہونٹوں کی مرمت کر رہا تھا۔ حمید نا
بڑی دیر سے اپنی کھانی تک روک رکھی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے تک عمل جاری رہا۔ پھر فریدی اس
کے سامنے آئیں رکھ دیا اور حمید اپنی بڑی کسی طرح نہ روک سکا۔ ہونٹ کافی موٹے نظر آتے
تھے اور نتھنے پھولے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اُس پر سرخی بھی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جی
شدید نزلے کی شکایت کی بنا پر اُس نے بار بار رومال استعمال کیا ہوا۔
”بس اب بالکل ٹھیک ہے۔“ فریدی بولا۔ ”ہونٹوں اور ہونٹوں پر تیل کی قسم کی کوئی چیز
لگنے دینا۔ یہ میک اپ میون کے لئے کافی ہے۔“

”بڑی مصیبت میں پھنس گیا۔“

”اُسی لئے کہتا ہوں فرزند کہ عورت کا چکر بُرا ہوتا ہے۔“ فریدی ہس کر بولا۔

”واقعی بُرا ہوتا ہے.... اب دیکھنے تاکہ عورت ہی کے چکروں میں پڑ کر ہم دونوں پیدا
رکھئے۔“

فریدی نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ یہ نہیں کہ وہ اس جملے پر جھینپ گیا تھا اس تذکرہ
کو کوئی ناچاہتا تھا۔

”یکن مجھے کب تک اس طرح رہنا ہو گا۔“ حمید نے پوچھا۔

”جب تک کہ معاملات صاف نہ ہو جائیں۔“

”مگر اس طرح تو میں اور زیادہ مٹکوک ہو جاؤں گا۔“

”اس کی پواہ نہ کرو۔“ فریدی شانوں کو جتنب دے کر بولا۔ ”میرا عویٰ ہے کہ تم حشر تک
پہنچانے جا سکو گے۔ اک ذرا تاریک شیشوں کی عینک لگائے رہا کرتا۔“

”یکن میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“

فریدی اُسے گھورنے لگا۔

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میری بے عزتی ہوں؟“ اس نے کہا۔

”آگر تمہیں ایک گھنٹے کے لئے بھی حوالات دیکھنی پڑی تو میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام
ہو گا۔“

”آخر آپ یہ کیوں سمجھتے ہیں کہ میں پکڑ ہی لیا جاؤں گا۔“

”یہ بھی کوئی پیچیدہ بات ہے؟“ اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ”تم نہایت آسانی سے پکڑ لئے
جاوے گے؟ کیا تم یہ بھول گئے کہ تم نے واقعی اسے قتل نہیں کیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ تمہیں
پھنسانے لئے کیا گیا ہے جو لوگ میرے رائینگ پیڈ کا غیر حاصل کر سکتے ہیں، جو تمہارے
دستخط ہائے ہیں کیا وہ تمہیں حوالات تک پہنچانے کے لئے کوئی چال نہ چلیں گے۔ شام کے ایک
اخبار میں مقتولہ کی تصویر شائع ہوئی ہے۔ اگر فرض کرو ان آدمیوں میں سے کوئی پولیس کو یہ
اطلاع دے دیتا ہے کہ اس نے پچھلی شام کو اسی شکل و صورت کی لڑکی کو تمہارے ہلکے کے ایک
آدمی کے ساتھ دیکھا تھا تو پھر تم کہاں ہو گے۔ مزید شہادت کے لئے وہ کسی نہ کسی سارہ کے
ساتھ والی زسوں کو بھی پیش کر سکتے ہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ جو کچھ میں کہوں چپ چاپ

کرتے چو! تم یہ بھی جانتے ہو کہ ذی۔ ایس۔ پی ٹی سے میرے تعلقات اچھے نہیں۔ ”
ابھی شاید فریدی نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ بیرونی برآمدے میں کئی قدموں کی
آہمیں سائی دیں اور دوسرے ہی لمحے میں ذی۔ ایس۔ پی ٹی دو سب انپلائرز اور تین کانٹیلائرز
سمیت ان دونوں کے سامنے پہنچ کا تھا۔ ذی۔ ایس۔ پی نے چاروں طرف دیکھا۔

”سرجنٹ حمید کہاں ہے۔“ اس نے فریدی کو تھاٹب کیا۔
”وہ تو بعد کو بتاؤں گا۔“ فریدی جھنجلا کر بولا۔ ”آپ یہ بتائیے کہ اس کرے تک کس طرح پہنچ
”میں سرجنٹ حمید کے مخلوق پوچھ رہا ہوں۔“
”میں آپ کو شریفوں کی طرح رہنے کا سلیقہ سکھانے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“

”کیا مطلب....؟“
”کسی کے گرد داخل ہونے کا یہ طریقہ نہیں۔“

”آپ کس سے باقاعدہ کر رہے ہیں؟“ ذی۔ ایس۔ پی گزر کر بولا۔
”ایک قانون شکن سے جو خود کو قانون کا محافظ کرتا ہے۔“

ذی۔ ایس۔ پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصے کی بات بھی تھی۔ فریدی نے اس کے ماتحتوں کے
شامنے اُسے اوہیڑ کر کر دیا تھا وہ اندر نہیں طرح کھول رہا تھا اور فریدی یہ سوچ رہا تھا کہ
اس کی محنت جو اس نے حمید کے میک اپ پر صرف کی ہے بیکار نہیں گئی۔ حمید نے بھی اپنے
چہرے پر تحریر کے آثار پیدا کرنے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس غیر متوقع گفتگو پر شدت
سے متاثر ہو۔

”میں پوچھ رہا ہوں کہ سرجنٹ حمید کہاں ہے؟“
”مجھے نہیں معلوم! لیکن یہ طریقہ....!“

”طریقہ دریقت کو فی الحال الگ رکھئے۔“ ذی۔ ایس۔ پی سر دلچسپی میں بولایہ ”میرے پاس
اس کا دارالحکومت گرفتاری ہے۔“

”کیا....؟“ فریدی چونک کر بولا۔ ”کیوں؟“
”ایک فرس کے سلسلے میں اُسے منتظر سمجھا گیا ہے۔“

”اوہ.... لیکن....؟“ فریدی کچھ کہتے کہتے رک گیا! آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے

بنجھلاہٹ کے آثار غائب ہوتے جا رہے تھے اور ذی۔ ایس۔ پی کے ہوتنوں پر ایک تغیر آمیز
سکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”میا آپ صح موقع واردات پر نہیں تھے؟“

”تحاکیوں نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن حمید....!“

”میا زسوں نے آپ ہی کے سامنے شاہد کا حلیہ نہیں بیان کیا تھا۔“

”میا تو تھا.... لیکن.... محض اس بناء پر حمید ہی کیوں.... لیکن ٹھہر یے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ اس کے ماتحت پر لکیریں ابھر آئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ
کسی الجھن میں ہو۔ ذی۔ ایس۔ پی اُسے گھورتا رہا پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔

”میرے پاس وقت کم ہے۔“

”بات یہ ہے کہ میں بھی فکر میں پڑ گیا ہوں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”وہ آج دوپہر کو
ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست میرے حوالے کر کے سعید آباد چلا گیا ہے۔“

”کیوں....؟“

”اس نے تو مجھ سے یہ کہا تھا کہ وہاں اس کا کوئی قریبی عزیز سخت بیمار ہے۔“

”ہوں.... عزیز کا پتہ۔“

”چچہ اس نے نہیں بتایا۔“

ڈی۔ ایس۔ پی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

”میں اس گھر کی تلاشی لیتا چاہتا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”شوک سے.... لیکن ہر کام قانون کے اندر رہ کر ہو گا۔“ فریدی بولا۔

”لیعنی....!“

”تلاشی کا دارالحکومت دکھائی ہے۔ دو گواہوں کی بھی ضرورت پیش آئے گی.... اور آپ تو خیر
اپنا جامہ تلاشی کی ابھارت تو دے ہی دیں گے۔“

”سب کچھ ہو جائے گا۔“ ذی۔ ایس۔ پی غربا۔

ایک سب انپلائز فریدی کے دو پڑوسیوں کو بلا لایا۔ پھر دوسری کاروانیوں کے بعد

ڈی۔ ایس۔ پی تلاشی شروع کرنے ہی جا رہا تھا تو فریدی نے اُسے روک کر کہا۔

”تمہرے بیوی! ایک بیوی غلطی کی مخالفی کی طرح نہیں ہو سکتی۔ لہذا اس وقت تلاشی قلعی غیر قانونی سمجھی جائے گی۔“

”کیا مطلب....؟“

”آپ لوگ میری نادانشکی میں اندر داخل ہوئے ہیں۔ اگر آپ نے آتے وقت خود ہی کوئی

مشتبہ چیز کہنیں ڈال دی ہو تو۔“

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“ ذی۔ ایس۔ پی چھنجلا کر بولا۔

”قاعدے کی بات میں نے کہا ذی۔ اب جیسا آپ کا دل چاہے ہے؟“

”آپ سرکاری کام میں حارج ہو رہے ہیں۔“

”بھی نہیں! میں نے صرف ایک قانونی نکتہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے۔“ فریدی نے

سنجیدگی سے کہا۔

”میں ضرور تلاشی لوں گا۔“ ذی۔ ایس۔ پی پیرخ کر بولا۔

”یوں تو آپ اس عمارت میں آگ بھی لگا سکتے ہیں.... حاکم ٹھہرے۔“

”مشر فریدی! آپ حدتے بڑھ رہے ہیں۔“

”بھی نہیں میں آپ کو بھی حد ہی میں رکھنا چاہتا ہوں۔“

”تلاشی لی جائے گی۔“ ذی۔ ایس۔ پی نے غصیل آواز میں کہا۔

”میں آپ کو رکتا تو نہیں۔“ فریدی نے خشک لبجھ میں کہا اور سگار سلاکنے لگا۔

دو سکنے کی عرق ریزیوں کے باوجود بھی ذی۔ ایس۔ پی کوئی ایسی چیز برآمد نہ کر سکا جس کی

بناء پر حید قانون کی مزید گرفت میں آسکتا۔

وہ تحکم ہادر کر پھر اسی کمرے میں آگیا جس میں اس نے فریدی اور حید کو چھوڑا تھا۔

اگر آپ رات کو کھانا میرے ہی ساتھ کھائیں تو مجھے خوشی ہو گی۔“ فریدی نے اس سے کہا۔

”بھی نہیں شکریہ۔“ ذی۔ ایس۔ پی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا اور عمارت میں اپنے وزنی جو توں

کی گونج پیدا کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ دونوں گواہ بھی پولیس والوں کے ساتھ ہی رخصت ہو گئے تھے۔

”کیوں! حید صاحب! اب کیا خیال ہے۔“ فریدی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا یا۔

”خدا کی قسم اگر آپ کا تعلق ٹھیک سے ہوتا تو سارے ملک میں آپ کی ادکاری کا ڈنکانع جاتا۔“

”سچ پڑنا کا نہیں طبلہ بتتا ہے.... اب چھوڑ دیے باتیں۔“ ہوٹل ڈی فرانس میں تمہارے انتظام کر دیا گیا ہے.... دفع ہو جاؤ۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن....!“

”عجیب آدمی ہو.... میں کہتا ہوں اب چپ چاپ چل دو۔“ ہوٹل ڈی فرانس میں کہہ نہیں تھا اپنا سعید جو ہے اور تم ایک کشمیری سیاح ہو۔ کشمیر میں تمہاری جاگیر ہے۔“

”اور میں عموماً جاگیر ہی میں اٹھے دے دیا کرتا ہوں۔“ حید چھنجلا کر بولا۔

”تم یہ مت سمجھو کر تمہیں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔“ اس ایک

چھٹی کے منٹ بہت کا حساب لے لوں گا۔“

”عین....!“

”تمہیں ان چار ٹکاریوں پر نظر رکھنی ہے۔“

”کون سے چار ٹکاری۔“

”وقت، جو شہر میں کوئے مارتے پھر تے ہیں۔“

”اور میں ان کے پیچے مکیاں مارتا پھروں گا۔“

”اگر نہیں پھرو گے تو پھر پھانی کا تختہ...!“

”کیا مطلب.... بھلان کا اس معاملے سے کیا سروکار۔“

”ایک شہر ہے۔“

”کیا....!“

”تم جانتے ہو کہ ابھی میں اس کا اٹھار نہیں کروں گا۔“

”چلے! میں پوچھتا ہی نہیں۔“ حید بولا۔ ”ویسے میں خود انہیں اور ان کی کمپنی کو سرے سے لے سمجھتا ہوں۔“

”کیوں....?“

”اگر میں فی الحال بتاتا مناسب نہ سمجھوں تو!“ حید نے فریدی کے لجھ کی نقل اتنا ری۔

”انہوں نے شہر میں کوئے مارنے کا اجازت ناہی بلدی یہ سے حاصل کیا ہے۔“ فریدی بولا۔

”مجھے ایسے اجازت ناموں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حکومت نے ایک بار ان دو ڈاکٹروں کی

”میں صاحب زادے! جہاں تم نے ایک فائز کیا! کوئے تمہارے ساتھ ہولے وہ آگے آگے اور تم ان کے پیچے بعض اوقات تو کم بخت چیخ چیخ کر شکار کا سارا مراکر کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل کوؤں کی اسی عادت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ جہاں انہوں نے بستی میں دو ایک فائز کے ان کے ساتھ ہون لئے۔ اس طرح یہ لوگ ان کوؤں کو بستی کے باہر ایک گلہ ہنکالے جاتے ہیں جہاں انہوں نے پہلے ہی سے بڑے بڑے جال لگائے ہیں وہ دراصل کوے پھساتے ہیں مارتے نہیں اپنے پل ایسا میں بندوق چلاتا منع ہے اسلئے انہوں نے خاص طور پر اجازت نامہ حاصل کیا ہے۔“ لیکن سارہ کے قتل سے ان کا کیا تعلق ہے۔“ حمید نے جلدی سے پوچھا۔ مگر اسے مایوسی ہوئی۔ وہ سمجھتا تھا شاید فریدی یا توں کی رو میں کچھ نہ کچھ ضرور اگل دے گا۔

”ایک بار کہہ دیا کہ میں ابھی اسے واضح نہیں کرنا چاہتا کیونکہ فی الحال میں قیامت ہی کے اسچ میں ہوں۔“

”پلے قیاس ہی کہا۔“ حمید بولا۔

”فضل ہے۔“ فریدی نے سگار سلاگتے ہوئے کہا۔ ”اب جاؤ۔“

حمدیہ ہوٹل ذی فرانس کی طرف روانہ ہو گی۔ راستہ بھر اس کا ذہن ان شکاریوں اور ان کی کہنی میں الجھا رہا، جو ایک تینی ایجاد کے سلسلے میں حکومت اور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چاروں شکاری بجایے خود اپنی کمپنی کی ابھی خاصی پہنچی تھے جس وقت وہ اعلیٰ قسم کے شکاری سوٹ میں ملبوس کانڈھوں پر بندوقیں لٹکائے شہر میں داخل ہوئے تو ان کے گرد اچھی خاصی بھیڑ لگ جاتی۔ وہ چاروں کافی وجیہہ اور مضبوط ہاتھ پرروائے تھے۔ تعلیم یافتہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ عوام سے گفتگو کرتے وقت ان کے لہوں میں عدد رجہ شاکنگی اور ملائیت ہوتی تھی۔ کاچوں کے بعض مخلے طلباء نہیں راہ چلتے روک کر کسی قریبی ریستوران میں چائے کے لئے طوکرستے اور وہ ان کی دعوت خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے اور پھر چائے کے دوران میں اپنی کمپنی کی اسکیم کی تفصیلات کے بارے میں بتاتے۔ شروع شروع میں حکمہ سراج رسانی کے بعض افراد نے ائمیں شک کی نظر وہ سے دیکھا تھا لیکن آخر کار انہیں بھی اپنی رائے بدلتی پڑی۔ اخبارات نے بھی ان کے متعلق بہت کچھ لکھا تھا۔ کسی نے اس اسکیم کا مضمون اڑایا تھا اور کسی نے اسے ”ترقی کی طرف ایک اور قدم“ سے تعبیر کیا تھا۔ بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔ البتہ حکومت

بھی تو مدد کی تھی جو آدمی کو کتوں کی سی قوت عطا کر دینے کا دعویٰ کرتے تھے۔ کیا یہ نیا ڈھونک بھی اسی قسم کا نہیں ہے۔ ہونہہ کوئے کے پروں سے کاغذ بنا کیں گے۔ بھلا دہ کاغذ کا نہ کام آئے گا، وہ بیک وقت کاغذ بھی ہو گا اور پکڑا بھی۔ اُس سے نہایت عمدہ قسم کے پیرا شوٹ ہاڑ جا سکیں گے۔“

”اور وہ پیرا شوٹ!“ حمید پش کر بولا۔ ”ہوابازوں کو یونچے لانے کی بجائے اپر لے جائیں گے۔“

”اچھا تو تم اسے مقاں سمجھ رہے ہو۔“

”بھی نہیں! میں نہایت سنجیدگی سے عرض کر رہا ہوں۔“

اسے سارہ کی موت یاد آگئی اور اس پر پھر پہلی سی دل گرفتگی کے آثار طاری ہونے لگے مگر سوال اب بھی اُس کے ذہن میں چھڑ رہا تھا کہ ان شکاریوں سے اس معاملے کا کیا تعلق؟ فریدا سے اُس کی توقع نہیں تھی کہ وہ بات کو اسی وقت صاف کر دے گا۔ بہر حال اُس نے سنجیدگی اس مسئلے کو کریڈنا شروع کر دیا۔

”ذرایہ تو سوچئے کہ وہ کاغذی پکڑا مہنگا کس قدر پڑے گا۔“

”مہنگا.... بھلا مہنگا کیوں پڑے گا۔“ فریدی نے کہا۔

”مکمل کرتے ہیں آپ بھی، کیا آپ کی نظر کار توں کی گرانی پر نہیں۔ یہ بھی ضرور نہیں کہ وہ ایک ہی فائز میں ایک کوا بھی مار لیں! لہذا یہ کتنا مہنگا پڑے گا یہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔“ فریدی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

حمدیہ اس مسئلے پر اپنے نکتہ نظر سے کچھ اور بھی روشنی ڈالنا چاہتا تھا فریدی کی آنکھوں دیکھتا ہوا بولا۔ ”کوئے کا شکار آسان نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں کوشش کروں تو پابند کار توں بر باد کرنے کے بعد بھی شاید کامیاب نہ ہو سکوں۔“

”خیر وہ تمہاری طرح حق نہیں ہیں۔ اگر وہ بندوق ہی سے کوؤں کا شکار کرتے ہوتے تو انہیں پاگل خانے بھجوادیتا۔“ فریدی نے کہا۔

”پھر...؟“

”میا کبھی شکار کے دوران میں تمہیں کوؤں کے جھنڈ کا سامنا کرنا پڑا۔“

”میں آپ کا مطلب تھیں سمجھا۔“

کی امداد کا انحصار اسکم کی کامیابی پر تھا۔

جھڑپ

دوسرے دن کے اخبارات میں حید کی فراری کا حال بڑی بڑی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ بات معمولی نہیں تھی۔ ایک اینے آدمی پر قتل کا الزام عائد کیا گیا تھا جس نے قانون کے محافظت کے مسئلے میں کئی بار موت کا سامنا کیا تھا۔

ایک اخبار میں حید اور سارہ کی تصاویر بھی چھپی تھیں۔ حید نے جب یہ تصویریں دیکھیں تو اسے کوئی ایسا موقع یاد رکھا جب اُس نے سارہ کے ساتھ کوئی تصویر کھپوڑا ہوا سکتے ہیں آئیں۔ اسے کوئی ایسا موقع یاد رکھا جب اُس نے سارہ کے ساتھ کوئی تصویر کھپوڑا ہوا نہیں کھپوڑا تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر اُسے حقیقی یقین آگیا کہ سارہ سازشیوں سے ملی ہوئی تھی۔ کیا وہ خود بھی اُس سازش سے بے خبر تھی۔ کیا اُن سازشیوں نے محض سونے کی روائی کے عدالتے اس لئے قتل کر دیا کہ کہیں یہ بات ظاہر نہ ہو جائے۔

حمدانہیں خیالات میں الجھا ہوا سڑکیں ناپ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ پیلک میں اپنے چہ میگوئیاں بھی سنتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ تو اُسے بیساختہ بھی آگئی۔ ایک صاحب ایک نوجی فرمادے تھے۔ ”ارے صاحب میرے خیال سے تو وہ جاؤس بھی کوئی ڈاکو ہی تھا۔ ارے آہ ہستے ہیں.... جناب والا.... کیا نام تھا اس کا.... بہرام ڈاکو.... بہرام ڈاکو ہمیشہ پولیس آفیس کے بھیں میں رہا کرتا تھا.... اس کی اصلی صورت سے کوئی واقعہ ہی نہیں تھا۔“

اس پر ایک طالب علم نہیں پڑا اور کہنے لگا۔ ”بہرام کا وجود نہیں تھا.... بہرام دراص لیمالک کے ناولوں کے ایک ڈاکو آر سین لوپن کا ردود ترجمہ ہے۔“

وہ صاحب بگڑ کر یوں۔ ”چلنے یہ ایک ہی رہی۔ آپ بچے نہیں کیا جائیں میاں میں نے اداوی کی زبانی ساختا! ان سے بہرام کا برا بیان تھا۔ وہ دل میں کو توال تھے۔ آپ شاید یہ بھی نہ جانتے ہوں کہ بہرام تھا کون۔ کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خیر تمہیں تو یہ بھی ہوائی ہی معلوم ہوگی۔ تمہارا نہیں انگریزی تعلیم کا قصور ہے۔ بہرام دراصل بہادر شاہ ظفر کا پرپوتھا تھا۔ اگر زندوں

نظام لئے کے لئے ڈاکو بن گیا تھا۔“

”میرا خیال ہے کہ خود بہادر شاہ ظفر ہی بہرام تھکص کرتے تھے۔“ طالب علم نے نہیں کر کہا۔ حید دل ہی دل میں تینچھے لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس وقت دراصل ان چاروں شکاریوں کی طلاش میں نکلا تھا۔ اس نے آج تک فریدی کے قیاسات کو قیاسات ہی کی حدود میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے شہادات عموماً حقیقت ہی ثابت ہوئے تھے۔

دفعتاً اسے کوؤں کا شور سنائی دیا۔ بیٹھا کوے فضا میں منڈلار ہے تھے وہ بس ایک عمارت پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد شکاری دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے فائز کیا۔ کوئے پھر شور چھاتے ہوئے آئے۔ حید بھی ان دونوں کے پیچھے ہو لیا۔ کوئے تھوڑی دور اڑنے کے بعد کسی عمارت یا درخت پر بیٹھ جاتے تھے اور جیسے ہی وہ دونوں شکاری ان کے نزدیک بیٹھنے پھر اڑ کر شور چھانے لگتے تھے۔ اس طرح وہ شکاری انہیں بستی کے باہر نکل لائے۔

بیہاں بیٹھ کر ان شکاریوں نے اپنی بندوقیں جھاڑیوں میں ڈال دیں اور خود ایک سائے دار درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ انہوں نے حید کو دیکھ لیا تھا اور ان کے چہروں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسی کیا ایسے میزان کے چہرے پر ہوتی ہے جو ایک میزز مہماں کے استقبال کا شرف حاصل کر رہا ہے۔

حید نے ایک درخت پر گوشت کے بڑے بڑے لوٹھڑے لٹکے ہوئے دیکھے جن کے گرد بے شمار چلپیں منڈلار ہی تھیں۔ کوؤں کا جھنڈا ان پر ٹوٹ، پڑا۔

”اہم آجائیے۔“ ایک شکاری نے حید کو مخاطب کیا۔

حید چپ چاپ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ جس درخت کے نیچے وہ لیٹے ہوئے تھے اُس کے سمتے ایک موٹی ہی ڈور لٹک رہی تھی جس کا سلسہ اوپر ہی اوپر دوسرے درخت سے جلا تھا۔ جہاں گوشت کے لوٹھڑے نظر آرہے تھے۔

”کیا آپ لوگوں کا تعلق اُس کپنی سے ہے جو پروں سے...؟“

”میں ہاں...!“ ایک شکاری بولا۔ ”آپ شاید یہاں اجنبی ہیں۔“

”میں...؟“ حید چوک پڑا۔

در شروع میں ہمارے ساتھ ایک جم غیرہوا کرتا تھا لیکن اب یہ چیز لوگوں کے لئے نہیں

س بھی اس کے لئے ایک بالکل ہی نئی قسم سے تعلق رکھتا تھا۔ ٹرک پر آیا ہوا آدمی بدستور اپنی
پر بیٹھا ہے۔

جال میں کوئی کے علاوہ چند چیلیں بھی تھیں اور دو ایک گدھ بھی۔ بقیہ پرندے ابھی تک
برپا تھے ہوئے اس درخت کے گرد منڈلار ہے تھے۔ حمید بھی شکاریوں کے ساتھ جال پر جھک
اور جب وہ اُسے سنجائی کی کوشش کر رہے تھے اس نے ان میں سے ایک کی جیب سے اس کا
سڑا لایا۔

ان دونوں کو اس کی خبر تک نہ ہوئی لیکن ٹرک میں بیٹھا ہوا آدمی اس کی حرکت دیکھ رہا تھا۔
بدنے پہلے ہی یہ بات محسوس کر لی تھی کہ وہ اس آدمی کی توجہ کامراز بنانا ہوا ہے اور حقیقتاً اسی چیز
نے اُسے اس حرکت پر اکسیلا ہوا تھا۔

اس نے ان دونوں کو جال اٹھانے میں مدد دی اور ان کے ساتھ ٹرک تک آیا۔ جال پر نہ دوں
بیٹ ٹرک پر ڈال دیا گیا۔ ایک شکاری حمید کی طرف ٹرک بولا۔ آپ ہمیں اپنا ایڈریس دے دیں گدھ
خاندیجا گا۔

”ہوٹل ڈی فرانس اکرمہ نمبر تیرہ... اور میرا نام سعید جو ہے۔“
”اُف فوہ“ ڈرائیور بولا۔ ”تو آپ کشمیری ہیں! لیکن لب والہجہ کشمیریوں جیسا نہیں ہے۔“

”میں عرصے تک اس صوبے میں رہا ہوں۔“ حمید نے کہا۔
”لیکن انہوں کو اس کے باوجودو بھی آپ شریف سوسائٹی کے قابل نہیں ہن کے۔“
”کیا مطلب....!“ حمید گزر کر بولا۔

”پُس نکالو....!“ ڈرائیور نے گرج کر کہا۔
حمدلہ بے تعاشر مخالف سمت میں جھاگنے لگا۔

”ٹھہرو! درنہ گولی مار دوں گا۔“ ڈرائیور نے لکھا۔ اس نے کچھ روپیوں اور نکال لیا تھا۔
حمدلہ نے پلٹ کر دیکھا اور رک گیا۔ ڈرائیور ٹرک سے اتر آیا تھا۔

”اوھر اکر...!“ اس نے گرج کر کہا۔
حمدلہ اپنے دونوں ہاتھ اٹھانے ہوئے ان کی طرف بڑھنے لگا۔ لیکن ڈرائیور اس بات سے

رہی۔ پھر بھی باہر سے آنے والے اب بھی اکثر ہمارے ساتھ ہو لیتے ہیں۔“

”میں نے اخبارات میں آپ لوگوں کی اسکیم کے بارے میں پڑھا تھا۔“ حمید بولا۔
”شکاری خاموش ہو کر اس درخت کی طرف دیکھنے لگا۔“

”اس طرح بہتیری چیلیں اور دوسرے گوشت خور پرندے بھی پھنس جاتے ہوں گے،“
حمدلہ نے کہا۔

”جی ہاں بعد کو ہم انہیں چھوڑ دیتے ہیں۔“

”میا آپ مجھے ایک گدھ عنایت کریں گے۔“ حمید بولا۔
”گدھ... بھلا گدھ کیا کجھ گا۔“ ایک شکاری سمجھی گی سے بولا۔

”آپ نہیں گے۔“ حمید نے احتمان انداز میں ہٹتے ہوئے کہا۔

”نہیں قطعی نہیں۔“ شکاری نے یقین دلایا۔

”آدمی کی بعض خواہشات بڑی احتمانہ ہوتی ہیں۔“ حمید بولا۔ ”چکن ہی سے میری
خواہش رہی ہے کہ میں ایک گدھ پاؤں لیکن میری یہ خواہش آج تک نہ پوری ہو سکی۔“

دوسری شکاری جو او نگھ رہا تھا یہ بات سن کر اٹھ بیٹھا اور حمید کو تھیک آمیر نظر وہی سے دیکھ
ہوا بولا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی آپ کا دولت خانہ کہاں ہے۔“

”دولت خانہ۔“ حمید نے شرمائی ہوئے انداز میں کہا ”میں کوئی مہاجن نہیں ہوں خطرہ کہ میر اونٹ ہے اور ایک چھوٹا موٹا زمیندار۔“

”خیر نہ آپ چھوٹے ہیں اور نہ موٹے۔ لیکن زمیندار ضرور معلوم ہوتے ہیں۔ خیر جان
آپ کی خواہش ضرور پوری کر دی جائے گی۔“

”حمدلہ جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دفعتاً ایک ٹرک آکر اُن کے قریب رک گیا۔“
نشست پر صرف ایک آدمی تھا جو صورت سے پیشہ ڈرائیور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایک شکار
نے اٹھ کر درخت کے تنے سے لٹکتی ہوئی ڈرائیور کا سر اکھنچ لیا اور پھر بے شمار پرندوں کے پروں ا
پھر پھر اہم اور اُن کی چینوں سے فضا مکدر ہو گئی۔

درخت پر پھیلا ہوا جال پرندوں سمیت لڑکتا نیچ آ رہا۔ بہت کم پرندے جال کی زند
نکل پائے تھے۔ دونوں شکاری اٹھ کر جال کی طرف لپکے۔ حمید بھی اُن کے پیچے دوڑا۔ شاید

خوزی دیر بعد بند گھوڑا گاڑی شہر کے پورے روشن حصوں سے گزرا رہی تھی اور حید اندر بیٹھا
لٹیناں سے اپنے چہرے پر ملامم اور گھوٹکھریا لے بال چپکانے کی کوشش کر رہا تھا وہ اس صفائی سے
ازی میں داخل ہوا تھا کہ کوچان کی نظر اس پر نہیں پڑ سکی تھی اور سیٹ پر بیٹھتے ہی اس نے گاڑی
ہادر و اڈہ بند کر دیا تھا اور اندر ہی سے اس کو چوان کو نیا گراہوٹل کی طرف چلے کو کہا تھا۔ نیا گرا
ہوٹل شہر سے باہر ایک پر فضام قائم پر واقع تھا۔ مناظر فطرت کے رسایا عموماً ہیں قیام کیا کرتے
تھے۔ لیکن ہوٹل اتنا مہنگا تھا کہ عام آدمی وہاں ناشست کرنے کی ہمت بھی شاذ و نادر ہی کیا کرتے
تھے۔ حید نے اس ہوٹل کا نام محض، اس واسطے لیا تھا کہ وہ شہر سے دور تھا۔ اس طرح دوران سفر
میں اُسے اتنا وقت مل جاتا کہ وہ فریدی کے میک اپ پر ایک دوسرا میک اپ بہ آسانی کر سکتا تھا۔
اس نے آئینے پر آخری اور تدقیدی نظر ڈالی۔ سیاہ رنگ کی گھوٹکھریا لی ڈاڑھی میں اس کا چہرہ
بیب لگ رہا تھا۔ اس نے تاریک شیشوں کی عینک آنکھوں پر جانتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھول دیا
وہ بھرپوری سے بکھر پڑتے ہیں کہ کپڑا پیٹ سے تباہ کو بھرنے لگا۔
یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ نیا گراہوٹل ہی میں ٹھہرتا۔ یہاں تک تودہ محض نے آیا تھا کہ اپنی
تل اٹیناں سے تبدیل کر سکے۔ اگر نیا گراہوٹل میں اُسے کوئی کمرہ نہ بھی ملتا تو وہ پھر شہر وابس
جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ کمرہ بہ آسانی مل گیا۔

خوزی دیر بعد وہ فریدی کو فون کر رہا تھا۔

”سعید جو بول زہا ہے.... فی الحال نیا گرہ کے چالیں نمبر میں قیام ہے۔ وجہ پھر بتاؤں گا۔....
لی..... نہیں بتاتا۔.... ضروری بات! اگر ان چاروں میں کوئی کوتاں میں روپرٹ لکھائے تو۔....
لو کے پڑھے کو مطلع کر دیجئے گا۔“

فریدی وجہ پوچھتا ہی رہ گیا لیکن حید نے رسیور کھو دیا۔
اُس نے کمرہ بند کر کے اٹیناں سے لوٹی ہوئی رقم کا جائزہ لیا۔ کل دوسرا تکسیں روپے تھے۔
یا گرہ میں دو تین دن قیام کرنے کے لئے یہ رقم کافی ہی نہیں بلکہ بہت تھی۔ چار بجے فریدی نے
سے فون پر کال کیا۔ اُس نے بتایا کہ شکاریوں نے اپنے لئے کی روپرٹ پولیس کو دی ہے۔ آدمی
کس نے خود کو کشیری ظاہر کیا تھا۔ اُنہیں لوٹ کر چلتا ہے۔

”یکھئے...!“ حید بولا۔ ”آپ کو یہ سن کر خوشی ہو گی کہ اس معاملے کو اختتام تک پہنچائے
کہ گاڑی والے کی نظر اس پر نہ پڑنے پائے۔

قطیعی لاپرواہ تھا کہ دوسری الحجہ خود اُس کے لئے بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ حید ان سے تین تقریب
کے قابلے پر رک گیا۔

”پانپر س نکالوں کے نہیں ہے۔“ ڈرائیور نے ایک شکاری نے کہا۔
اب شکاری نے گھبرا کر اپنی جیسیں مٹولیں اور بے اختیار ابہ اندراز میں حید پر جھپٹا۔
دفعہ حید جیچ مار کر زمین پر گرد پڑا اور پھر ڈرائیور کو یہ تک بھٹھے کی مہلت نہ ملی کہ زیوں الور
کے ہاتھ سے کس طرح نکل گیا۔

دوسرے لمحے میں حید ان گی طرف ریوں اور تانے اُنہیں ترک کے پاس سے ہٹا رہا تھا۔

”تمہاری جیبوں میں جو کچھ بھی ہو نکال کو زمین پر ڈال دو۔“

دونوں شکاری سر اسیگی کا شکار ہو گئے تھے۔ البتہ ڈرائیور کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔

دونوں اپنی بندوقیں بھی ترک میں رکھ چکے تھے۔ اس لئے اب اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔“
گیا تھا کہ وہ حید کے حکم کی تعیل کرتے۔ بادلی ناخواست انہوں نے اپنی جیبوں سے وہ سب کچھ نکالا۔

”واہی طرف منہ کرو۔“ حید گرج کر بولا۔

زمین پر پڑا ہو امال غیمت سنتا ہوا وہ پھر لکارا۔ ”چل پڑو۔۔۔ چلتے جائی۔۔۔ مڑ کر دیکھاوا
موت نے چپت لگائی۔ شاباش۔۔۔ لفت رائٹ۔۔۔ لفت رائٹ۔۔۔ لفت۔۔۔ لفت!“

اور جب وہ میں پیچیں گز آگے بڑھ گئے تو وہ اچھل کر ترک میں آبیٹھا۔

”تینوں گالیاں سکتے ہوئے ترک کے پیچھے دوڑ رہے تھے لیکن اب حید کو پہاڑ اسماں کام نہیں فدا
شہر کے قریب پہنچ کر اس نے ترک چھوڑ دیا اور پیدل چل پڑا۔

وہ جلد سے جلد کیفیتی فرانس کی رہائش ترک کر دیا چاہتا تھا کیونکہ اس جیلیہ میں اس

خود کو مٹکوں بیانا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ اس واقعے کی روپورٹ ضرور کریں گے۔

ہوٹل ڈی فرانس پہنچ کر اس نے حساب بے باق کیا اور ایک دیہر کو بند گاڑی لانے کی ہدایت
دیتا ہوا پھر اپنے کمرے میں واپس آگیا۔ اس کا کل سامان ایک بسٹر اور ایک سوت کیس پر مشتمل تھا۔

پدرہ منٹ بعد دیہر واپس آگیا۔ حید نے سامان اُس سے بھجوایا وہ ذرا مصل اس فکر میں
کہ گاڑی والے کی نظر اس پر نہ پڑنے پائے۔

بغیر اپنے اور کاملی مسلط نہ ہونے دوں گا۔“

”اب کیا سوچ رہے ہو۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”کچھ نہیں حالات کا منتظر ہوں۔“

”اطلاعات دیتے رہنا۔“

”اگر ضروری سمجھا تو....!“

”کیڑے زیادہ نہ کلکلائیں تو بہتر ہے۔“ فریدی کا تلخ لجہ سنائی دیا۔

”میں نکما نہیں ہوں۔“

”اچھی بات ہے۔“ دوسری طرف سے جھلائی ہوئی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

جمید نے فون پر ہیڈ ویٹر کو اطلاع دی کہ وہ ناشتہ ڈائینگ روم ہی میں کرے گا۔

شام کا لباس پہن کر وہ نیچے آیا۔ وہ ہر قدم پر رک کر کچھ سوپنے لگتا تھا۔ پھر اچانک اُر

نے اپنی رفار تیز کر دی اور ڈائینگ روم ہی میں آگردم لیا۔ اس کی صورت تو فلسفیوں جیسی ہوئے

گئی تھی اب وہ اپنے حرکات و سکنات سے بھی یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ سو نیصد ا

فلسفی ہے۔

لیکن یہاں پہنچتے ہی اچانک اس پر بدحواسی طاری ہو گئی۔ کیمن نمبر آٹھ میں چاروں شکارا

چائے پی رہے تھے۔ وہ آہستہ سے ایک طرف ہٹ گیا لیکن نمبر سات خالی تھا۔ اس وقت جلت

یہی تقاضہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسی کیمن میں جا کر بیٹھ جائے۔

پہنچتے ہی اس نے گھٹنی بھائی ویٹر نے ناشتے کا سامان میز پر لگا دیا۔

جمید کے کان کیمن نمبر آٹھ کی طرف لگے ہوئے تھے۔

”رُک کہاں ملا تھا۔“ ان میں سے کسی نے پوچھا۔

”بائیم روڈ کے چوراہے پر۔“

”تم دونوں خاصے الو ہو۔“

”بھلاکم کیا جانتے کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ اس قسم کے لوگ ہمارے پیچے لگتے ہی رہا کرتے ہیں۔“

”غیر... بہر حال یہ اچھا کیا کہ رپورٹ کر دی۔“

”اور سننے اُس نے اپنے حقیقتاً صحیح بتایا تھا۔ میں نے ہوٹل ڈی فرانس میں پڑھ لکایا ہے لیکن۔“

ہمارے پہنچنے سے دو گھنٹے قبل ہی جاپ کا تھا۔ بہر حال پولیس اُس گاڑی والے کی تلاش میں ہے،
جو نے دہاں سے لے گیا تھا۔“

جمید نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اس
نے میک اپ کرچکنے کے بعد گاڑی کی کھڑکیاں کھول کر غلطی کی تھی اُسے کوچوان کے سامنے تو آتا
ہی نہ چاہئے تھا۔ اگر وہ چاہتا تو نیا گراہوٹ پہنچنے پر بھی خود کو کوچوان کی نظر دوں سے بچا سکتا تھا۔

جال

اس نے سوچا کہ کیوں نہ فریدی کو اُس گاڑی بان کے متعلق فون کر دے کہ وہ اُسے پولیس
کے ہتھے نہ چڑھنے دے۔ گاڑی کا نمبر اُسے اچھی طرح یاد تھا اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ نمبر
دیکھنے یا یاد رکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ تو اتفاقاً اُس کی نظر نمبروں پر پڑ گئی تھی اور
ساتھ ہی اُسے یہ یاد آگیا تھا کہ اُس کی بیہدہ کی پالیسی کا بھی یہی نمبر ہے۔ اس طرح گاڑی کا نمبر
اُسے یاد رہ گیا تھا۔

جمید نے فون کا رسپورٹ اٹھا کر پھر رکھ دیا۔

اس کے ذہن میں ایک نئی چال انہر رہی تھی۔ تین چار منٹ تک اُس کے چہرے پر کچھ

عجیب سے آثار دکھائی دیتے رہے پھر وہ آہستہ سے بڑھا۔ ”فون تو کری دینا چاہئے۔“

اُس نے پھر رسپورٹ اٹھایا۔ لیکن فریدی گھر پر موجود نہیں تھا۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر

اس کی انگلی فون کے ڈائل پر گھومنے لگی۔

”ہیلو... انپکٹر جگد لیش... وہ تو اچھا تم ہی ہو... میں فریدی بول رہا ہوں... کہو وہ
گاڑی ملی یا نہیں۔“

”کون کی! دوسری طرف سے آواز آئی۔“

”امام وہی کشیری والا کیس۔“

”میں نہیں... ابھی نہیں ملی.... لیکن آپ...!“

”ہاں میں اس میں تھوڑی بہت دلچسپی لے رہا ہوں۔“ جمید بولا۔ ”دکھو اگر وہ مل بھی جائے

تو اس کی روپورٹ پر فی الحال عمل درآمد نہ کرتا۔ ”
”بہت بہتر.... لیکن....!“

”لیکن یہ کہ تم ہمیشہ حق رہو گے۔ اے بھائی جو میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“
”بہت بہتر۔“
رسیور رکھ کر حمید نے اطمینان کا سائنس لیا۔ لیکن وہ اب بھی یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں فریز
اور جکد لیش کی ملاقات نہ ہو جائے۔

”اوہ نہ...!“ اُس نے سر جھک کر اپنا سوت کیس کھولا اور ایک روپورٹ کا لکال کر جیب میں
ڈال لیا۔ اب وہ زینے طے کر کے ڈائیگ ہال کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے ان چاروں شکاریوں کو ہال سے اٹھ کر باہر جاتے دیکھا اور تھوڑے فاصلے سے انہا
تعاقب کرنے لگا۔ اس کا خیال غلط نہیں تھا۔ اس نے پہلے ہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ بیر ونی پارک کی
طرف جا رہے ہیں۔

پارک میں پہلے سے بھی کچھ لوگ موجود تھے۔ حمید ان چالوں سے زیادہ دور نہ ہونے کی بہاء
پران کی گفتگو صاف سن رہا تھا۔

”لویار....!“ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا ”بعض اوقات میں واقعی حماقت کر بیٹھتا ہوں۔
باتوں کی رو میں کار سے انہیں کی کنجی سک نہیں نکالی۔“

”اوہ دوسرا حماقت مجھ سے سن لو۔“ وسر آؤ دی بولا۔ ”تم نے کار قطعی غلط جگہ کھڑی کی
ہے۔ اس وقت میں نے تمہاری دل ٹھکنی کے خیال سے تمہیں نوکا نہیں۔ نیا گرام میں آنے والی
کاریں عموماً کیرج میں کھڑی کی جاتی ہیں، لیکن تم باہر ہی چھوڑ آئے ہو۔“

”اوہ نہ! چھوڑو بھی سب چلا ہے۔“ تیرے نے کہا۔
چاروں ایک ٹھیک پر بیٹھ کر سگریٹ سلاکنے لگے۔

کیرج عمارت کی پشت پر تھا۔ وہ کافی طویل اور تقریباً چالیس بچاپ حصوں پر مشتمل تھا۔ ہر
 حصے پر نمبر پڑے ہوئے تھے اسے ایک چوکیدار کنٹرول کرتا تھا۔ جب بھی کوئی کار اس طرف آتا
چوکیدار حصے روشن کر دیتا۔ اس کے سامنے ایک چارٹ ہوتا تھا جس پر وہ خالی اور بھرے حصوں
میں نشانات لگایا کرتا تھا۔ بہر حال کیرج کو کنٹرول کرنے کا طریقہ سائنسیک اور بالکل نیا تھا۔ ورنہ

ابدا کیران ایک چوکیدار کے بیس کاروگ نہیں تھا۔

شکاریوں کی گفتگو شنے کے بعد حمید چپ چاپ وہاں سے کھک گیا۔ کیرج سے تھوڑے
ملے پر اُسے باداںی رنگ کی ایک کار کھڑی دکھائی دی۔ اُس نے اندر جھاک کر دیکھا تا لے میں
ئی گلی ہوتی تھی۔ وہ کار کو اشارت کر کے کیرج کے قریب لایا۔ چوکیدار نے ایک حصے کے نمبر
بشن کر دیئے اور حمید نے کار اندر لے جا کر کھڑی کر دی۔ پھر اُس نے انہیں کھول کر اُس پر دست
فقط پھیرا لیکن کنجی بدستور گلی رہنے دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر پارک میں آگئا۔ چاروں شکاری اب بھی اسی ٹھیک پر بیٹھے ہوئے تھے اور
پید بے چیزی سے اُن کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا۔

اُسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر کیرج کی طرف پلے حمید تھوڑے
ملے سے اُن کا تعاقب کر رہا تھا۔ انہیں اکافی چیل گیا تھا اور کیرج کے آخری سرے والے یک پ
ست کی روشنی پورے حصے کو روشن کرنے کے لئے کافی نہیں تھا۔ شاید وہ چاروں کار کو اس جگہ
پا کر تھی تھے۔ آخر کار چوکیدار نے اُن کی رہنمائی کی لیکن انہیں اُس کی زبانی یہ سن کر جیزت
وئی کہ کسی ایسے آدمی نے کار کو کیرج میں پہنچایا تھا جو ان میں سے نہیں تھا۔

ایک شکاری نے اندر جا کر کار کو باہر نکالنا چاہا لیکن کار اشارت ہی نہ ہوئی۔ میاں حمید نے
خن پر ذرا گہرے قسم کا ہاتھ پھیرا لیا۔

آخر ان تینوں کو بھی اُس کی مدد کے لئے اندر جانا پڑا۔

کیرج کے قرب و جوار کے حصے بالکل ویران تھے اور چوکیدار بھی اپنی جگہ پر واپس جا چکا تھا۔
میدنے جیب میں ہاتھ ڈال کر روپورٹ کا دستہ مضبوطی سے کپڑا لیا۔ دوسرے لمحے میں وہ کیرج کے
ندر تھا۔

”کیا یہ کشیری آپ لوگوں کی مدد کر سکتا ہے۔“ اس نے روپورٹ کا لئے ہوئے کہا۔

”تم....!“ ایک چوک کر بولا۔

”ہاں میں.... ذرا اپنے ہاتھ اوپر اٹھا لو اور ہاں وہ میرا گدھ کہاں ہے؟“

چاروں بال اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے سکتے کے عالم میں کھڑے رہے۔

”تم نے میرے خلاف روپورٹ دنے کا بچھا نہیں کیا۔“

"ہم پھر پورٹ کریں گے۔" ایک نے بگڑ کر کہا۔
"ذر آہستہ فرزند....!" حمید بولا۔ "یریو اور بغیر آواز کا ہے۔ شور پسند نہیں کرتا۔"
"تم ہو کون۔"

"تمہاری تجارت کے حصے کا جائز حق دار! یہاں ہر نیا کام شروع کرنے والا ہمارا حصہ ضرور تھا۔ نہ صرف میرا!... بلکہ میرے گروہ کا بھی.... کیا سمجھے؟"
"نہ جانے کیا الٹی سیدھی ہاں رہے ہو۔ جانتے ہو شریف آدمیوں کو پریشان کرنا جرم ہے۔"
"یہ بھی جانتا ہوں اور تمہاری شرافت سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ ہر حال معاشرہ کی بات کرو۔"

"کیا معاملہ....!"
"اچھی بات ہے۔" حمید نے دھمکی دی۔ "اگر میں کھاتی نہیں تو ڈھلکا دیتی ہے۔ اچھا تو میں چلا۔... نہ تم میرا کچھ لگا سکتے ہو اور نہ پولیس۔ سردار صدر کو میں لوٹا سمجھتا ہوں۔"
"حیدر یو اور کارخانی کی طرف کئے ہوئے دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔
"ٹھہر دو....!" ان میں سے ایک آہستہ سے بولا۔ "تم کون ہو....!"
"اے تم مجھے نہیں جانتے۔" حمید مسکرا کر بولا۔ "حالانکہ میں تم لوگوں کے متعلق سچھ جانتا ہوں اور تمہاری ایک حرکت کی بناء پر تم سے سخت تنفس بھی ہوں۔"
"کون سی حرکت....!"

"اُس انگلو اٹھین نر کا قتل! تمہارا مقصد دوسرا طرح بھی حل ہو سکتا تھا۔ مگر نہیں سردار صدر... جابر کے کسی شاگرد کی طرح ذہین نہیں ہو سکتا۔"

"جابر.... کون جابر....!"
"تم جابر کو بھی نہیں جانتے۔ تب تو تم نے تاحق اس کاروبار میں ہاتھ لگایا ہے۔"
"کون سا کاروبار....!"

"اوہ....!" حمید نہیں پڑا۔ "تو کیا آزاد بینک کا سوتا یونی خاک ہو گیا۔"
"تم کون ہو۔" چاروں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ ان کی آذائیں خوفزدہ تھیں۔
"جابر سا کا ایک شاگرد.... وہ جابر جو اپنے وقت کا ایک ذہین ترین آدمی تھا۔ وہ جابر جس کے لئے جابر کے کارناموں کیلئے جا سو سی دنیا کے نادل "خطرناک بوڑھا" اور "مصنوعی ناک" جلد نمبر 2 پڑھئے۔"

ل کی جگہ ایک نار تھا اور اس کے باوجود بھی وہ ہر طرح کی آواز پر قادر تھا۔"
چاروں خاموش رہے اور حمید پھر بولا۔
"تم نے شاید اس جا سو س کو بھی نکالنے لگا دیا۔"
"نہیں یہ غلط ہے۔" ایک بولا۔
"ہو گا! مجھے اس سے سر دکار نہیں۔" حمید لا پر دوائی سے بولا۔ "میں تو اپنا حصہ چاہتا ہوں... وہی لو... اپنے روپے... جابر کا کوئی شاگرد گرہ کٹ یا گھلیا قسم کا لیرا نہیں ہوتا۔ یہ تو محض تم دگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے تھا۔"
حمید نے جیب سے نوٹ نکال کر ان کے سامنے چھیک دیئے۔
وہ چاروں کچھ نہیں بولے حمید نے پھر کہا۔
"میں یہیں اسی ہوٹل میں ٹھہر ہوں گا... تھا... کمرے کا نمبر چالیس ہے۔ اس کے باوجود بھی میرا دعویٰ ہے کہ میرا کوئی کچھ نہیں بکار سکتا۔ ویسے رویا اور کی گولی سے مجبوری ہے وہ بھی اگر انہیں سے چلانی جائے۔ لیکن اس پر بھی تم نہ فتح سکو گے کیونکہ مجھ میں پانچ آدمی تمہارے راستے واقف ہیں اور میں انہیں کامنا نہ کرہوں۔"
"ریو اور جیب میں رکھ لیجھ۔" ایک شکاری آہستہ سے بولا۔ "اس پر غور کیا جائے گا۔"
سمید بنے ریو اور جیب میں ڈال لیا۔
پھر وہ چاروں حمید سمیت گیرج سے باہر آگئے۔
"اُو! میرے ساتھ۔" حمید نے کہا اور وہ سب پھر ڈاٹنگ ہال میں آگئے۔
"نہیں یہاں ٹھیک نہیں ہے۔" اُس نے پھر کہا اور انہیں اپنے کمرے میں لے آیا۔
آن میں سے ایک آدمی کو حمید بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اُسے الجھن میں ڈالے ہوئے تھیں۔ اس کا ذہن بار بار دھرا رہا تھا۔ کہاں دیکھا ہے۔
پھر دفلاؤ سے اُس ڈاکٹر کی آنکھیں یاد آگئیں جس نے اُسے شراب پلائی تھی۔ حمید نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
"معاملات طے ہو جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔" حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔
"ہم بڑی دیر سے آپ کے اس مذاق سے لطف انداز ہو رہے ہیں۔" اُس شکاری نے کہا ہے۔

دوسرے ٹکاری بھی کھڑے ہو گئے۔ انہیں اپنے روپ اور نکال لینے کا موقع مل گیا تھا۔ لیکن حمید کے تیز قبیلے سن کر ان کے ہاتھ کا پت گئے۔

”فضلوں ہے دوستو پانچ خوناک آدمی بھوتوں کی طرح تمہارے پیچے لگ جائیں گے اور وہ مجھے بھی زیادہ شاطر ہیں۔“

سردار صدر نے اپنے ساتھیوں کو ڈانشا اور انہوں نے پھر اپنے روپ اور جیبوں میں ڈال لئے۔ ”پلو منظور....!“ اُس نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن میری بھی دو شرائط ہیں۔“

”یا....؟“

”تمہیں اپنے ساتھیوں کو بھی مجھ سے ملانا پڑے گا۔“

”دوسری شرط....؟“ حمید نے پوچھا۔

”بیٹھے بیٹھے حصہ نہیں ملے گا۔ تمہیں ہمارا ہاتھ ملانا پڑے گا۔“

”دوسری شرط قطعی منظور ہے۔“ حمید نہ کہا۔ ”لیکن پہلی شرط کے سلسلے میں مجھے دھرانا پڑے گا کہ میں جابر کاشاگر ہوں۔“

”ماض صاف کہو۔“

”بالکل صاف ہے وہ پانچ آدمی بھی ہاتھ بنا کیں گے لیکن وہ تم پر ظاہر نہیں کے جاسکتے۔“

”سمجھوتے کے لئے اعتبار شرط۔“ سردار صدر نے سمجھدی گی کے کہا۔

”استاد جابر معاملے کا پاک تھا لیکن وہ کسی پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔“

”تب تو پھر سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔“

”تمہاری خوشی۔“ حمید لاپرواں سے بولا۔ ”ویسے سترہ ڈاؤن پر تمہیں سونا تو کیا لوہا بھی نہیں ملے گا۔“

”ایامطلب....!“ صدر چوک کر بولا۔

”تم شاید یہ بھول رہے ہو کہ اس لوٹنے نے تمہیں یہ اطلاع نئی کی حالت میں دی تھی۔“

”تم یہ بھی جانتے ہو۔“ سردار صدر کامنہ حرمت سے پھیل گیا۔

”میں تم سے پہلے یہی کہہ چکا ہوں کہ ہمیں ایک ایک حرکت کا علم ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ سوچتے کس آئے گا۔“

حمدی بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”خیر....!“ حمید نہ اسامنہ بنا کر بولا۔ ”مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔“

”آپ اعتراف کرتے ہیں کہ آپ وہی ہیں جس نے ان دونوں کو لوٹا تھا؟“ ٹکاری نے پوچھا۔

”ہاں! اور وہ فون رکھا ہوا ہے! تم پولیس کو اطلاع دے دو کہ تم نے اُس آدمی کو پالا یا ہے

وہ چاروں عجیب قسم کی کش کش میں جلتا ہو گئے تھے۔ جانی پچانی آنکھوں والا آہستہ سے بولا۔

”ہم سے کس قسم کا سمجھوتہ کرنا ہے؟“

”آدھا.... آدھا....!“

”یعنی....!“

”تمیں سیر سونا اور وہ جو دل اور گمراہ سے آ رہا ہے۔“

”بیک میل کرنا چاہیتے ہو۔“

”حمدی نے قبیلہ لکھا اور ویریکٹ ہستار بہ۔ پھر بولا۔

”بیک میل شریف آدمیوں کو کیا جاتا ہے۔ اگر تم ہمارا حصہ ہمیں دو گے تو ہم زبردستی چھیم لیں گے۔“

”یہ بات ہے۔“ ٹکاری کی بھنوں تن گئیں۔

”سنوم تم چار ہو اور میں اکیلا۔ مجھے گھور کرنے دیکھو۔“ حمید نہیں پڑا۔

شکاری پھر کسی سوچ میں پڑ گیا تھا۔

حمدی نے خود ہی چھیڑا۔ ”ہم تمہاری ایک ایک بات سے باخبر ہیں۔ کیا تم نے شہر کے مشہور سوسوں کو دوسری طرف المجادینے کے لئے سارہ کو قتل نہیں کیا۔“

”ڈر آہستہ بولو۔“ شکاری نے خوفزدہ لمحے میں کہا۔

”سردار صدر مجھے یقین ہے کہ تم نا سمجھی سے کام نہ لو گے۔“

”کیا....!“ ٹکاری اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹھو بیٹھو....!“ حمید نے پر سکون لجھے میں کہا۔ ”میرے علاوہ میرے پانچ ساتھی بھی تمہیں اچھی طرح پچھانتے ہیں۔“

”مکب آئے گا...؟“

”سردار صدر میں نشے میں نہیں ہوں۔“ حمید نے قہقہہ لگای۔
صدر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی آنکھیں گھری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ آخر کا
طویل سانس لے کر بولا۔ ”اچھا دوست! مجھے منظور ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتاؤں کہ میر
بازوں کو زندہ نہیں رہنے دیتا۔“

”استاد جابر کا بھی بیہی اصول تھا۔“ حمید نے خندہ پیشانی سے کہا۔

”کل دس بجے کار خانے میں آجائے۔“ صدر امتحانا ہوا بولا۔ ”لیکن اگر اس دوران میں پوا
کے تھے چڑھ جاؤ تو ہمیں الزام نہ دینا کیونکہ اس گاڑی کی تلاش جاری ہے۔“
”اُس کی فکر مت کرو۔“ حمید نے مکرا کر کہا۔ ”میرے ساتھوں نے کوچوان کو سنبھالا
ہے۔ جابر کے شاگرد کچاکام بھی نہیں کرتے۔“

”اچھا تو شب بخیر۔“

اعلیٰ ترین اخلاق کے مظاہرے کے طور پر حمید انہیں گیرج مک نہ صرف چھوڑنے آیا
گاڑی کا انحنٹھیک کرنے میں انہیں مدد بھی دی۔

ایک انکشاف

ان کی کار چلی بھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حمید اپنی جگہ پر جم سا گیا ہو۔ وہ درا۔
فریدی سکن پہنچنے کے لئے بڑی طرح بے چین تھا۔ غیر متوقع طور پر حالات بنے نی کروٹ
تھی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا دوسرا قدم کیا ہونا چاہئے اور پھر وہ اس پر اپنی
گذاریوں کا رعب بھی ڈالنا چاہتا تھا۔

یہاں تیکی کی توقع خضول تھی کیونکہ یہاں زیادہ تر ایسے ہی ذی حیثیت لوگ آتے تھے
کی اپنی کاریں ہوں۔ اس نے سوچا چلو پیدل ہی سکی کبھی نہ کبھی تو پہنچ ہی جائے گا۔ لیکن اُ
خش نسبی ہی کہنا چاہئے کہ چھانک سے باہر قدم نکالنے ہی اُسے ایک تیکی دھماکی دی۔ جو سڑ
کے کنارے کھڑی تھی اور اس کا ذرا سیور نارچ کی روشنی میں انجن پر جھکا ہوا تھا۔ شاید کوئی خ

تھی۔

”شہر چلو گے بھی۔“ حمید نے لہک کر پوچھا۔

”کیوں نہیں.... گرفتاری کچھ دیر گا جائے۔“ ذرا سیور بدستور سر جھکائے ہوئے بولا۔

”پرواہ نہیں.... میں انتظار کروں گا۔“ حمید دروازہ کھول کر اندر بیٹھتا ہوا بولا۔

دو تین منٹ بعد انہیں اسٹارٹ ہو گیا۔

”یہاں جائیے گا۔“ ذرا سیور نے کھڑکی سے حمید پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

”تیرہ سو مرست اسٹریٹ۔“ حمید نے جواب دیا اور ذرا سیور اپنی سیٹ پر آیا۔

”اپنکر فریدی کے یہاں جائیے گا۔“ ذرا سیور بولا۔

حمید اچھل پڑا اور اس کا ہاتھ بے اختیار جب کی طرف گیلڈ ذرا سیور بدستور اسٹریٹ گ کرتا رہا۔

”کیا تم جانتے ہو۔“

”ہاں....!“ ذرا سیور بولا۔ ”فریدی کو بھی اور فریدی کے پڑھے حمید کو بھی۔“

حمید نے روپ اور کی ٹال اس کی پشت سے لگادی۔

”وہ کو اور نہ گولی مار دوں گا۔“

”ملدو....!“ ذرا سیور نے لاپرواںی سے کھا اور اپنی جگہ سے ہلاکت نہیں۔ تیکی بدستور چلتی رہی۔

”زوکو....!“

”واہ یہ اچھی زبردستی ہے۔“ ذرا سیور نے کہا۔ ”اچھا چلو کر ایسے بھی مت دینا۔“

”میں سچ مار دوں گا۔“ حمید گرج کر بولا۔

”قچی مار دو....!“ ذرا سیور ہنس کر بولا۔ ”لیکن تمہارے روپ اور کی گولیاں تو میرے پاس ہیں۔“

حمید نے غور کیا تو حقیقتاً روپ اور کو بالکل غالی پایا۔

”یکوں ہے تاہمی بات!“ ذرا سیور نے کہا۔ ”بہت چالاک بنتے تھے۔ آج ایک اٹاڑی کی جب

سے پس غائب کر کے تم اپنی ہاتھ کی صفائی پر پھول گئے تھے۔ اب بتاؤ کیسی روپی۔... سردار صدر

و دھوکا دینا آسان کام نہیں۔“

حمد کے ہاتھ پر پھول گئے۔ لیکن اُس نے جی کڑا کر کے قہقہہ لگاتی دیا اور پھر پر جوش انداز

میں بولا۔

”میرے پانچوں ساتھی...!“

”سرے سے بندل ہیں۔“ اس کی بات کاٹ دی گئی۔

”جاپر کے شاگرد...!“ حمید ہکلایا۔

”زرے چخد ہیں۔“ ڈرائیور نیچی میں بول پڑا۔

”لیکن میں نہیں ہوں۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”تم چخد سے بھی کتر ہو۔“

دفعتہ حمید نے ریو اور پھینک کر اس کی گردن پکڑ لی۔

”خیر تم میں اتنی طاقت نہیں معلوم ہوتی لیکن میں گاڑی درخت سے نکلائے دیتا ہوں۔“

اور حمید نے اچانک محسوس کیا کہ ڈرائیور کی دھمکی عملی جامہ پہننے ہی والی ہے۔ اسے

گردن چھوڑ دی اور بد حواس ہو کر سیٹ پر گر گیا۔

ڈرائیور نے ہمی طرح نفس رہا تھا۔

کار شہر کی سڑکوں سے گذرتی ہوئی سو مرست اسٹریٹ کی طرف ہوئی اور حمید پاگل ہوانے کی حد تک اجھے لگائے توقع تھی کہ وہ کہیں اور لے جایا جائے گا۔ لیکن وہ سو مرست اسٹریٹ...!

لیکن فریدی کی کوئی کیمپاؤٹ میں داخل ہو رہی تھی اور حمید کے ماتھے پر پیٹے کی بوندیر پکوٹ رہی تھیں۔ لیکن پورے نیکوں میں رک گئی۔

”آترے سر کار...!“ ڈرائیور مز کر بولا اور حمید کے منہ سے چین ٹکل گئی ڈرائیور کی گھٹ ڈاڑھی غائب تھی اور فریدی کی طنز آمیز مسکراہٹ اس کے سینے میں کچوکے لگا رہی تھی۔

”معاف کیجئے گا...! میں پچان گیا تھا۔“ حمید کھلائی ہٹی کے ساتھ بولا۔

”ضرور ضرور... اسی لئے میرا گھٹ بھی گھونٹا جا رہا تھا... چلو اڑو۔“

وہ دونوں نیکی سے اتر کر اندر آئے۔

”لیکن اس کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید جھلا کر بولا۔

”میں نے سوچا کہ کہیں تم اپنی کار گذاری پر مغرورنہ ہو جاؤ اسلئے ایک ہلکا سا ڈوز ضروری ہے۔“

”آپ واقعہ ہیں۔“

”تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں وہاں جھک مار رہا تھا۔“ فریدی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

”اگر ضرورت پڑ جاتی تو میں تمہارے اُن پانچوں ساتھیوں میں سے ایک کارول تو ادا کر دیتی۔“

”تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں نے کوئی بڑا کار نامہ سرانجام نہیں دیا۔“ حمید نے خنک لبھے

میں کہا۔

”میں یہ تو نہیں کہتا۔ آج میرا دل چاہتا ہے کہ میں تم پر فخر کروں۔“

اس جملے پر حمید کے تکوؤں سے کھوپڑی تک تر دوڑ گئی۔

”لیکن آپ نے میرے ریو الور سے کار تو سکس طرح غائب کئے تھے۔“

”جب تم تیکی میں بیٹھ رہے تھے اُس وقت میں نے ریو اور تمہاری جیب سے نکال لیا تھا اور

کن ٹھیک ہو جانے کے بعد جب میں نے تم سے گفتگو کی تھی اُسی وقت وہ تمہاری جیب میں واپس

کی چلا گیا تھا۔“

”کمال ہے۔“

”لیکن تم نے انہیں لوٹا کس طرح تھا۔“ فریدی نے پوچھا۔

حمدید نے پورا واقعہ دہرانے کے بعد کہا۔ ”میں نے آپ کا نام لے کر جگدش سے کہہ دیا تھا وہ گاڑی بان کی اطلاع پر تقییش نہ کرے۔“

”یا تم بچھ عقل مند ہوتے جا رہے ہو۔“ فریدی اُسے گھور کر بولا۔ ”کیوں نہ ہو خود بھی تو

نہ ہو۔“

”جانب میں شروع ہی سے عقل مند ثابت ہو رہا ہوں۔“ حمید نے اکڑ کر کہا۔ ”اب آپ کیا

ماتے ہیں سردار صدر کے متعلق۔“

”نیک ہے وہ سردار صدر ہی ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کی موت ہی کچھ مشکوک قسم کی

لی تھی۔ جلی ہوتی عمارت سے جو لاش نکلی تھی وہ کسی اور کی روヒی ہو گی۔“

”لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کو لئے ہماریوں پر شبہ کس طرح ہوں۔“

”کوئی کی وجہ سے۔“ فریدی کچھ سوچتا ہو بولا۔

”ہاں! میں نے ایک بار کوئی وجہ سے سونے کو خاک ہوتے دیکھا تھا۔“

حمدید کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فرمادی، لیکھ اور بھاگ کر گا لکھنا۔ اسے

”زینت پارہ کو کہتے ہیں۔ زریخ ہڑتال کو۔ سرب معنی سیسے۔ گوگرد گندھک کو اور طوطا تم نتھی ہو گے۔ کیونکہ اس کا دوسرا ہم قافیہ لفظ تم پر صادق آتا ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کیا کیا جانتے ہیں۔“

”میں کچھ بھی نہیں جانتا۔“ فریدی نے مخصوصیت سے کہا۔

”تو آپ کو کیمیا کے اور بھی نئے معلوم ہوں گے۔“

”ستکلروں۔“

”کوئی کامیاب بھی ہو۔“

”ایک بھی نہیں! ارے میاں نیہ خط ہے۔ دھاتوں کی شکل تبدیل کی جاسکتی ہے لیکن اصلیت نہ۔ عربوں نے اسے بطور فن اختیار کیا تھا اور اسے الکیمیا کے نام سے لکھا تھا۔ مغربیوں اسے اپنا کرال کہی بنا لیا۔ پھر اسی کو کیمسٹری کا نام دے کر اس کا دائرہ بہت وسیع کر دیا گیا۔“

”لیکن میں نے نہ ہے۔“ حمید بولا ”کہ بہترے سادھو جری بیٹھوں کے ذریعہ کھری چاندی لمرا سوتا ہا لیتے ہیں۔“

فریدی ہنسنے لگا... پھر بولا۔

چلو ایک سادھو صاحب کی غزل اسی موضوع پر سن لو۔

تین پات کا بروا جیہہ کا جانے سب کوئے

ہائے پھولے باٹے پھولے، پھولے بارہ ماں

رنگ نکال کے بنگ میں ڈالو خرتے چاندی ہوئے

اب اگر ہمت ہو تو ڈھونڈ نکلاوس تین پتیوں والے پوے کو جس میں سال بھر پھول آتے ہیں جسے ہر شخص جانتا ہے اُس کے پھول کارنگ نکال کر رانگے میں ڈالو چاندی ہو جائے گا۔

دوسرے بزرگوار فرماتے ہیں۔

دھات سے دھات لڑا مرے پوتا

کہاں کی بوٹی کہاں کا بونا

”معنی جری بیٹھوں کا چکر فضول ہے۔ دھات کو دھات سے لڑاو چاندی یا سوتا بن جائے گا۔“

ے پاک دھات سے دھات لڑانے کا نقشہ بھی موجود ہے۔ لیکن حمید صاحب سب بکواس

ماہوی ہوئی اور ماہوی کا لازمی تجھے جملہ ہت تو ہوتی ہی ہے۔

”میں نے بھی ایک بار۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”کوئے ہی کی وجہ سے آؤں کو ہوتے دیکھا ہے۔“

فریدی ہنسنے لگا۔

”بچپن میں مجھے کیسا گری کا خبط تھا۔“ اُس نے کہا اور اسی نسلے میں میں نے سونے کو ماہ ہوتے بھی دیکھا تھا۔

”لیکن کوئے۔“ حمید بے صبری سے بولا۔

”وہی بتانے جا رہا ہوں۔“ فریدی سگار سلکاتا ہوا بولا۔ ”میرے والد صاحب کے ابا دوست کیسا گر تھے۔ وہ اکثر ہمارے ہی یہاں آکر تجربے کیا کرتے تھے۔ ان کے پاس کمی ایسے تھے جو صدھا سال سے سینہ بسمیہ منتقل ہوتے ہوئے ان تک پہنچتے تھے۔ ان کی دیکھادیکھی مجھے کاچھ کا لگ گیا۔ ان دونوں ایک شعر جو دراصل کیمیا کا نئے تھا میرے والد اور ان کے دوست درمیان موضوع بحث بنا ہوا تھا۔ چلو تمہیں وہ شعر بھی سناؤں۔“

گفت از شیخ مغرب، زریخ و سرب و زینت گوگرد و طوطا را

درخون تیرہ ترکن اور اہنار درکن، عجائت مکن خدارا

ہاں تو جناب اس نئے میں ”خون تیرہ“ کا معنہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ انجد کے قاعدے۔

بھی زور مارا گیا لیکن لا حاصل! آخر سوچا گیا کہ کوئے کے خون سے شروعات کی جائے۔ پھر ہر

جاندار شے کے خون کا تجربہ کیا گیا جو کامیاب نہ ہو سکا۔ کوئے کے خون والا تجربہ ایک حد نہیں جاندار شے کے خون کا تجربہ کیا گیا تو وہ دھمات خاک کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔

”ارے....!“ حمید کامنہ حرمت سے کھل گیا۔

فریدی پھر خاموش ہو گیا تھا۔ حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خون تیرہ کا معنہ حل ہو جائے تو سونا بن جائے گا۔“

”قطیعی....!“

”اور یہ زینت وغیرہ کیا ہے۔“

65

لہ نمبر 9

”دوسری بات یہ کہ تمہیں کوؤں کا صحیح مصرف معلوم کرنا ہے۔“

”مگر.... وہ تو ابھی آپ بتاہی پچھے ہیں۔“ ”حمد بولا۔

”ضروری نہیں کہ میرا خیال درست ہی ہو۔“

”تمہری دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر یہ لوگ خود کو شہرت کیوں دے رہے ہیں۔ یہ کام نہایت خاموشی سے بھی ہو سکتا تھا۔“

”انہوں نے بڑا نفیاتی طریقہ اختیار کیا۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”چھپ کر کام کرنے لئے عموماً قانون سے ڈرتے ہی رہتے ہیں اور یہی خوف بعض اوقات ان سے اسی غلطیاں کروادیتا ہے کہ ان کی گردن قانون کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ اس کے برخلاف کسی قسم کا ہنگامہ برپا کر کے کام کرنے والوں کو بڑی تقویت رہتی ہے اور یہ تقویت ان میں خود اعتادی پیدا کر کے انہیں غلطیوں سے بچاتی ہے۔“

”لیکن انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔“

”میں یہ تو نہیں کہتا کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ انہوں نے یہی ایک زبردست غلطی کی کہ تمہیں شراب پلا کر تم سے کوئی بات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اور یہ بھی اندازہ نہ لگا سکے کہ حقیقتاً تمہیں نشہ ہو گیا ہے یا صرف ترک ہے۔“

”پھر....!“

”میرے کہنے کا مطلب دراصل یہ تھا.....!“

”دفعہ اٹیلی فون کی گھنٹی بجئے گئی۔ فریدی نے رسیور اٹھالا۔“

”نگٹو کرتے وقت اس کے ماتھے پر سلوٹس ابھر آئیں اور پھر وہ رسیور رکھ کر حمید کی طرف مڑا۔

”سماں نے جگدیش تھا! اُس گاڑی کا پتہ لگ گیا جس میں تم نیا گراہوٹ لٹک گئے تھے۔ ہوشی کی فرائس کے دینیر نے اسے شناخت کر لیا ہے.... اور کوچان گاڑی میں مردہ پیا گیا ہے۔ اُس کی داہمی کٹی پر گولی گئی ہے۔“

”کرے...!“

”ہاا... اور اب تمہارا نیا گرہ ہوٹ واپس جانا درست نہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں ایک

ہے۔ پھر وہی کہوں گا کہ اصلیت نہیں بدلتی صرف رنگ تبدیل ہوتا ہے۔“

”میں کوشش کروں گا۔“ ”حمید نے کہا۔

”اور اُسی دن میرے ہی ہاتھوں جمل میں نظر آؤ گے۔“

”کوئی آسان سانس نہ بتائیے۔“

”ختم کر دیے قصہ اور کام کی بات کرو۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”میں خون تیرہ کا معہ ضرور حل کروں گا۔“

”اور متیج کے طور پر خوب تیرہ ہو جاؤ گے۔“

”یعنی.... مجھے فارسی کم آتی ہے۔“

”مکالا سور....!“

”اوہ تو کالے سور کا خون!“ حمید جلدی سے بولا۔

”بکومت اوقت کم ہے۔“ فریدی نے جھنگلا کر کہا۔

”حمد تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا ہا پھر بولا۔“

”شہزادے والی بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔“

”وہ بات....!“ فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ”جہاں تک میں سمجھا ہوں وہ بچارا

دھوکے ہی میں ماری گئی۔ خر اس مسئلے کو فی الحال ملتوی رکھوا تو تم تک دس بجے آن لوگوں

رہے ہو۔“

”خیال تو یہی ہے۔“

”لیکن اب تم مجھ سے نہیں ملو گے۔“ فریدی نے کہا۔

”میا....؟“

”انہیں تمہاری طرف سے پورا پورا اٹھیاں ہوتا چاہئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں خو

ضروری سمجھوں گا تمہیں کہیں نہ کہیں مل جاؤں گا۔“

”آخر آپ کی اسکیم کیا ہے۔“

”میں انہیں اس وقت پکڑتا چاہتا ہوں جب وہ ٹرین میں ڈاکہ مار رہے ہوں۔“

”اوہ....!“

دوسرے قتل میں بھی پہنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اب بھی تر اصلیت سے واقع نہیں۔”

شکاری کی چال

بارہ بجے رات کو حمید آر لپچو میں ایک کمرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ آر لپچو بھر کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں سے تھا۔

فریدی نے اس کا پرانا میک اپ بگاؤ کر اسے دوسرا بیتل میں تبدیل کر دیا تھا اور یہ شکر اتنی غیر دلچسپ اور معمولی تھی کہ وہ بھی آدمیوں کی اس بے پناہ بھیڑ میں آگئا تھا، جو دیکھنے پر کوئی اثر قائم کے بغیر گزر جاتی ہے۔

دوسرے دن صبح وہ ایک ٹیکسی کر کے اس کارخانے کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کوڈل پروں سے ایک حیرت انگیز چیز بانی جانے والی تھی جو بیک وقت کافی بھی تھی اور کپڑا بھی کارخانے کی عمارت جس کے بعض حصے ابھی زیر تعمیر ہی تھے۔ دولت گنج کے اس ویران علا میں واقع تھی جہاں گریبوں کے موسم میں شہر کے بعض مہکیدار اینٹوں کے پزادے لگایا کر تھے۔ کارخانے میں داخلہ فیجر کی اجازت سے ہوتا تھا اس لئے ابھی تک صرف شہر کے اشخاص ہی اندر تک پہنچ سکتے تھے لیکن اسکو لوں اور کالجوں کے طبلاء کو اجازت مل جاتی تھی مگر کے لئے بھی انہیں اپنے پرنسپل یا ہمیڈ ماشر کے سفارش نامے لانے پڑتے تھے۔

حمدیہ چھانک پر روکا گیا۔ جزل فیجر کا آفس چہار دیواری کے اندر تھا اس نے چوکیدار کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں جزل فیجر سے ملا جاتا ہے لیکن نے اندر رکھ جانے دیا۔

”اچھا تو پھر میرا نام ہی جزل فیجر تک پہنچاؤ۔“ اس نے کہا۔ چوکیدار اس پر تیار ہو گیا۔ حمید نے جیب سے کانڈہ کا ایک نکونا کال کر اس پر ”جاہر“ لکھا چوکیدار کو دنے کر اطمینان سے پاپ میں تباکو بھرنے لگا۔ چوکیدار نے وہ پرچہ ایک دوسرے آدی کو دے دیا۔

تموڑی دیر بعد حمید طلب کر لیا گیا۔ جزل فیجر کے کمرے میں وہ چاروں شکاری موجود تھے۔ اکے علاوہ ایک آدی اور بھی تھا، شاید اس سازش میں جزل فیجر کاروائی ادا کر رہا تھا۔ چاروں آری حمید کو حیرت سے دیکھنے لگے کیونکہ یہ وہ تو نہیں تھا جس سے انہوں نے پچھلی رات نیا گرد ہنگاموں کی تھی۔

”میں وہی ہوں۔“ حمید آن کی طرف قدرے جھک کر بولا۔ ”اور تمہیں یہ بتانے کے لئے آیا ہے کہ کوچوان والے والے سے ہم لوگ قطعی مر عوب نہیں ہوئے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ سردار صدر نے اپنے چہرے پر اکھن کے آثار پیدا کر کے کہا۔ ”تم نے اسے اسی لئے تو بارہ لاہا ہے کہ پولیس میرے خلاف اپنی جدوجہد کچھ اور تیز کر دے۔“ ”یہ غلط ہے! ہم نے اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”غیر چھوڑو...!“ حمید لا پرواہی سے بولا۔ ”میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔“ ”سترہ ڈاؤن والی بات حقیقتاً غلط تھی۔“ سردار صدر نے کہا۔

”بہت دیر میں سمجھے۔“ حمید خوات امیز بھی کے ساتھ بولا۔ ”شاید.... سراغ رسانوں کو اس کا علم ہو گیا ہے۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا...!“ حمید نے کہا۔ ”کیوں....؟“

”جہاں تک میرے علم میں ہے! ابھی تک کوئی اس کے متعلق سوچ ہی نہیں لکا۔“

”لیکن....!“ سردار صدر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”خبرات بار بار پچھلے ڈاکے کا حوالہ دے ہے میں۔“

”فے رہے ہوں گے۔“ حمید نے کہا۔ ”لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سونا بدلتا یا گا تھا۔“

تموڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید خود ہی بولا۔

”تم نے اس لڑکی کو مار کر غلٹی کی۔ تجھے ذر ہے کہ کہیں اسی قتل کے سلسلے میں یہاں کا ترکی دماغ تھا رے راستے پر نہ لگ جائے۔“

”کون....؟“

مکے ہاتھ پر پھول گئے۔ ایک سب انپکٹر اور دو پولیس کا نشیل شاکداں کا انتظار کر رہے تھے۔
جید اپنا نچلا ہوت دانتوں میں دبا کر سردار صدر کو گھورنے لگا اور صدر زہریلی نہیں کے
تمہ بولا۔

”ہاں تواب تم ان شریف آدمیوں سے معاملہ طے کرلو۔“

”بہتر ہے۔“ جید نے لاپرواٹی کی نہایت شاندار ایکٹنگ کی۔ ”لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں!
ملوم نہیں اب تم کون کی چال چلنے والے ہو میں پھر کہتا ہوں کہ ہم میں کوئی باعزت سمجھو
جانا چاہئے.... نہیں نہیں مجھے اپنا سر ماہیہ چاہئے۔“

”عن لیا آپ نے۔“ سردار صدر نے سب انپکٹر کی طرف مڑ کر کہا۔

”آپ حرast میں لئے جاتے ہیں۔“ سب انپکٹر نے جید سے کہا۔

”کیوں....؟ کس لئے؟“

”آپ ان لوگوں پر چندے بے نیاد الزامات لگا کر انہیں بلک میل کرنا چاہتے ہیں۔“

جید سردار صدر کی طرف دیکھ کر مسکرا لیا اور آہستہ سے بولا۔

”اور تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ میں نے ہی تمہارے تین آدمیوں کے روپے چھینے ختح
رمی نے ہی اس کو چوان کو قتل کیا ہے۔“

”کیا....؟“ سب انپکٹر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ سردار صدر کے چہرے پر بھی سر ایسکی
اری ہو گئی تھی۔ اس نے شاندار سب اور اس سے متعلق نہیں بتایا تھا۔

”جی ہاں۔“ دفعتاً جید وہ انکی آواز میں برس۔ ان کم بختوں نے مجھے بر باد کر دیا۔ اپنے اس
بے شک کام میں میرازو پیپر لگو کا کر میرا دیوالہ نکال دیا اور اب میں جو اس پر احتجاج کرتا ہوں تو مجھے
روح طرح کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ ابھی کل ہی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں پھنسوادوں گا۔
ل ان کے آدمیوں کو کسی نے لوٹ لیا اور انہوں نے میرے گرد جال بن دیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی
بلہ تمہیں بھجوائیں گے۔“

”کیوں....؟“ سب انپکٹر صدر کی طرف مڑا۔

”جھوٹ سر امر جھوٹ۔ ہم نے یہ کبھی نہیں کہا۔“

”بہر حال آپ کے اس جملے کی بے سانگھی بیہی بتائی ہے کہ یہ حقیقتاً آپ کے حصے دار ہیں۔“

”وہی فریدی! جس کی کھال اوہیز نے کے لئے میں عرصے سے بے تاب ہوں۔ جسمی
اس کا علم نہ ہو کہ سرجنت جید کو اسی نے غائب کر دیا ہے اور اب اس قتل کے معاملے میں ا
ہے۔ تم نے ایک دوسرا مغلط اور بھی کی ہے۔ اُسے شاہد ہی بنا رہے دینا تھا۔ اس کی طرز
تم نے سارہ کو جو خط لکھے تھے ان میں جید کے دستخطہ کرنے چاہیں تھے۔ تمہیں شاید یہ نہ
ہو کہ فریدی کے ہاتھ سارہ کی ڈائری لگ گئی ہے اور اس سے اُس نے یہ اعداہ لکایا ہے کہ
اُسے بجیشت حید جانتی ہی نہیں تھی۔“

”یار تم بڑے کام کے آدمی ہو۔“ سردار صدر حیرت سے بولا۔

”یہی نہیں میرے دوست امیں یہ بھی جانتا ہوں کہ دلاور گرف والا سوتا کب اور کر
سے آئے گا۔“

”تم بھی کچھ جانتے ہو۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“ سردار صدر نہیں کر بولا۔

”لیکن اگر تم کوؤں کے پروں کا استعمال ثابت نہ کر سکے تو....!“ جید نے سنجیدگی سے پا
سردار صدر پھر نہیں پڑا۔

”شاید اب تم اس پر بھی کچھ روشنی ڈالو گے۔“ اُس نے کہا۔

”نہیں.... کیونکہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا البتہ اس پر یقین ضرور ہے کہ
کے پروں سے کبھی کچھ نہ بنا سکو گے۔“

”تم ابھی ہماری سختیک سے واقف نہیں ہو اسی لئے ایسا کہہ رہے ہو۔“ صدر سنجیدگی
بول۔ ”آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔“

جید اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ اس عمارت میں آئے جہاں مشینوں کا شور گون بھرا تھا۔

”یہ دیکھو....!“ سردار صدر نے دھنکے ہوئے پروں کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا۔

”ٹھیک ہے! بہت صفائی سے دھنکے گئے ہیں۔“ جید نے سیاہ رنگ کا تھوڑا سا سفوف لیکر

میں ملتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اسے ایسے ریشوں میں کس طرح تبدیل کرو گے جن سے تار بتایا جائے
ایسا ممکن ہے۔“ سردار صدر بولا۔ ”ہم نے ایک ایسی چیز دریافت کر لی ہے جس کے ذا
سے ریشوں میں تبدیل کیا جائے گا۔“

سردار صدر اسے باتوں میں لگائے ایک دوسرے کمرے میں لایا۔ دروازے میں قدم رکھ

سب انپکٹر مسکرا کر بولا۔

”نن.... نہیں.... غلط ہے۔“ سردار صدر ہکلا کر رہ گیا۔

”کیا آپ مجھے نہیں پہچانتے۔“ حید نے سب انپکٹر سے کہا۔
”جی نہیں۔“

”تار جام والے سیٹھ دھنی رام کا نام تو سائی ہو گا۔“

”جی ہاں.... جی ہاں۔“

”میں وہی ہوں۔“

”اوہ....!“

”غلط.... بالکل کوئاں۔“ سردار غصباں کا آواز میں چینا۔ اس نے بھیں بدل رکھا ہے۔

”چلنے یک نہ شد دو شد۔“ حید ہنس کر بولا۔ ”شاید تمہارا دماغ ہی خراب ہو گیا ہے۔ دا میاں تمہیں میر اسرمایہ واپس کرنا پڑے گا۔“

”میک اپ ہے۔“ سردار صدر مکاتاں کر ہوا میں لہرنا ہوا بولا۔

”چلنے صاحب اس کا بھی اطمینان کر لیجئ۔“ حید نے سب انپکٹر سے کہا۔ ”منہڈ ہلوائیے میرا

”نہیں صاحب۔“ سب انپکٹر جلا کر بولا۔ ”آپ ان لوگوں کے خلاف با قاعدہ رپورٹ بیکھجے۔ خواہ تو نہ میرا اتنا وقت بر باد ہوں۔“

”ٹھہریے۔“ حید نے جلدی سے کہا۔ ”میں بھی چلتا ہوں آپ کے ساتھ ورنہ یہ لوگ مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔“

”یہ بات ہے! اچھار پورٹ میں یہ بھی لکھوا یے گا۔ چلنے میرے ساتھ۔“

”ٹھہریے۔“ صدر گھبر اکر بولا۔ ”سیٹھ دھنی رام تھی.... مجھے آپ کے ہمراہ بت منتظر ہیں۔“
”ویکھا آپ نے۔“ حید ہنس کر بولا۔

”اگر آپ نے سمجھوئے کہ بھی لیا تو پولیس ان لوگوں پر دھوکہ دی کے سلسلے میں مقدمہ ضرور چلائے گی۔“

”انپکٹر صاحب.... ذرا ٹھہریے۔“ سردار صدر لجاجت سے بولا۔

”پھر ہرے رنگ کے کاغذات کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی، جو صدر کے جیب۔ ملدا

رب انپکٹر کی جیب میں غروب ہو گئی۔

”خیر....!“ سب انپکٹر ہنس کر بولا۔ ”آپ دونوں شریف آدمی ہیں بات بڑھانے سے کیا فائدہ۔“

پولیس والے چلنے گئے اس دار صدر اپنی پیشانی سے پیشے پوچھ رہا تھا۔

”تو ہے کے پھنے دیکھے ہیں تم نے۔“ حید ہنس کر بولا۔

”تم حقیقتاً یہاں سے زندہ نہیں جاسکتے۔“ صدر جیچ کر بولا۔

”اُرے تم نے پھر وہی شروع کر دیا۔“

وہ غصباں نے چار آدمی حید پر ٹوٹ پڑے۔ اُس نے جدوجہد کرنی چاہی لیکن سردار صدر نے اور نکال لیا۔

”چلو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔“ حید اطمینان سے بولا۔ اُسے یقین تھا کہ فریدی اُس کی طرف بے خبر نہیں ہو گا۔

”میرے پانچ ساتھی۔“

”اُنہیں بھی جہنم رسید کر دوں گا۔“ صدر دانت پیش کر بولا۔

”خیر دیکھا جائے گا۔“

”گرم پانی اور تولیہ لاو۔“ صدر نے اپنے ایک آدمی سے کہا۔ پھر حید سے بولا۔ ”میں تمہاری ملی صورت دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”وہ تو تم بڑی در سے دیکھ رہے ہو۔“

گرم پانی فوراً ہی آگیل۔ شاید وہاں جن کی شکنی سے لایا گیا تھا۔

سردار صدر کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سارا اپنی ختم ہو گیا لیکن حید کے چہرے میں کوئی فرق واقع نہ ہوا۔ حید پہلے ہی سے مطمئن تھا۔ فریدی نے اُس میک اپ کے سلسلے میں اپنا مخصوص ریکد اختیار کیا تھا۔ اس میک اپ کو ایسو نیا کے علاوہ دنیا کی کوئی دوسری چیز ختم نہیں کر سکتی تھی۔

”تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟“ سردار صدر نے جھنجلا کر پوچھا۔

”جہاں کہیں بھی ہوں گے چند گھنٹوں کے اندر اندر تم سے آبھریں گے۔“ حید بولا۔ ”اور بس میں تم سے کسی قسم کا سمجھوئے کرنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ تم ناقابلِ اعتماد ہو۔ تم نے لیں کو تو اپنی اسکیم میں شریک کر لیا تھا لیکن یہ نہ سوچا کہ میں بھی کچھ کر سکتا تھا۔“

”اگر آپ کی کاغذات کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی، جو صدر کے جیب۔ ملدا

"لیکا کر سکتے تھے؟"

"تمہارا راز فاش کر سکتا تھا۔"

"لیکن ثبوت نہ مہیا کر سکتے۔" سردار صدر نے قہقہہ لگایا۔

"لیکن یہ تو ثابت ہی کر سکتا تھا کہ تم سردار صدر ہو۔"

"خیر وہ موقع تو تمہارے ہاتھ سے نکل ہی گیا۔" سردار صدر نے کہا۔

"میں اپنے معاملات خود ہی طے کرنے کا عادی ہوں۔"

"ابھی طے ہوا جاتا ہے تمہارا معاملہ بھی..... مگر غمیں... ابھی تو وہ پائچ بھی ہاتی ہیں۔

حیدر بدستور مسکرا تارہ۔

"دلاور گروالا سونا کب آرہا ہے۔" سردار صدر نے دفعٹا حیدر کی گردان دیا کر کہا۔

اسے دو آدمیوں نے نبڑی طرح جکڑ رکھا تھا۔ اس لئے وہ جدو جہد نہ کر سکا۔ صدر کی گر تھک ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی سی دیر تک وہ برداشت کرتا رہا۔ لیکن پھر اس کی کنٹیاں سن لگیں اور آنکھوں کے سامنے گمراہ ایک دھواں لہرانے لگا۔ دھوئیں کے لہریے تھے یہ جہاں چلے گئے اور پھر مکمل تاریکی.... گمراہ اندر ہمرا۔

اور پھر دوبارہ ہوش آنے پر ایک بہت ہی نیز قسم کی روشنی کے احساس سے اس کی آؤ دکھنے لگیں۔ چھت سے لگا ہوا ایک بہت بڑا ملب پھا چو نہ پیدا کرنے والی روشنی پھیلا رہا تھا۔

تحوڑی دیر تک وہ جیرت سے چاروں طرف دیکھتا رہا اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ بہت بڑے صندوق میں بند ہو۔ کمرہ چوکور تھا اور شاید دیواروں کی اوچچائی بھی اتنی ہی رہی ہو فرش کی لباسی یا چوڑائی تھی۔ اس میں کوئی دروازہ تھا اور نہ کھڑکی تھی کہ دیواروں میں کہیں جوڑ بھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ البتہ چھت کے قریب ہر دیوار میں ایک ایک روشنی دن تھیں ہوا صاف کرنے والے پنچھے گردش کر رہے تھے اگر حیدر کو وہ پنچھے نہ دکھائی دیتے تو وہ سمجھتا کہ وہ کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے اور اب تکیرین سوال و جواب کیلئے آنے والی ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دفعٹا اس کے منہ سے جیرت کی جیج نکل گئی۔

"سوٹا.....!" وہ بے ساختہ بولا اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

انتاسونا شاید زندگی میں پہلی بار دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ صندوق نما کرے کے ایک گوشے

ہونے کا بہت بڑا ذمہ جگہ رکھتا تھا۔

پھر اسے اور بھی چیزوں نظر آئیں اور ان چیزوں نے اسے کیمیا کا وہ نسخہ یاد دلا دیا جس پر اس نے اور فریدی نے کافی دیر تک بحث کی تھی۔

سیے کی بڑی بڑی سلا خیس ہڑتاں۔ گندھک اور طوطیا کے ڈھیر۔ پھر کی بڑی بڑی بولیں جن میں پارہ گمراہ ہوا تھا۔

حیدر اپنی موجودہ حالت بھول کر فریدی کے اندازے پر عش عش کرنے لگا۔ حقیقتاً وہ ابھی تک خود کو اس کیس کا بہرہ رکھتا تھا۔ مگر اس وقت وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر فریدی کی ہے یہ معلومات کا ذخیرہ آڑے نہ آتا تو وہ بڑی مصیبتوں میں پھنس گیا تھا۔

شروع سے اب تک کے واقعات تیزی سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے مگر ایک فلاں... پیچاری سارہ... اور وہ شہزادے ذاتی بات... وہ پیچاری مفت میں ماری گئی۔ مگر کون جانے وہ کچھ جان کی ساتھی ہی رہی ہو اور انہوں نے کسی اور مصلحت کی بنا پر اسے قتل کر دیا ہو۔ بہر حال غیر شوری طور پر اس کا ذہن اس خیال سے گریز کر رہا تھا کہ وہ اسی کی بدولت ماری گئی۔

متحرک خزانہ

تحوڑی دیر بعد حیدر اس صندوق نما کرنے کی دیواریں ٹوٹتا پھر رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں کس طرح لایا گیا۔ چاروں دیواریں سپاٹ اور چکنی پڑی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نہیں مرتا پڑے گا۔ اسے گھٹن ہونے لگی لیکن وہ اپنے دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی حقیقتی الامکان کو شش کر رہا تھا۔ گھٹن کا احساس تازہ ہوا کی کمی پر نہیں تھا۔ شے جانے کس طرح ان پنکھوں نے اس کرنے کی فضائی کا اس قابل بنا رکھتا تھا کہ اس میں آدمی زندہ رہ سکے۔ ویسے بظاہر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی تھی جسے تازہ ہوا کی گزر کا ذریعہ سمجھا جا سکتا۔

اس نے آنکھ بند کر کے یہ محسوس کرنے کی کوشش کی کہ اس کے گرد بیکار و سعین ہیں اور بڑ پر نیلا آسان پھیلا ہوا ہے۔ وہ دراصل اس احساس سے پچھا چھڑانا چاہتا تھا کہ وہ اسی

دیواروں میں مقید ہے جن میں کوئی دروازہ نہیں ہے کیونکہ بھی احساس ساری گھنٹن کا باعث تھا
گھنٹن اس پر غشی بھی طاری کر سکتی تھی اور موت کا ذریعہ بھی بن سکتی تھی۔

تحوڑی دیر بعد وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ ایک بہت بڑے راز کی تھے تھک گیا ہے۔ سو
ڈھیر اُسے بے وقت معلوم ہونے لگا تو یہ بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کا انعام کیا ہو گا۔ اُ
کارخانے میں داخل ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے تھے کبھی کبھی وہ گھری کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ وہ
چکے تھے اور اُسے اپنے جسم میں نہایت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ نہ جانے اُس نے کتنی دیر
پاپ نہیں پیا تھا لیکن تمباکو نوشی کی خواہ بھی جیسے مرگی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ تازہ دم ہوتا ہی نہیں چاہتا تھا اُسے اپنے ذہن کی او گھنٹی ہوئی
کیفیت اس وقت بڑی غیمت معلوم ہوتی تھی اور وہ تصوریت کے کتب خیال کے فلسفیوں
طرح اس کیفیت کو ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ تمباکو کے
تین کش اس کیفیت کا خاتمہ کر دیتے اور وہ پھر سے اُسی گھنٹن کا شکار ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ ا
غنو دیگری طاری ہوتی گئی اور وہ فرش پر ایک طرف لڑک گیا۔

پھر شاید وہ کسی قسم کا شور ہی تو تھا جس سے اُس کی نیند اچٹ گئی تھی وہ اچل کر گھر اہو
لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر پلکرا کر گر پڑا۔ صندوق فنا کرہاں رہا تھا۔ اُس کے فرش کے
اُسے کچھ ایسی گھر گھڑائیں محسوس ہوتی تھیں جبھی ریل کے پہیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔
قمقہ جو چھٹ میں روشن تھا اچانک بجھ گیا۔ حید سمجھا شام کی زندگی ہی کا چراغ گل ہو
گھنٹن کے لئے وہ دیواریں ہی کیا کم تھیں اُس پر سے اندر ہی۔

اور پھر وہ اپنی آوازوں پر قابو نہ پا کا جو هر سڑیا کے کسی مرض کی چیزوں سے مشابہ تھیں۔
کرہہ تیزی سے اپر کی طرف اندر رہا تھا۔ پھر دفتاؤ سے ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی چھٹ
ٹھووس چیز سے نکرانی ہو۔ آوازیں کھنم گئیں اور بلب بلب رہنے والے روشن ہو گیا۔ کرہہ بھی غیر متحرک تھا
پھر سامنے کی دیوار تیز ہوتی معلوم ہوئی اور آخر کار ایک چھ فٹ اونچے اور تین فٹ چوڑ
دروازے سے تاروں بھرا آسمان دکھائی دیا اور ساتھ ہی عجیب قسم کا شور بھی سنائی دیا۔ حید
بے ساختہ جست لگائی اور باہر نکل آیا۔ باہر بارود کی بوچھلی ہوئی تھی اور قریب ہی کہیں
ہو رہے تھے۔ حید نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا جس میں اب بھی بلب روشن تھا۔ پھر

نے چاروں طرف نظر شد ووڑا کیں۔ وہ ایک ایسی جگہ پر کھڑا ہوا تھا جہاں چاروں طرف اوچی اور جگی
بجا رہاں تھیں اور یہ جگہ کافی طویل و عریض تھی۔ اُس نے محسوس کیا کہ پہاں کا فرش پختہ ہے۔
بجا اس پختہ فرش کے گرد جگلی اور خود رہ جھاڑیوں کا مطلب؟ حید کے ذہن میں سوال تیزی
کے موجات تھیں نیماں اس میں اتنی تباہ نہیں تھی کہ اس پر مزید غور کرتا۔
وہ پھر ریل کے پہیوں کی سی گھر گھڑا ہٹ سنائی دی اور وہ کرہہ زمین میں دھنے لگا۔ حید
اچل کر پچھے ہٹ گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آنکھیں چھاڑ کر اُس پختہ فرش کی طرف دیکھ رہا تھا اور اُسے حرمت
ہوتی تھی کہ آخر وہ کرہہ کہاں گیا۔ فرش بالکل برابر تھا۔ حید نے گھر اکار اپنی ران میں زور سے
چکلی لی اور پھر اُسے یقین آئیا کہ وہ اب تک خواب نہیں دیکھا رہا تھا۔ اُس نے کتنی ہی دیا
سلایاں پھونک ڈالیں۔ لیکن فرش میں کہیں کوئی درازی ایار خڑہ نہیں دکھائی دیا اور ساتھ ہی یہ بات
بھی اُس پر واضح ہو گئی کہ وہ کسی نہیں کو روت میں کھڑا ہے۔

گولیوں کی آوازیں بند ہو گئی تھیں لیکن اب بھی کبھی کبھی کسی کی چیز یا کرہہ سنائی دے جاتی
تھی۔ حید نہیں کو روت سے نکل آیا اور یہ دیکھ کر اُسے حرمت نہیں ہوئی کہ وہ اُس کا رخانے ہی کی
چہار دیواری میں ہے۔ چاروں طرف اندر ہیرا پھیلا ہوا تھا کہ اُس اندر ہیرے میں آہستہ آہستہ رینگتا
ہوا چہار دیواری کے چھانک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دفعٹا پھر دھینگا مشتی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں سنائی
دیے گئیں۔ ایک آدھ فائر بھی ہوئے۔

اب حید کو فریڈی کا خیال آیا۔ وہ اُس کی طرف سے غافل تونہ رہا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس
نے حملہ ہی کر دیا ہو۔ گھر پھر خیال آیا کہ فریڈی واپر ٹھوٹ اکٹھا کئے بغیر اس قسم کا کوئی اقدام نہیں
کر سکا۔ وہ اُس کے غائب ہو جانے کے سلسلے میں علاشی تو لے سکتا تھا لیکن حملہ کرنے کی وجہ
نہیں ہو سکتی۔

حید عمارت کے سرے پر پہنچ کر مڑھی رہا تھا کہ اُس نے کسی کو تیزی سے دوڑ کر اپنی طرد
آئتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ اچھل کر دیوار سے جال گا۔ دوڑنے والا اُس کے
گزرا گیا تھا۔ پھر اُس نے ایک دوسرے ہی آدمی کو بھی اسی طرف آتے دیکھا۔ وہ بھی دوڑ ہی رہا تھا۔
حید چونکہ پڑا۔ اس نے والے کی شکل نہیں دکھائی دی تھی لیکن اُس کے دوڑ نے کا انداز بتا

ان کم بخوبی نے میرا دیوالہ نکال دیا۔ میں مر جاؤں گا۔ ” حمید بدھوں ہو کر زمین پر بیٹھا ہوا بولا۔ ” میرا ہمارث فلی ہو رہا ہے اسے میں مر ل۔ ”

اور پھر اس نے اسی آوازیں کافی شروع کر دیں جیسے بھوت پھوٹ کر روپڑے گا۔ ” جھونٹا ہے... جھونٹا ہے... ” صدر اپنی رانیں پیٹ کر چینا۔ ” یہ جابر کاشگرد ہے... جابر کا ” اسے میں مر ا... میرا روپیہ... ! ” حمید نے پھر ہاک نکالی۔ ” مکار... سور... کینے... ! ” سردار صدر چالیا۔

ہائے میں نے اسی وقت پولیس کو اطلاع کیوں نہ دی۔ ” حمید تقریباً یار و کربولا۔ ” ” کب؟ کیا بات تھی؟ ” ” ذی ایس۔ پی نے پوچھا۔ ” ” یہ سالے... ! ” حمید نے کہا اور شاید پھر وہ دو چار گالیاں بھی کہنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ذی ایس۔ پی نے اسے ڈانٹ دیا۔

” سید ہی طرح بتاؤ۔ ” ” انہوں نے نہ جانے کیوں ایک ایک گلوانٹیں لوٹیا کو ایک پولیس والے کے پیچے لگادیا تھا اور پھر وہ مار دیا گئی۔ ”

” بگوں ہے... ! ” سردار صدر چینا۔ ” تم تھے کہاں۔ ” فریدی نے حمید سے پوچھا۔ ”

” اسے کیا بتاؤ... وہنی رام نے وہ صن دیکھا ہے... بس رے بس۔ ” ” صاف صاف بتاؤ۔ ”

” ان لوگوں میں مجھے ایک تھہ خانے میں بند کر کھا جس میں سونا پتاڑا ہے۔ ” سردار صدر کے چہرے پر ہوایاں اڑنے لگیں۔ ” کہاں ہے... وہ تھہ خانہ... ! ”

” آب تو پتے نہیں کہاں ہے۔ دیے کچھ دیر قل نیس کورٹ پر تھا۔ ” ” ان پر سردار صدر نے ایک قبہ کیا اور بولا۔ ” آپ لوگ ایک پاگل آدمی کے چکر میں پڑے ہوئے ہیں۔ نیس کورٹ پر تھہ خانہ... ... چے خوب۔ ”

” ہائے... میرا... روپیہ... میں مر ل۔ ” حمید نے پھر ہاک نکالی۔ ”

رہا تھا کہ وہ فریدی ہے۔ اس کی یہ دوڑ بھی نوعیت کے اعتبار سے کم حرث انگیز نہیں تھی۔ فرنے تقریباً چھ ماہ تک اس طرح دوڑنے کی مشق کی تھی۔ دوڑتے وقت وہ اپنے پورے جسم ایسے زاویوں میں رکھتا تھا کہ ابھی مشاق حرم کا کوئی نشانہ باز بھی اسے اس حالت میں گولی نہیں سکتا تھا۔ مشق کے ابتدائی دور میں حمید اس پر غلیل سے چھوٹی چھوٹی ٹکریاں چلایا کرتا تھا ایک وقت بھی آجاب فریدی نے اس حالت میں اُسے روپا لور چلانے پر مجبور کیا۔

حمد نے سوچا کہ اسے اپنی طرف متوجہ کرے لیکن قل اس کے کہ وہ سنبھالتا فریدی ہو چکا تھا۔ بہر حال اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ پولیس کپڑا نہیں موجود ہے۔ ” وہ پھر آہستہ آہستہ چالنک کی طرف بڑھنے لگا۔ دفعٹا کسی طرف سے دو آدمی اس پر پڑے اور وہ قلطی بے بس ہو گیا۔ پھر وہ دونوں اسے کھینچ کر روشنی میں لائے۔ حمید نے پولیس کا نشیلوں کے نرنے میں پایا۔ ”

انہوں نے تقریباً پدرہ میں آدمیوں کو ہھنڑیاں پہننا رکھی تھیں۔ انپکڑ جگدیش ذی ایس۔ پی تھی بھی موجود تھے۔ حمید کو وہ سب انپکڑ بھی دیکھا دیا جسے سردار صدر نے کے لئے بلایا تھا۔

” سیشہ دھنی رام... ! ” وہ جیچ کر حمید کی طرف بڑھا۔ ” اودہ... ! ” ذی ایس۔ پی تھی اس کی طرف مڑا۔ ”

حمدیکچ کہنے تھی والا تھا کہ اسے فریدی دیکھا دیا جو سردار صدر کو بلوں سے پکڑ کر کھینچ لارہا تھا۔ سردار صدر کی پیشانی سے خون بہرہ رہا تھا اور وہ اس طرح اچھل اچھل کر چل رہا تھا اس کا مجھے یا کوہا اتر گیا تھا۔ فریدی نے اسے ایک کرسی میں وکھل دیا۔ ”

” سیشہ دھنی رام تو مل گئے۔ ” جگدیش نے حمید کی طرف اشارہ کیا۔ ” فریدی نے اس کی طرف دھیان دیئے بغیر سردار صدر سے گرج کر پوچھا۔ ” سر جنٹ کہاں ہے؟ ”

” میں کیا جانوں امیں نہیں جانتا۔ ” ” میں جانتا تھا۔ ... میں جانتا تھا۔ ” حمید بے اختیار جیچ پڑا۔ ” کیا جانتے تھے؟ ” فریدی اس کی طرف تیزی سے مڑا۔ ”

وہ رات حید کو بھی مجرموں کے ساتھ عی خوالات میں برس کرنی پڑی۔ سردار صدر اور ان کے ساتھیوں کو کڑی نگرانی میں رکھا گیا تھا حالانکہ ان پر لگائے ہوئے الزامات میں سے ایک کامی شوت بھی نہیں پہنچا تھا لیکن سردار صدر کے یاندھ لئے جانے کے لئے اتنا ٹھاکر دہاکی۔ مجرم تھا جس کو اب تک مردہ تصور کیا جاتا تھا۔ رات بھر فریدی ایک ایک کر کے انہیں ہلا رہا۔۔۔۔۔ اور پھر صحیح صرف حید کو خوالات سے نکال لیا گیا۔ وہ ابھی تک سیٹھ دھنی رام عی خوالات میک اپ میں تھا۔ فریدی اُسے الگ لے گیا۔

”وہ تہہ خانے والی بات کیا چیز نہیں تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔
”قطیعی تھیک تھی۔“

”لیکن ان میں سے کسی نے بھی اُس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ البتہ تمہارا معاملہ بالک صاف ہو گیا ہے۔“

”شہزادے والی بات کیا تھی۔“ حید نے بیساختہ پوچھا۔

”پھر بتاؤں گا۔“ فریدی نے کہا۔ ”فی الحال یہ تہہ خانے والی بات صاف ہوئی چاہئے درد نہ کبھی نہ ہو۔“

”میں نے آپ کو جو کچھ بھی بتایا ہے اُس میں سر موافق نہیں۔“

”مگر وہ میں کو رٹ!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کل رات بھی دیکھا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا ان میں سے کسی نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ نقلی سوتا باتے رہے ہیں۔“ جب نہ پوچھا۔
”نہیں....؟“

”پھر میرا معاملہ کس طرح صاف ہو۔“

”انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ وہ دلاور نگر سے لائے جانے والے سونے پر ڈاکہ ڈالا چاہتے تھے اور محض اس کے متعلق صحیح اطلاع حاصل کرنے کے لئے انہوں نے سارہ کو پہنچانا تھا۔“

فریدی حید کو اُس کرنے میں لا یا جہاں ملکہ سرخ رسانی اور رسول پولیس کے آفسر بیٹھے تھے
”کہنے سیٹھ صاحب! آپ ان لوگوں کے چکر میں کیسے پھنس گئے تھے۔“ ذی۔ آئی۔ لگا۔

جید سے پوچھا۔

”جناب والا یہ سیٹھ دھنی رام نہیں ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”میں کیا میں نہیں پہنچا تھا۔“ ذی۔ آئی۔ جی منہ بنا کر بولا۔

”یہ سیٹھ دھنی رام کی نقل ہے۔ میرا سرجنٹ حید۔ اگر یہ نہ ہوتا تو ہم ان تک مشکل عی خی پنچا تھے۔“

پھر فریدی شروع سے پوری داستان دہراتا ہوا بولا۔ ”اس پہنچاۓ کو چھاننے کے لئے ان لوگوں نے براشاند ارپلان بنار کھا تھا۔ ایک رات جب یہ ہوش ذی فرانس کے رقص میں حصہ لے رہا تھا مجرموں کے دو آدمیوں نے جو اُس ایک لوگوں اُن نزس کے قریب کھڑے ہوئے تھے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ شہزادہ، بہت اچھا ناچ رہا ہے اور پھر انہوں نے بلند آواز میں اس پر اسرار شہزادے کی داستان چھیڑ دی جو عام آدمیوں کی طرح زندگی بسرا کرنے کے شوق میں اپنی ریاست سے یہاں بھاگ آیا تھا۔ سارہ نے ان کی گفتگو صاف سنی اور چونکہ وہ فطرتاً راویان پسند تھیں اس نے خود ہی حید کی طرف جکھنا شروع کر دیا۔ حید نے اُسے اپنا نام شاہد بتایا کیونکہ وہ پہلک لائف میں عموماً اپنی اصلاحیت چھاننے کے اصول پر کار بند ہے۔“

”آج ہی عادت ہے۔“ ذی۔ آئی۔ جی سرہلا کر بولا۔

”دونوں دو ہی تین دنوں میں کافی گھل مل گئے۔“ فریدی نے کہا۔ ”پھر ایک دن دو تین مجرموں سارہ سے ملے اور اُسے بتایا کہ وہ اُس کے دوست شہزادہ شاہد کی ریاست کے جاؤں ہیں اور اس سے یہ ایک دعا کی کہ وہ شہزادے کو راہ راست پر لانے میں ان کی مدد کرے، سارہ کا یقین اور بھی پختہ ہو گیا۔ ویسے اس نے حید سے کئی بار پوچھا کہ وہ اپنی شہزادگی کو پر دہ راز میں کیوں رکھنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حید اس سازش سے اگاہ نہیں تھا۔ اس نے وہ اس بات کو سارہ کا مذاق سمجھتا رہا۔ وہ لوگ برابر سارہ سے ملتے رہتے تھے۔ سارہ نے انہیں بتایا کہ وہ اس بات کا اعتراف ہی نہیں کرتا کہ وہ شہزادہ ہے اس پر انہوں نے اُس سے کہا کہ وہ کسی دن اُسے کسی ایسی جگہ لائے جہاں وہ لوگ پہلے عی خی سے موجود ہوں پھر وہ لوگ اُسی کی زبان سے کہلوادیں کہ وہ حقیقتہ شہزادہ ہے۔ اس طرح سارہ نے جہریاں کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہاں ان لوگوں نے حید کو شراب پلا کر دلاور نگر سے آئے والے سونے کے متعلق اطلاعات بھی پہنچانے کی کوشش کی۔ اتفاق سے حید نے نئے کی

لہ نمبر 9
فریدی کچھ دیر تک خیالات میں ڈوبا رہا۔ پھر اُس نے آگے بڑھ کر ایک ڈائنا مو چلا دیا جس کے ساتھ ہی کرے کی ساری مشینیں چلنے لگیں اور ان کے شور سے کان پھٹنے لگے۔ فریدی پھر کچھ دیر تک رک کر شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اپاٹک وہ حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

”اس کھڑکی سے ٹیکن کو رٹ صاف نظر آتا ہے۔ تم ذرا اُدھر کا دھیان رکھنا۔“
حمدی کی نظریں کھڑکی سے گزرا کر ٹیکن کو رٹ پر جم گئی تھیں۔ وفتادہ جنچ پڑا۔

”وہ آیا... ارے پھر غائب۔“

پھر وہ فریدی کی طرف مڑا جو ایک مشین کے پیٹے کو پکڑے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کورٹ میں لڑے ہوئے کا نشیل بھی چینچنے لگے تھے اس کی حالت تو دیکھنے کے قابل تھی جو اُس کرے کے ساتھ ہی اٹھا پلا گیا تھا اور پھر اُس کے غائب ہوتے ہی زمین کی سطح پر آگیا تھا۔

وہ دونوں دوڑتے ہوئے ٹیکن کو رٹ میں آئے۔ حمید نے جتنی چیزیں اُسی متحرک کرے میں پھیل رات کو دیکھی تھیں جوں کی توں موجود نظر آئیں۔

آفسروں کو فون کیا گیا۔

اس والقے کے آدھ گھنٹے کے بعد فریدی اُسی مشینوں والے کرے میں اپنے آفسروں کو اُس پیٹے کے متعلق بتا رہا تھا۔

”پھیل رات کو میری اور سردار صدر کی مدد بھیڑ اسی کرے میں ہوئی تھی۔ پھر میں اُسے ڈھکایا ہوا اس پیٹے تک لا یا تھا۔ اتفاقاً وہ اس پینڈل سے ٹکرایا اور پہیہ گھوم گیا۔ میں اُسے پینڈل ہی پر بائے رہا۔ کسی طرح وہ پھر میری گرفت سے نکل گیا اور پہیہ اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ اس وقت جب میں حمید سے اس کے متعلق گفتگو کر رہا تھا تو اچاک مجھے رات کی بات یاد آگئی اس وقت بھی مشین پیٹل ہی رہی تھی۔ اس کرے کی پوری مشینی کا تعلق اُسی متحرک تھا خانے سے معلوم ہوتا ہے۔“

آزاد بینک کا سارا اصلی سوتا اسی تھہ خانے سے برآمد ہوا اور کافی مقدار میں نقلی سوتا بھی ملا۔ یہ سارا ہنگامہ ختم ہو جانے کے بعد سے اب تک سرجٹ حمید کیما کے شخوں کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ خصوصاً ”خون تیرہ“ کا معہمہ تو اُس کے لئے سوہان روچ بن گیا ہے وہ روز ہی کسی نہ کسی

جموک میں انہیں غلط اطلاع دے دی۔ لیکن وہ اسے حق ہی سمجھے تھے۔ پھر اُسی رات کو انہوں سارہ کو قتل کر دیا تاکہ حمید کو مشتبہ بنا کر محکمہ سراجِ رسانی کو اُسی حادثے کے پیچھے لگا دیں آسانی سے اپنا کام کرتے رہیں۔ اُسی دوران میں آزاد بینک کے سونے کے متعلق اخبارات آگیا۔۔۔ اور میری توجہ کوڈل کے شکاریوں کی طرف مبذول ہو گئی۔“

”لیکن ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ وہ نقلی سوتا بنا کر اصلی سونے کی جگہ کھپڑتے۔“ وہی۔ آئی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اتفاق سے حمید صاحب اس تھہ خانے کی میر بھی کر آئے ہیں جہاں سونے کا ازبر دست ڈھیر تھا اور وہ ساری چیزوں بھی تھیں جن سے نقلی سوتا بنایا جاتا ہے۔“

”لیکن وہ تھہ خانہ ہے کہاں...!“

”مجھے یقین ہے کہ میں اُسے کھود نکالوں گا۔“ فریدی نے لاپرواٹی سے کہا۔

آنی دن دوپہر کو فریدی اور حمید پولیس پارٹی کے ساتھ اس کارخانے میں مزید چھان کر رہے تھے۔ سب سے پہلے وہ ٹیکن کو رٹ میں گئے۔

”سخت جیرت ہے۔“ فریدی متذکر انداز میں بولا۔ ”اگر وہ کسی مشینی نظام کے تحت حرکتا ہے تو وہ خود بخود اپر کس طرح آیا اور پھر چیجے کیسے چلا گیا۔ خیر یہ بتاؤ کہ جب اُس نے اٹھنا شروع کیا تھا تو تم کیا کر رہے تھے۔“

”زندگی سے بیزار ہو رہا تھا۔“

”اوہ نہہ! مذاق چھوڑو۔ میرا مطلب یہ ہے کہ تم سے نادانشگی میں کوئی ایسی حرکت تو ہوئی تھی جس سے مشین پیٹل پڑی ہو۔“

”میں شاید اس وقت گھری نیند سو رہا تھا۔“ حمید نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وفتادہ فریدی کچھ سوچتے سوچتے چونک پڑا۔ اُس کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح کھڑا رہا۔ پھر اُس کے قدم سے مشینوں والی عمارت کی طرف اٹھنے لگے۔

حمدی بھی اُسی کے ساتھ ہی عمارت میں داخل ہوا۔ دونوں کئی کروں سے لگتا ہوئے ہوئے ایک بڑے کرے میں آئے جہاں تاروں اور کئی قسم کی مشینوں کا جاں سا پھیا

کالی جاندار شے کا خون کبڑا تا ہے.... کالی بیلی.... کالا کتا.... کالی مرغی.... البتہ ہاتھیوں سے پہلے بھی محبت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہے۔

ایک دن ایک کلوٹی سی لڑکی کو بھی پکڑ لایا تھا لیکن بعد میں فریدی کو بتایا کہ اسے اس کا نام پتیم پتیم سامعلوم ہوا تھا اس لئے اُس نے اُسے ذبح نہیں کیا۔

تمام شد

بے گناہ مجرم

(مکمل ناول)

پیش رس

اس ناول کی کہانی اپنے پیچیدہ پلاٹ کے اعتبار سے دنیا کی چند انتہائی پُر اسرار کہانیوں میں سے ایک ہے۔ ایک شخص جو قاتل ہے مگر جو بے گناہ ہے۔ ایک عورت جس نے شوہر کو دھونا دیا! ایک عجیب و غریب گھڑیا! ایک آدمی جو گرمیوں میں پاگل ہو جاتا ہے، جس کی موچھیں، ابرزو، پلکیں، چندیا سب کچھ صاف تھی! قتل کا ایک حیرت انگیز کیس! جس میں میاں حمید بے پناہ طور پر دچپی لے رہے ہیں۔ حمید کے انوکھے لطیفے، اس کے تھیقہ آپ بھی نہ بھول سکیں گے۔ فریدی نے زیادہ پریشانی نہیں اٹھائی۔ مگر ایک منزل پر پہنچ کر وہ بھی چکرا جاتا ہے۔ ابن صفائیہ دچپ پُر اسرار کارنامہ آپ بار پڑھیں گے۔

پبلشر

دو چھینیں

پرویز اس وقت چونکا جب ششے کی دوات اس کی مٹھی میں چکنا چور ہو گئی۔ ششے کے مکڑے سنے فرش پر ڈال دیئے اور سیاہی بھرا ہوا ہاتھ میز پوش کے کونے میں پوچھنے لگا۔ آس پاس ای بھی موجود نہیں تھا، البتہ میثاں پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی "مک مک" اسے ایسی لگی جیسے کوئی دی اس کی حالت پر افسوس ظاہر کرنے کے لئے "چہ چہ" کر رہا ہو۔

پرویز چند لمحے گھڑی کو گھورتا رہا پھر اس نے میز پر سے پیچہ دیت اٹھا کر اس زور سے گھڑی پرداز کو وہ بھی جھنجھناتی ہوئی فرش پر آگری۔ راہداری میں قدموں کی آواز سنائی دی اور اس کا بوڑھانو کر رانو روازے کے سامنے پہنچ کر نٹک گیا۔

"بھاگ جاؤ۔" پرویز نے جیخ کر دوسرا بیپرویت اٹھایا۔

رانو سامنے سے ہٹ کر چند لمحے وہیں کھڑا رہا اور بیجوں کے بل چلتا ہوا دوسرا طرف تک لیا۔ وہ تین سال سے پرویز کے ساتھ تھا اور اس عرصے میں اس نے اسے ایک بار بھی ہٹنے تو کیا مگرتاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی دانست میں اس کا آقادنیا کا عجیب ترین آدمی تھا۔ دنیا کا عجیب ترین جوان، جو انتہائی خوبصورت ہونے کے باوجود بھی اپنی شخصیت کو خاک میں ملا رہا تھا، جو دولتمد ہونے کے باوجود بھی دولت کی طرف سے قلعی بے پروا تھا۔ رانو نے آج تک اس کے کسی دوست کو نہیں دیکھا تھا۔ اس سے کبھی کوئی مٹنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ اور نہ وہ خود ہی کہیں باہر جاتا تھا۔ اس کا وقت یا تو اس عمارت کے کردوں میں گزرتا یا پھر پائیں باغ میں! جب اس نے یہ کوئی خریدی تھی تو پائیں باغ کی چہار دیواری زیادہ سے زیادہ تین چار فٹ بلند رہی ہو گی، لیکن کوئی خریدنے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ چہار دیواری کافی اوچی کرادی اور

سلاخوں دار پھانک بدلو اک ایسا پھانک لگوایا جسے بند کراوینے کے بعد دوسرا طرف کی جز
دکھائی دیں۔ پڑوسیوں نے بھی اس کی اس حرکت کو حیرت کی نظروں سے دیکھا تھا۔

رانو کو اس کی ہر عادت غیر معمولی معلوم ہوتی تھی اور ہر مشغله انتہائی خوفناک، وہ
اوقات پاکیں باغیں میں جال لگا کر نئے نئے پرندے پکڑتا۔ پھر ان میں سے نزوں کو اڑادیتا یا
پرندوں کو ایسی ایسی اذیتیں دے کر مارتا کہ رانو کے رو تکھٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ ان کے پر ز
انجیں ایسی جگہ ڈال دیتا جہاں چیزوں میں بکثرت ہوتیں۔ پھر وہ گوشت کے ان لو تمہروں کی؛
اتی محیت سے دیکھائیں اس کی روشنور کے سمندر میں غوطے نگاری ہو۔

تلیوں کو پکڑ کر ان کے پروں کو گوند سے چپکا دیتا اور پھر ان کے نئے نئے پروں کو ایک
کر کے بلیتے سے کامتا۔ درخنوں پر دوڑتی ہوئی گلہریوں پر چاقوؤں سے نشانہ لگاتا اور نوکیے
والے چاقوؤں کے جسموں سے گزر کر شاخوں میں پیوست ہو جاتے اور وہ اسی طرح پھنسو
پھڑ پھڑاتی اور کربنک آوازیں نکالتی رہتیں۔

رانو کبھی اس سے نفرت کرتا اور کبھی اسے اس پر رحم آنے لگتا۔ رحم اس وقت آتا ہے
اُسے یونہی بلاوجہ پھوپھو کی طرح بچھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھتا۔

گھر میں چار نوکر تھے جن میں مالی بھی شامل تھا۔ یہ سب اپنے ماں کے بظاہر بیزار تھے
اُسے چھوڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ نوکروں کے معاملہ میں بڑا فرامل خل تھا۔ ان کی فردگذاشت
انہیں کبھی کچھ کہتا نہیں تھا۔ اخراجات کا حساب تو خیر آج تک لیا ہی نہیں تھا۔ تجنہاں اچھی
دیتا تھا۔ ان میں سے اگر کبھی کوئی پیدا ہو جاتا تو ایسی تندی ہی سے اس کی دیکھ بھال کرتا جیسے وہ
کوئی عزیز ہو!

بوڑھے رانو کو اینہوں کی لوت تھی۔ اس کا بار بھی پر دوڑتی سنبھالے ہوئے تھا۔ مالی ہر بار
شام کو شراب ضرور پیتا اور بے طرح پیتا تھا۔ اسکے اخراجات بھی پر دوڑتی کی جیب سے نکلتے۔
اگر وہ کبھی ان پر خدا بھی ہوتا تو بعد میں معاف ضرور مانگ لیتا۔ لہذا آج بھی یہی
ٹھوڑتی دیر تک اسی کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ اس کے چہرے پر نزی کے آثار
ہو گئے تھے اور حلقوں سے اُبی پڑنے والی آنکھیں پھر بوجھل سی نظر آنے لگی تھیں۔ اس کی
اداسی لوت آئی تھی معمول کے اوقات میں وہ عموماً ایک انتہائی غزدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

”رانو....!“ اس نے رانو کے کامنے پر ہاتھ رکھ دیا، جو اس کی طرف پشت کئے کھڑا پائیں
غمیں کچھ دیکھ رہا تھا۔ وہ چوک کر مڑا اور گھبر اکر دو تین قدم پہنچے ہٹ گیا۔

”تم نے بڑا تو نہیں بنا۔“ پرویز آہستہ سے بولا۔

”نہیں سر کارا بلکل نہیں....!“ رانو کی باچھیں کھل گئیں۔ ”مگر سر کار مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔“
”کس بات کا۔“

”آپ اپنی بالکل خبر نہیں لیتے... آپ کسی ڈاکٹر....!“

”تو کیا تم مجھے پاگل سمجھتے ہو....“ پرویز نے اس کی بات کاٹ دی۔ لیکن اس کے لمحے میں
بہمی نری تھی۔

”نہیں صاحب.... مگر آپ کی صحت۔“

”مجھے کیا ہوا۔“ پرویز اپنے چوڑے چکلے سینے اور بازوؤں کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مگر صاحب رئیسوں کی یہ شان نہیں کہ ایک کونے میں بند پیٹھے رہیں۔“

پرویز نہ اسامنہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”باہر کی دنیا بڑی حسین ہے صاحب۔“ رانو پھر بولا۔

”ہو سکتا ہے۔“

رانو نے محسوس کیا کہ آج پر دوڑ کا مودہ کچھ ٹھیک ہے، ورنہ اس سے قبل کئی بار اس مسئلے پر
جمجملا چکا تھا۔ وہ جب بھی اس کی تھائی پسندی کے سلسلے میں کچھ کہتا پر دوڑ کو غصہ آ جاتا اور وہ اُسے
خنت دست کہہ کر دوسری طرف نکل جاتا۔ اُس نے سوچا کہ آج وہ مسئلہ بھی جھیٹے جس کے
متعلق پوچھنے کی آج تک ہمت نہیں پڑی تھی، نہ صرف رانو بلکہ دوسرے ملازمین بھی اُس معاطلے
کا تھا بلکہ پہنچنے کے لئے بڑی طرح بے تاب تھے۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی پر دوڑ سے کچھ
پوچھنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ رانو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح چھڑتے۔

آخر کاروہ سوچتا ہی رہ گیا۔.... اور پر دوڑ.... وہ تو کبھی کا اندر جا چکا تھا۔

وہ معاملہ تھا بھی بڑا خوفناک! نہیں ذر تھا کہ کہیں اس کی اطلاع پولیس کو نہ ہو جائے لیکن
خود انہوں نے اس کا تکرہ بہادر کسی سے نہیں کیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اُس کمرے تک اُن کی رسائی ہی نہیں تھی جہاں وہ سب کچھ ہوتا تھا۔

ورنہ نوکر تو آسمان میں تھگلی لگاتے ہیں۔ اس کمرے کے دروازے میں ایک براستقل پڑا جس کے کھلنے اور بند ہونے کا انحراف ہندسوں کی ترتیب پر تھا۔ اور وہ ترتیب پرویز کے ہا کسی کو نہیں معلوم تھی۔ دروازے کے سارے رخنے بند کردیے گئے تھے، اس لئے باہر سے حال دیکھنا قطعی ناممکن تھا۔

پرویز کا معمول تھا کہ وہ ہر رات کھانا کھانے کے بعد اس کمرے میں ضرور جاتا تھا سارے نوکر لرزنے لگتے تھے۔ کمرے کے اندر سے ”شراب شراب“ کی آوازیں آخر معلوم ہوتا جیسے کوئی کسی پر کوٹے بر سارہا ہو۔ پھر کسی عورت کی چین سنائی دینے لگتی۔ تھوڑی دیر بعد پرویز باہر نکل کر کمرے کو مقفل کر دیتا۔ اس کے چہرے پر ایسی ہمیسہ ہوتی کہ نوکر اس سے آنکھ ملانے کی بھی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

یہ بات آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ وہ عورت کون تھی؟ اور کیا وہ اُنی میں بند رہا کرتی تھی؟ اگر وہ اس کمرے ہی میں رہتی تھی تو اب تک زندہ کیسے تھی؟ پرویز سلسلہ تقریباً دو ماہ نے شروع کر کھانا تو کیا وہ کچھ کھائے پے بغیر دو ماہ سے زندہ تھی کمرے کا دروازہ دن میں کبھی نہیں کھولا جاتا تھا۔ رات کو بھی پرویز نماںی ہاتھ ہی اندر جا بہر حال یہ معہ کسی طرح حل نہیں ہو سکتا۔

کبھی کبھی نوکر یہ بھی سوچنے لگتے تھے کہ کہیں وہ کوئی خبیث روح نہ ہو، رانو اکثر راز انداز میں بقیہ نوکروں سے کہتا۔

”صاحب پر ضرور کسی چیل کا سایہ ہے، حسین اور تندرست آدمیوں پر اکثر چیلیں ہو جاتی ہیں اور زندگی بھر پیچھا نہیں چھوڑتی۔“ اس پر مالی کہتا۔

”میں ہوتا تو سالی کی چوٹی کاٹ لیتا۔“

”بڑے تیس مار خال ہیں۔“ بندو کہتا۔

”ابے ہاں ہاں۔“ مالی چھاتی پر ہاتھ مار کر کہتا۔ ”ذراعاں کس ہو کر دیکھے تو سالی، ابے دادا نے بھی ایک چیل کی چوٹی کاٹی تھی اور مرتبے دم تک اسے ازار بند میں باندھ رہے۔ ”بھلا ازار بند میں کیوں باندھ رہے۔“ بندو پوچھتا۔

”بس ازار بند ہی میں تو ہاتھ نہیں کھاتی۔“ رانو محققانہ انداز میں بولتا۔

”اچھا بابا کیا یہ تھے ہے۔ چیلوں کے پنج پیچھے اور ایڑیاں آگے ہوتی ہیں۔“

رانو اپنے ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں لا کر پلا دیتا۔

”یار اپنے اور تو کوئی چیل بھی عاسک نہیں ہوتی۔“ بندو آہ بھر کر کہتا۔

”بس کریار میرے! اگر جو کہیں کوئی سن ہی رہی ہوتے۔“ ٹکور بول پڑتا۔

”مکہدا قسم اپنے کو تو چیل ہی مل جاتی۔“ بندو اس طرح اکڑ کر کھاتا ہے اپنے ساتھیوں پر اپر کر رہا ہو کہ وہ چیلوں سے نہیں ڈرتا۔

شروع شروع میں انہیں رات رات بھرنیں نہیں آتی تھی لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اس کے دی ہوتے گئے تھے اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ چیل اس کمرے سے نکل کر کم از کم انہیں بیان نہیں کرے گی، پہلے وہ یہی سمجھے تھے کہ وہ جو کوئی عورت ہی ہے، مگر جب کچھ عرصہ نزدیکی تو انہیں اپنا خیال بدلتا پڑا۔ اگر وہ کوئی عورت تھی تو اس نے اپنی رہائی کے لئے ہنگامہ ہوں نہیں کیا۔ اگر وہ وہاں قید تھی تو کسی وقت دن میں بھی تو اس کی آواز سنی جاتی۔

رانو بڑی دیر تک کھڑا اس مuttle پر غور کرتا رہا۔ پھر اس نے ”اوہہ“ کہہ کر اپنے شانوں کو نہلک دیا۔ آخر اسے ان معاملات میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ سات نج گئے تھے اور اندر ہر اگرا ہر دو تاجا رہا۔ باورچی خانے میں سخنوں پر بھونے جانے والے مرغ مسلم کی خوبی فہماں تیرتی ہر رہی تھی۔ رانو نے تج سے زمین پر تھوک کر آتیں سے ہونٹ صاف کئے اور سونے سے قبل الیافون کی چکلی کے خیال میں گلن ہو گیا۔ مرغ کی روغن دار ملائم ہڈیوں کا تصور بھی اس کی دوچی جیسی سہلانے لگا تھا اس نے سوچا کہ سالا مرغ بھی اگر رہا تھی کے برابر ہوتا تو مزہ آ جاتا۔ رانو اندر لوٹ آیا۔ پرویز آنکھیں بند کئے ایک آرام کر کی پر پڑا تھا۔ اور وہ کھانے کے وقت مکہدا طرح پڑا۔

رانو باورچی خانے کے دروازے پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صاحب زیادہ سے ادھ ایک ناگ کھائیں گے۔ کاش دوسرا ناگ اسے مل جاتی۔ مگر وہ سالا بندو بھلا کپوں اسے دینے لگا۔ وہ ناگ کھلائے گا.... ٹکور اک جو اسے اکثر اپنے ایک عزیز کے یہاں لے جاتا ہے جسکی لوٹیا کرنیوں کے بھی کان کاٹتی ہے۔ اس کے حصے میں شاید پیٹھ کی بہذی آئے۔

پرہا تھا جیسے دے کام ریس ہو۔ اُس نے مزکر اس پر اسرار کمرے کی طرف دیکھا جس کا ازہ کھلا ہوا تھا۔ پھر اس نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے نارچ پکڑی اور کمرے کی طرف بڑھنے تو کر خوفزدہ تھے، اس لئے ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے میں جلدی نہیں کی، وہ آٹھ قدم پیچھے ہی تھے کہ پرویز کمرے میں داخل ہوا اور نوکروں نے پھر اس کی جیخ سنی، وہ جہاں وی رک گئے۔ ہر ایک کے دل کی دھڑکنیں اس کے سر میں دھمکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں، مجنود کھڑے رہے۔ انہیں شاید پرویز کے پکارنے کا انتظار تھا۔ پھر انہوں نے پرویز کمرے نکلتے دیکھا۔ نارچ روشن تھی اور وہ لڑکھڑا ہوا راہداری طے کر رہا تھا۔ وہ ان کے قریب سے گیا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُسے ان کی موجودگی کا علم ہی نہ ہو۔

وہ بھی اس کے پیچے چل پڑے۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر ان کی طرف نہیں دیکھا۔ برآمدے میں پہنچ کر وہ اسی آرام کری پر گر گیا جس پر شام سے لیٹا ہوا تھا۔

”صاحب۔“ رانو کسی ہوئی آواز میں بولان۔ ”کیا بات ہے؟“
”پانی....!“ پرویز کی آواز میں بہت زیادہ نفہت تھی۔

پانی پہنچنے کے بعد اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور پھر کسی نے بولنے کی بہت نہیں کی۔ ہوش رہا تھا کہ وہ آج اس کمرے کو کھلا ہی چھوڑ آیا ہے؟.... آخر کیوں؟.... اور آج وہ خرد اکیوں دوبار چیختا تھا؟

”پولیس کو فون کر دو۔“ پرویز تھوڑی دیر بعد بھرا ہی آواز میں بولا۔
”پولیس کو....!“ رانو تقریباً جیچ پڑا۔
”ہاں۔“

”کس لئے صاحب؟ کیوں؟“
”میں نے اُسے مار ڈالا ہے۔“
”کسے؟“ رانو کام گھستنے لگا۔

”کام سے کہہ دو کہ میں بے گناہ ہوں.... میں نے اُسے مار ڈالا ہے.... میرے خدا.... ماہے؟ تم ابھی تک گئے نہیں! فون کر دو! کو تو اسی کا نمبر تین سو پندرہ ہے.... جاؤ۔“
”لیکا کہہ دوں۔“ رانو تھوک نگلتا ہوا بولا۔

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ پرویز کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ م Laz میں نے بر قت، اور باورپی خانے میں آبیٹھے۔ رانو نے پہلے ہی تھیہ کر لیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو گا مرغ کی نیچی پر ہاتھ مارے گا۔ لہذا کھانا سامنے رکھ کر انہوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔ مالی رانو کا طرف فرار ہوا۔ ”میں خوب سمجھتا ہوں۔“ رانو سر بلکر بیوالا۔ ”مگر بیٹا اس سے کچھ نہیں ہوتا۔“

”لو! تھوڑا۔“ بندو نے پورا مرغ رانو کے سامنے ٹھنڈی۔
”مطلوب کیا ہے تیرا....؟“ رانو گزر کر کھڑا ہو گیا۔

”چل بیٹھ بھی بابا۔“ جھگور اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانا ہوا بولا۔ ”چل تو ہی کھالے۔ ہی ہی تو اب تو سالے پر تھوکوں بھی نہیں۔“ رانو نے پانی کا گلاس ہوتوں سے لگاتے ہوئے کہا ”آج اسی کی بات مان لیتے۔“ مالی بڑیا اور پھر بندو بھی چھٹ پڑا۔
لیکن ان کا یہ جھگڑا دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ پہلے انہوں نے کسی عورت کی جیخ سنی اور اس بعده بھی کسی مرد کی جیخ سنائی دی۔

چاروں حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”صاحب۔“ رانو نے آہستہ سے کہا اور چاروں کھڑے ہو گئے کیونکہ پرویز کی جیخ انہوں پہلی بار سنی تھی۔

پھر وہ چاروں اس کمرے کی طرف دوڑے۔ راہداری میں اندر ہی رہا۔ انہوں نے قریب کسی کی گہری گہری سانسوں کی آواز سنی۔

”رانو.... بندو....!“ پرویز کی گھٹی گھٹی آواز آئی۔ ”روشنی۔“

اس راہداری کا بلب کئی دن ہوئے فیوز ہو گیا تھا اور ابھی تک اُسے بدلا نہیں گیا تھا۔
یہاں عموماً اندر ہیرا ہی رہتا تھا۔
بندو نارچ لانے کے لئے دوڑا۔

”کیا بات ہے صاحب۔“ رانو نے پوچھا۔

”بات.... بات.... پتہ نہیں۔“ پرویز ہانپتا ہوا بولا۔
انتہے میں نارچ آگئی۔ نوکروں نے پرویز کی حالت کو پڑی حیرت کی نظر وہ دیکھا کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ رہی تھیں اور وہ اس

"بہرے ہو اکیا نہیں۔" پر دیز اس طرح بولا جیسے خود اسے اپنی آواز نہ سنائی دے
ہو۔ "کہہ دیہاں قتل ہو گیا ہے۔"

"چھوڑ دیا۔" حمید لاپرواں سے بولا۔ "لیکن میں کل سے اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔"
"وہ تو پڑنا ہی ہو گا۔"

"سچے جتاب!" حمید جھلا کر بولا۔ "یا تو میں خود کشی کر لوں گا یا اس ڈاکٹر کو گولی مار دوں گا جس
نے آپ کو ہوا خوری کا مشورہ دیا ہے۔ جھلا کوئی تک ہے۔ سارے شہر کا پیدل چکر لگاتے پھر ہی۔"
"خود کشی سے بہتر تو یہ ہو گا کہ تم کسی تدرست آدمی کے ساتھ کہیں بھاگ جاؤ جو تمہیں
اکر ٹھلاں گے۔"

"بالکل نہیں.... چھایہ جملہ۔" حمید کھر کھراتی ہوئی آواز میں بولا۔
"فکر نہیں۔"

"اور یہ بھی نہیں کہ سڑکوں ہی کے چکر کاٹے جائیں۔" حمید تھوڑی دیر بعد بولا۔
"کھایاں اور نالے بھی چھلانگتے۔ ڈاکٹرنے دھکے کھانے کے لئے نہیں، ہوا خوری کے لئے
باخت۔ ساری دنیا اتنی ترقی کر گئی ہے، مگر اپنے یہاں کے ڈاکٹر ڈیوٹ کے ڈیوٹ ہی رہے۔ اس
مانے میں جب کہ سارے کام میں نوں سے لئے جا رہے ہیں نہ جانے ہو اخوری کم بجت کیوں
جنت پرندی کے چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔"

"اوہو.... تو آپ ہی سوچنے تک اپنی ترقی یا نہ طریقہ۔" فریدی طنزیہ لمحے میں بولا۔
"سوچ لیا ہے؟" حمید نے اکٹو کر کہا۔

"فرمایے۔"

"سامنگل کا پپ.... گھر بیٹھے ہوا خوری فرمائیے۔"

فریدی نہیں پڑا۔

"ترکیب استعمال کیلئے پتہ لکھا ہو الفافہ اور چار آنے کے لٹک ارسال فرمائیے۔" حمید پھر بولا۔
"چلتے رہو چپ چاپ۔" فریدی نے اُسے دھکا دیا۔

"کہ کہتا ہوں زندگی سے جی اچاٹ ہو گیا ہے۔" حمید نے کسی تھکے ہوئے بوڑھے کی طرح
بلد کتب میں بقہرہ زندگی یاد خدا میں گزارنے کے لئے جنوبی امریکہ چلا جاؤں گا۔ یہ بھی کوئی
نہ گکھے۔ بلکہ چھٹے رہو۔ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اگر کچھ کام نہیں تو پیدل چلو۔"
فریدی خاموشی سے چلتا رہا۔ وہ پانچ بجے سے اب تک کئی میل کا چکر لگا کچکے تھے۔ اور کئی

پُر اسرار لاش

سر جنت حمید نے انہیں میں ٹھوکر کھائی اور گرتے گرتے بچا۔ فریدی نے پلٹ کر:
کی روشنی ڈالی اور حمید بیٹھ کر اس پھر کو سہلانے لگا جس سے ٹھوکر گلی تھی۔
"یہ کیا حماقت؟" فریدی جھنملا کر بولا۔

"برابر کر رہا تھا، کہیں نہ رہا مان گیا ہو۔"
"بالکل نہیں آئی۔" فریدی نے خلک لمحے میں کہا۔
"ظاہر ہے کہ اس پھر نے بھی میرے معافی مانگنے پر مسکرا کر یہ نہیں کہا کہ کوئی بات نہ
اٹھو نہیں تو ٹھوکر مارتا ہوں۔" فریدی بولا۔
"البتہ اس معاملے میں پھر آپ سے زیادہ بلند واقع ہوا ہے۔" حمید نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ تم ہنسنے ہنسانے کے چکر میں پڑ کر بالکل حق ہو گے؛
فریدی بولا۔

"اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس پھر سے بھی بدتر ہیں۔"
"بکومت ازايدہ پچپنا بھی سکھنے لگتا ہے۔"

"شاید پانچ سو سوچھڑویں بار آپ یہ جملہ دہرا رہے ہیں۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا۔
"ہے کہ پانچ سو سوچھڑویں بار بھی آپ یہی جملہ دہرا سیں گے۔ لہذا اب اس میں کچھ روبدل کی
فریدی کچھ نہ بولا۔ حمید نے پھر کہا۔

"بہتر یہ ہو گا کہ اس جملے کی ترتیب بدل دیجئے۔ مثلاً ازايدہ کھلنے بھی لگتا پچپنا۔ مت کہ
اس جملے کے الفاظ کے شروع کے حروف میں الٹ پھیر کر دیجئے جیسے بت کو! بیادہ زچپنا کی
ہگتا ہے.... یا پھر آخر کے حروف۔"
"یار خدا کے لئے پیچھا چھوڑو۔"

رنی ہیں۔ بڑے دانتوں والی حاصلہ اور شکلی ہوتی ہے اور بھی نہ جاتے کیا کیا آلات۔“

”تو کیا یہ بد بودار باتیں تھیں۔“ حمید نے بھنا کر پوچھا۔

”نہیں بڑی اونچی باتیں تھیں۔“ فریدی خشک لبھ میں بولا۔

”بہر حال آپ کل سے مجھے اس طرح نہیں شہلا سکتے بھلا کوئی تک ہے.... وادا....؟“

”ادا....!“ دفعتا فریدی چلتے چلتے رک گیا۔ وہ اس وقت ایک آبادی کی پشت سے گزر رہے تھے۔

”انکی بائیں طرف بڑی بڑی عمارتوں کا ایک لامتناہی سالسلہ پھیلا ہوا تھا۔ حمید بھی رک گیا۔

ٹارچ کی روشنی کا دائزہ ایک عمارت کی دیوار پر جنم گیا تھا۔

”نقب....!“ فریدی حمید کی طرف مڑ کر بولا۔

دیوار میں ایک اتنا بڑا سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے ایک آدمی بیٹھ کر بہ آسانی گزر سکتا تھا۔

بدار سے نکالی ہوئی اینٹیں نیچے ڈھیر تھیں۔ فریدی نے ادھر ادھر دیکھا یہ عمارت دوسرا

مارتوں سے قطعی الگ تھی۔

وہ دونوں دیوار کے نیچے آگئے۔ چاروں طرف گہر اتنا تھا اور جھینگروں کی مسلسل جھائیں

ہائیں بھی اندر ہی کا ایک جزو معلوم ہو رہی تھی۔ فریدی نے ٹارچ بجھادی اور دیوار سے

ل کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر نقب نکے ہمراہ میں پھینکا جس کے گرنے کی آواز

نالہ دی۔ اس کے بعد پتھر سنانا چاہیا گیا۔

”دوسرے لمحے میں وہ دونوں اندر پہنچ گئے اور ٹارچ کی روشنی زمین پر پڑتے ہی حمید اچھل کر

پہنچ ہٹ گیا۔ ایک عورت کمرے کے فرش پر اونٹھی پڑی تھی۔

”کیا مطلب....!“ حمید نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے سر گوشی کی۔

اس کمرے میں دوسرا طرف ایک ہی دروازہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ کھڑکیاں نہیں تھیں۔ ایک

رف ایک بڑا سا لکڑی کا صندوق رکھا ہوا تھا۔ اسی کے سامنے دوسرے گوشے میں ایک چھوٹی ہی

تل میز تھی، جس پر سیاہ رنگ کا ایک بکس تھا۔

فریدی تھوڑی دیر تک عورت پر جھکا رہا پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”لاش....!“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”خدا آپ پر رحمت نازل کرے۔“ حمید بڑا یاد۔

دونوں سے فریدی نے اپنے ایک ڈاکٹر دوست کے مشورے پر ہوا خوری کا مشغله شروع کر کر اس کے ساتھ حمید کو بھی گھشتا پڑتا تھا۔ یعنی اس کا وہ فال تو وقت جور قص گا ہوں اور ہزار کا میں صرف ہوتا تھا اب ہوا خوری کی نذر ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ حمید نے اس پر ضرورت سے ہڑھا ہو گا۔ تاؤ تو اسے دراصل اس بات پر آتا تھا کہ آخر یہ خواہ ہوا خوری کا بھوت اسوار ہو گیا۔ ہوا خوری یا پیدل چلنے کا مشورہ انہیں لوگوں کو دیا جاتا ہے، جو کسی مرض میں ہوں، لیکن یہاں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی۔

”تو آپ نہیں بتائیں گے؟“ حمید تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

”کیا....?“

”یہی کہ آخر ڈاکٹرنے یہ مشورہ دیا ہی کیوں؟“

”اس لئے کہ اج کل تمہیں گھری نیند آتی ہے۔“ فریدی نے سمجھ گی سے کہا۔

”مجھے....!“ حمید بوکھلا کر بولا۔

”ہاں....ہاں تمہیں۔“

”اور اس نے مشورہ آپ کو دیا ہے۔“

”یہ مشورہ میں نے تمہارے ہی لئے طلب کیا تھا۔“

”یعنی اتنے دونوں سے آپ مجھے اُب بارہے ہیں۔“

”اگو نہیں آدمی بارہا ہوں۔ اگو تو تم سوت وقت ہو جاتے تھے۔ ادھر سے البتہ اس

میں کچھ افاقتہ معلوم ہوتا ہے۔“

”یعنی....!“

”سوتے وقت اس بُری طرح شور مچاتے تھے کہ خدا کی پناہ.... اور یوں کہ ساری

صاف سمجھ میں آتی تھیں اور وہ ساری باتیں اتنی بد بودار ہوتی تھیں کہ ہاں پہنچنے لگتی تھیں۔

”مشلاً....!“

”مشلاً یہ کہ ہائے ہائے کیا نگت ہے۔ ارے مار ڈالا، کیا مسکراہت ہے، چال ہے کہ۔

بھی نہیں بلکہ عورتوں کی قسمیں اور ان کے عادات و خصائص بھی گوانے لگتے ہو۔ لبیا نا

نفاست پسند ہوتی ہے۔ چھوٹی آنکھ والی خوشابد پسند اور کینہ تو ز ہوتی ہے۔ کلوپیاں گاڑی

”بھرہو....!“ فریدی نے کہا اور راہداری کے سرے پر جا کر حمید کو آواز دی۔ حمید شاید راہداری میں فریدی کی آواز پر ووٹ پڑا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ۔“ فریدی نے رانو کی طرف اشارہ کر کے حمید سے کہا۔ ”کو تو انی فون کرو۔... اور ڈاکٹر۔...؟“ فریدی نے بھرہو کے ساتھ پڑا۔ ”جید نے پرویز کی طرف دیکھا۔“ ”بیہوش ہو گیا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”جلدی کرو۔“ ”جید رانو کے ساتھ چلا گیا۔“

”وہ عورت کون ہے؟“ فریدی نے بقیہ نوکروں سے پوچھا۔ ”کیا یہاں چوری بھی ہوئی ہے؟“ ”نہیں تو....!“ شکورابولا۔ شاید اُس نے اپنے خوف پر قابو پالیا تھا۔ تھوڑی دیر زک کر اُس نے کہا۔ ”مگر صاحب نے ابھی پولیس کو فون کرنے کے لئے کہا تھا۔“ ”میرے ساتھ آؤ۔“ فریدی نے کہا اور راہداری کی طرف جانے لگا۔ سرے پر بھنگ کر وہ مژا ٹھیکنے نوکروں نے اپنی جگہ سے جنبش لٹک نہیں کی تھی۔ ”کیوں....؟“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”آپ ہیں کون۔“ بندو خوفزدہ آواز میں بولا۔ ”اندر کیسے آئے۔ چھانک تو بند ہے۔“

”میں تمہیں بھی دکھانا چاہتا ہوں کہ میں کیسے آیا۔“ فریدی نے زم لجھ میں کہا۔ مالی آنکھیں چڑائے فریدی کو دیکھ رہا تھا۔ دفتہ اُسکے منہ سے بے ہنگمی آوازیں لکھنے لگیں۔ ”لبے ابے۔“ بندو اور شکورابولا نے آواز میں چیخ اور پھر انہوں نے بھی مالی کے سر میں سر ملانا شروع کر دیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے تینوں کو فرنجک ہو گئی ہو۔ ”چپ رہو۔“ فریدی اُنہیں ڈانٹ کر ان کی طرف بڑھا لیں۔ اُس کے قریب بھنپتے سے پہلے عین تینوں لہر اکر زمین پر گر پڑے۔

”کیا مصیبت ہے۔“ فریدی دانت پیس کر بولا۔ وہ تینوں بھی بیہوش ہو چکے تھے۔ اس کی آجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کرے۔ کبھی وہ راہداری کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی چاروں کی طرف۔ رانو جانے لگا۔

”تم یہیں تھہر دو۔“ فریدی نے کہا اور دروازے سے نکل گیا۔ راہداری سنان پڑی تھی و بے پاؤں چل رہا تھا۔ راہداری کے سرے پر بھنگ کر اُس نے آوازیں سنیں۔ وہ کچھ دیر کر رکا اور پھر یک دم برآمدے میں آگیا۔ گفتگو کرنے والے ٹھنک گئے اور وہ جو آرام کر سی پر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

فریدی اُنہیں تیز نظروں سے گھوڑا تراہا، بقیہ چار آدمی تو کر معلوم ہوتے تھے۔

”کیا بات ہے؟“ فریدی نے خود ہی سکوت توڑا۔

”آپ کون ہیں؟“ پرویز کی آواز میں خوف تھا۔

”کیا آپ اس سے واقف ہیں کہ اس عمارت کے ایک کمرے میں....!“ فریدی کا جاہنے سے پہلے ہی پرویز پھوٹ پڑا۔

”میں بے قصور ہوں.... وہ میرے ہاتھوں مری ہے۔ مگر میں بے قصور ہوں۔“

فریدی نے محسوس کیا جیسے وہ ہوش میں نہ ہو۔

”وہ کون ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”وہ....!“ پرویز اس طرح چونکا جیسے یک بیک سوتے سوتے جاگ پڑا ہو۔ ”وہ کون۔“ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور ہونٹوں پر ایک خفیہ سی مسکراہٹ کی دکھائی دی۔ پھر اگر فریدی آگے بڑھ کر اُسے سنجال نہ لیتا تو وہ سیدھا ہاز میں پر ہی آیا ہوتا۔ اُنکھیں بند تھیں اور سانسیں رک رک کر آرہی تھیں۔ فریدی نے اُسے آرام کر سی پر ڈال کیا بات ہے۔“ فریدی نوکر کی طرف مڑا۔

وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”فون ہے یہاں۔“ فریدی نے پھر سوال کیا۔

”نہیں....!“ رانو ہکلایا۔ ”پڑوس میں ہے۔“

”کوئی ڈاکٹر قریب ہے۔“

”جی ہاں....!“

”بلالا دو اُسے، میں پولیس کا آدمی ہوں۔“

رانو جانے لگا۔

ایک خیال تیزی سے اُس کے ذہن میں گنجائ۔ کہیں یہ مکاری تو نہیں کر رہے ہیں۔“
اعتراف جرم اُسے یاد آ رہا تھا۔ ساتھ ہی نوکروں کی لا علی بھی اس کے ذہن میں تھی۔ انہوں
گھر میں کسی عورت کے وجود سے لا علی ظاہر کی تھی۔ پھر وہ نقب؟ آخر بات کیا ہے؟
وہ دس پندرہ منٹ تک خیالات میں کھوارہاں چاروں آدمی ابھی تک بیہوش پڑے
قدموں کی آواز سن کر وہ چونکا۔ حمید اور رانوڈاکٹر کو لے آئے تھے۔
”اوہ.... یہ بھی گئے۔“ حمید نوکروں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہے
”کیوں....؟“

”بوڑھے سے جو کچھ معلوم ہوا تھا اس کی بناء پر میں نے بھی اندازہ لگایا تھا۔“
فریدی اس پر کوئی دوسرا سوال کرنے کی بجائے ڈاکٹر کی طرف مڑا، جو پرور پر جھکا کاہو
دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے سر اٹھا کر کہا۔
”یہ بیہوش نہیں! نہیں ہے۔ گھری نہیں، جو شاید آسانی سے نہ ٹوٹ سکے۔ کیا یہ اکٹوپر
خوابی کا مریض ہے۔“

”پتھر نہیں۔“ فریدی آہستہ سے بڑی بڑی۔
تینوں نوکروں کے متعلق ڈاکٹر نے بتایا کہ ان کی بیہوشی کی وجہ غالباً خوف ہے۔
”ایک لاش بھی ہے۔“ فریدی نے ڈاکٹر سے کہا۔
”لاش....؟“ ڈاکٹر کی آنکھیں پھیل گئیں۔
”جی ہاں۔ میرے ساتھ آئیے۔“ فریدی نے کہا اور حمید سے بولا۔ ”تم نہیں مٹھرو۔“
پھر وہ رانو کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتا ہوا رہا اور یہ کی طرف بڑھ گیا۔
لاش دیکھ کر رانو جیخ پڑا۔ فریدی نے آگے بڑھ کر لاش سیدھی کر دی اور رانو سے
”یہ کون ہے؟“

”ہم.... میں.... نہیں جانتا۔“
”کبھی نہیں دیکھا....؟“
”نہیں.... کبھی نہیں۔“ رانو نے کہا اور آنکھیں چھاڑ پھاڑ کر نقب کی طرف دیکھنے لگا۔
ڈاکٹر لاش کو دیکھتا رہا۔ اس نے فریدی کے ہاتھ سے نارچ لے کر متولہ کی گرد و دیکھ

لہا ہو کر بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔ پولیس کو اطلاع ہوئی یا نہیں۔ اسے گاہونٹ کرمارا گیا ہے۔“
”میرا تعلق حکمہ سراجِ رسانی سے ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور بات ابھی تک میری سمجھے
میں بھی نہیں آئی۔“

ریو والر کی کہانی

پولیس آگئی تھی۔ حمید نے خاص طور سے جکدیش کو فون کیا تھا اوراتفاق سے وہ اُس وقت
روتوں میں موجود تھا۔ تینوں نوکروں کو ہوش آگیا تھا۔ لیکن پرویز کی حالت بدستور وہی تھی۔
اکثر نے بھی اس کے سلسلے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے گریز کیا تھا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ پر
ہاتھ ثابت ہو گئی تھی کہ وہ حقیقتاً بے خوابی کا مریض ہا۔ اکثر پندرہ پندرہ دن تک اُسے نیند
نہیں آتی تھی۔

پرویز اور اُس کی مشغولیات کے متعلق ہر ایک نے حیرت سے سن۔ رانو کا بیان دوسروں سے
یاد رہا اور واضح تھا اس لئے فریدی بار بار اسی سے سوال کر رہا تھا۔

”ہم بھال تین سال سے ہیں۔“ رانو کہہ رہا تھا۔ ”لیکن ہم نے یہاں کبھی کوئی عورت نہیں دیکھی۔“

”اور تمہیں یہ یقین ہے کہ وہ نقب آج ہی کسی وقت لگائی گئی ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں ہاں! کل میں پچھوڑاے کی طرف سے گزرا تھا۔ اس وقت میں نے نقب نہیں دیکھی۔“

”اپنے مالک کی پچھلی زندگی کے متعلق بھی کچھ جانتے ہو۔“

”میں نہیں! اسے مجھے اُن کے رشتے داروں ہی کے متعلق کچھ معلوم ہے۔“

”لیکن وہ بیٹھے سے عجیب و غریب حرکتیں کرتا رہا ہے۔“

”میں نے ابھی بتایا آپ کو۔ کمرے والا معاملہ شاید دوڑھائی ماہ پہلے شروع ہوا تھا۔“

”تو یہاں کبھی کوئی آتا ہی نہیں تھا۔“ فریدی نے سگار سلاکتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں.... اوہ نہہریے.... میں ہاں چینی ہی معلوم ہوتا تھا۔“

”تم بھر لئکن لے لگے۔“

”نبیں حضور! اب سے ڈھائیٰ میں ماہ پہلے ایک چینی صاحب کے پاس آیا تھا۔ وہ اپنے را ایک بہت بڑا صندوق لایا تھا۔ وہی صندوق جو ابھی آپ نے اس کرے میں دیکھا ہے۔“ فریدی چونکہ کرانو کو گھورنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔ ”اور اسی کے بعد ہی سے تمہیں اس کرے میں کسی عورت کی چینیں سنائی دینے لگی تھیں ”جی ہاں...!“ رانو جلدی سے بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

”تمہارے ماں کے پاس خطوط وغیرہ بھی آتے رہے ہوں گے۔“

”آتے تھے اور اکثر کتابوں کے پارسل بھی آیا کرتے تھے۔ صاحب بھی خطوط لکھا کرتے تھے“ ”کہاں سے آئے تھے۔“

”یہ تو نہیں بتا سکتا۔ میں پڑھا لکھا نہیں۔“

”تمہارے ساتھیوں میں سے کوئی بتا سکے گا۔“

”جی نہیں وہ بھی میری ہی طرح ہیں۔“

”مگر تمہارا باب و لمبہ تو پڑھے لکھے لوگوں کی جیسا ہے۔“

”صحت کا اثر ہے سر کار! میں ہمیشہ بڑے ہی لوگوں کے پاس رہا ہوں۔“

”تمہارے ماں کا ذریعہ معاش کیا تھا۔“

”یہ میں نہیں جانتا لیکن بینک سے میں ہی روپے لایا کرتا ہوں۔“

”تحوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر وہ سب لاش والے کرے میں دوبارہ آئے۔ لاش؟“ دہیں پڑی تھی۔ فریدی نے اُس بڑے صندوق کا ڈھکن اٹھایا جس کے متعلق رانو نے بتایا تھا میں لبے ریشوں والی خلک گھاس اور کاغذ کی روپی بھری ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کبھی کوئی چیز پیک کی گئی ہو۔ فریدی کے اشارے پر کاشیبلوں نے صندوق میں بھری ہوئی فرش پر الٹ دی۔ فریدی دیر تک اُسے تاریخ کی روشنی میں دیکھتا رہا پھر حمید نے دیکھا کہ کاغذ کا ٹکڑا اتھہ کر کے اپنی جبک میں رکھ رہا ہے۔

”یہ تو ظاہر ہے کہ جو کچھ بھی ہوا اندر ہیرے میں ہوا۔“ فریدی چاروں طرف تاریخ کی ڈالتا ہوا بولا۔

”کیوں اندر ہیرے میں کیوں؟“ جگد لیش بولا۔

”تم دیکھ رہے ہو کہ یہاں اس کرے میں الیکٹریک فنگ نہیں ہے۔“ فریدی نے آہستہ سے ہا۔ اور مجرم یہاں جو کچھ بھی کرتا رہا ہے اس کے لئے اس نے موم بیان استعمال کی ہیں۔ کیا یہ مل ہوئی موم تیوں کا موم نہیں ہے؟“ اس نے ایک طاق کی طرف اشارہ کیا۔ کچھ دیر چپ رہ کر رہا۔ ”لیکن آج یہاں موم تھی بھی نہیں تھی۔ غالباً مجرم کو یہاں یاد نہیں کہ کرے میں موم تھی میں ہے۔“

”لیکن وہ آوازیں جو روزانہ سنی جاتی تھیں۔“ حمید نے کہا۔ اس کا کیا مطلب ہا۔ اس عورت کے متعلق تو ہمیں سوچا جاسکتا ہے کہ یہ اس نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئی۔ ”اور اپر ویز نے اس پر حملہ کیا تھا؟“ اگر یہ صورت بھی تھی تو تھا گھونٹ دینے کی کوئی وجہ بھی نہیں آتی۔ پرویز اسے مار ڈالے بغیر بھی بے دست پا کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جسم کی بنا و اٹ کے تھا اسی طاقتور معلوم ہوتا ہے اور اس عورت کو تم دیکھتی رہے ہو۔“

”ممکن ہے پرویز بھی اُسے بھوت ہی سمجھا ہو۔“ حمید نے کہا۔ ”جس طرح نوکر آپ کو بہت سمجھے تھے۔ اس کرے سے متعلق ساری چیزوں ان لوگوں کی طرح پر اسرار ہیں۔“

”پرویز کے لئے نہیں ہو سکتیں۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیونکہ اس کے پر اسرار ہتھے کا ذمہ دار ہی ہے۔“

”میرے خیال سے اس عورت کے متعلق پڑوس میں چھان بین کرنی چاہئے۔“ حمید نے کہا۔ ”تو کر فراؤ ہیں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔ ”بھج میں نہیں آتا کہ آپ نے اس کہانی پر اعتبار کیے کر لیا۔“

”مھن اس لئے کہ اُن تیوں نوکروں کی بیہو شی مصنوعی نہیں تھی اور نہ اُن آوازوں میں ہلاٹ تھی، جو بیہو ش ہونے سے قبل اُن کے حلقو سے لکھی تھیں۔“

”ڈاکٹر بھی اُن کا پڑو سی ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”ممکن ہے وہ بھی اس سازش میں شریک ہو۔“ ”یوں تو ہم بھی اسی نقب کے ذریعے اندر داخل ہوئے تھے۔“ فریدی نے مکرا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ہم نے ہی اس عورت کو یہاں بھیجا ہو۔ کیوں بھی جگد لیش؟“

”جگد لیش ہنسنے لگا۔“

”کسی عورت کی لاش دیکھ کر مجھے سب سے پہلے ہی خیال آتا ہے کہ اس کی زندگی میں اسے بولنے ملتا۔“
”فرض کیجئے کہ آپ زندگی ہی میں اس سے مل لئے ہوتے تو۔“
”تو اس وقت میں ایک ہی نظر دیکھ کر بتا دیتا کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی تھی۔“ حمید نے اگئے سے کہا۔
”جگد لیش ہنسنے لگا۔“
”کیوں؟ کیا میں نے کوئی یو قومی کی بات کہہ دی۔“ حمید سمجھ دی سے بولا۔

”جگد لیش کی بُٹی تیز ہو گئی۔“
”شاید تم بھی گئے۔“ حمید مایوسی سے بولا۔
”جگد لیش پستار ہا۔“
”اُرے....!“ فتح حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔
”کیا....؟“ جگد لیش نے بھی اس کی تقلید کی۔ حمید تاریک راہداری کی طرف دیکھ رہا تھا۔
لہلیش کے ساتھ تمنی کا نشیل بھی کھڑے ہو گئے تھے۔
”وہی عورت۔“ حمید نے سر گوشی کی۔ اس کی آنکھیں حرمت سے چھپی ہوئی تھیں۔
”کون عورت....!“ جگد لیش نے پوچھا۔
”وہی.... جس کی لاش۔“

”کیا؟“ جگد لیش سہی ہوئی آواز میں بولا۔
”جید نے جھپٹ کر جگد لیش کے ہول شر سے روی الور نکال لیا اور راہداری کی طرف دوڑا۔“
”نہیں.... نہیرو۔“ جگد لیش نے اُسے آواز دی۔ لیکن وہ جا پکا تھا۔ جگد لیش وغیرہ راہداری کے سر سے پر آکر کھڑے ہو گئے لیکن ان میں سے کوئی بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ انہوں نے ایسی آوازیں سنیں، جو عموماً دینکا مشتی کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ ساتھ ہی حمید ماگھنی کی آواز بھی سنائی دی۔ وہ جگد لیش کو پکار رہا تھا۔
”کون ہے.... خبردار“ جگد لیش نے لکار کر زمین پر پیر پٹھے لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔ پھر کرنے پلٹ کر کاٹنیلیوں کی طرف دیکھا۔ لاش والے کمرے میں کوئی دھست سے زمین پر گرا اور

”پرویز کی نیند....!“ حمید مضمکانہ انداز میں مسکرا یا۔ ”اس نیند کے متعلق کیا خیال ہے؟“ کیا تم سمجھتے ہو کہ ڈاکٹر کی تشخیص غلط ہے۔“ فریدی اس کی طرف مڑا۔
”میں نے تو ایسی نیند کے متعلق آج تک نہیں تھا، جو یہو شی سے بھی زیادہ گہری ہو۔“
”کیوں؟ کیا نواب سا وجہت مرزا کی نیند تمہیں یاد نہیں۔“
”حمید جواب دینے کی بجائے لاش کی طرف دیکھنے کا۔“
”میں نے شاید اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

تب تو معاملہ صاف ہے فریدی نے سمجھ دی سے کہا۔ ”تم بھی اس سازش میں شریک ہوتے ہو۔ درستہ اس وقت میر اور تمہارا یہاں کیا کام! تم مجھے اس طرف لائے ہی کیوں تھے؟“ میں لایا تھا۔ ”حمید بھنا کر بولا۔“

”شاید آپ انہیں پھر پھنسانا پاچے ہیں۔“ جگد لیش نے نہ کر کھا۔
”تھوڑی دیر بعد لاش اٹھوادی گئی اور وہ لوگ برآمدے میں آپنے۔ پرویز اب تک کر سی ہی پر تھا۔“

”بیویوں سے قبل اس نے اعتراف جرم کیا تھا۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن یہ ہے کور اس کے ملاز میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ ویسے آدمی دولت مند معلوم ہوتا ہے۔“
فریدی کھڑا ہو گیا۔

”تم لوگ یہیں نہیرو۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔
”اب دیکھئے۔“ حمید بولا۔ ”تھوڑی ہی دیر نہیرو پڑتا ہے یا قیامت تک۔“
”آپ نہی طرح آکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔“ جگد لیش نے کہا۔
”معلوم ہوتا ہوں۔ چہ خوب! گویا آپ کو اس میں شبہ ہے۔“
”اتناعدہ کیس ملا ہے آپ لوگوں کے شیان شان۔“
”کیا....؟“ حمید جھی کر بولا۔ ”گویا میں کیوں کے لئے مر اکرتا ہوں۔“
”نہیں بڑے بھائی گزرتے کیوں ہو۔“ جگد لیش پڑا۔
”تم نہیں جانتے کہ میں اس وقت کتنا کھلی ہوں۔“
”کیوں....؟“

”میں کیا جاؤں۔“ حید بھنا کر بولا۔ ”سر اسر تھا ری غلطی ہے۔ اگر تم لوگ بھی میری مدد کے لئے پہنچ گئے ہوتے تو کبھی ایسا نہ ہوتا۔“ ”جگد لیش بدھوں ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔ ”لیز میں بدھوں ہو کر ایک کرسی پر گر گیا۔“ ”معطل ہو جاؤں گا۔ مقدمہ چلے گا۔“ ”ملازمت گئی۔“ وہ بڑا لایا۔ ”ملازمت ہو جاؤں تو۔“ حید غصہ سے بولا۔ ”اگر انہوں نے مجھے مارہی ڈالا ہوتا تو۔“ حید غصہ سے بولا۔ ”تم زمر اربو الور کیوں نکلا تھا۔“ جگد لیش چننا

میں نے نہیں نکلا تھا۔ ”حیدر نے گردون جھنک کر لاپرواںی سے کہا۔
”مت بکو۔ ”جکد لیش نے جھلائہٹ میں گھونساتان کر کہا۔
”لیکا بات ہے۔ ”فریدی کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازے میں کھڑا حیدر اور جکد لیش کو حیرت
سے دکھر رہا تھا۔

”میرا بیڈا اغرق کر دیا انہوں نے۔“ جگدش فریدی کی طرف مڑا۔
کیبات ہے۔“ فریدی نے حمید سے پوچھا۔
”پتہ نہیں۔“ حمید گھرائے ہوئے لجھ میں بولا۔ ”یک بیک بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا ہو گیا۔
اتا تو میں نے دیکھا تھا کہ ذرا سا اوٹگھ گئے تھے۔“

”مت کبو۔“ جگد لش علق کے بل چیخا اور پھر اچاک اس کے چہرے پر بے نبی چھا گئی۔
”آخر بتاتے کیوں نہیں۔“ فریدی گبڑ کر بولا۔
جگد لش نے غصیلی اور روہانی آواز میں پورا دعوے دہرا لایا۔

”م بھک تو ہیں پی گئے۔“ حیدر امان کربولا۔ ”یہ سالاچ چیز بھوت خانہ معلوم ہوتا ہے۔“
 ”لیا بات ہے۔“ فریدی حیدر کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا اور پری ہونٹ پھیج کر بولا۔ ”ارے
 آپ کا دماغ بھی پھر گیا۔“ حیدر بے بسی سے بولا۔ ”کافی دیکھئے کوئے پر غصہ اتارنے سے کیا فائدہ۔“
 ”دیکھو میں بہت بڑی طرح پیش آؤں گا۔“

”تو آپ اچھی طرح کب پیش آتے ہیں۔“
 ”حمدلله!“
 ”مرکار والا! ابھی اور اسی وقت میرا استحقی منظور فرمائیے۔“

ساتھ ہی کسی کے دوڑنے کی آواز آئی اور پھر ستائا چاگیا۔ جگدیش نے حمید کو آوازیں دیں لیکن جواب ندارد۔ اس نے رانو کے ہاتھ سے ٹارچ کر اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ کرنے میں پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ حمید زمین پر اونڈھا پر اٹھنے کی کوشش تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت بھی نہ رہ گئی کہ وہ ان پر زور دے سکے۔ جگدیش نے جلدی سے جھک کر اسے اٹھایا لیکن وہ اس سے لپٹ پڑا۔ ”ارے.... ارے میں ہوں۔“ جگدیش بوکھلا کر بولا۔ لیکن حمید اس کی گروں میں ہاتھ جھک کا دے چکا تھا۔ اگر سایہ آگے بڑھ کر اسے سنبھال نہ لیتے تو وہ سر کے بل زمین پر چلا آیا ہو ”ہوش میں آؤ۔۔۔ میں جگدیش ہوں۔“ جگدیش خوفزدہ آواز میں چینا۔ حمید گھبرا کر پہنچے ہٹ گیا اور اس نے اس طرح اپنے سر کو جھکلے دینے شروع کر دیے بیویو شی کے اثرات سے پہنچا چکر انا جاہتا ہو۔

”جگدیش....!“ وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تم کہاں مر گئے تھے وہ دوستھے۔“
”کون؟“
”بے نہیں۔“ محمد جگدیش کے ماتھے سر ڈال ریج لر کمپ چارواں طرف، کھٹاہوا

وہ تمہارا یو اور لے گئے۔ ”
”کیا...؟“ جگد لیٹ تقریباً چھپا۔
”ویکھتے کیا ہو! آگے بڑھو...“ حیدر بوكھلا کر بولا اور نقاب کے راستے باہر نکل گیا۔ جگ
وغیرہ بھی اس کے پیچھے لے کے۔

دوسرا طرف تاریکی اور نائے کی حکومت تھی۔ حید بد خواہی میں ادھر اُدھر بھاگنا تھا۔ جگد بیش اور اس کے ساتھی بھی اُس کا ساتھ دے رہے تھے وہ رکتا تو رک جاتے بھاگنا کے پیچے دوڑتے۔

”اب کہیں وہ بھی ہاتھ سے نہ جائے۔“ حمید نے چیخ کر کہا اور نقبہ کے راستے پھر کوٹھ دا خل ہو گیا۔ پروزب دستور آرام کر سی پر پڑا تھا۔

”حمد صاحب۔ حکم لیٹ رائعتا ہوا والا۔“ بہت نیک اہوا... میں اربا اور... اب کہا ہو؟

بہت بڑا دھماکہ ہوا گلا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ شہر کی طرف چل پڑا۔ بھوک کے مارے نہ احوال تھا۔ یہاں کسی سواری کا دستیاب ہوتا بھی مشکل ہی نظر آ رہا تھا۔ کبھی کبھی ایک آدھ کار گزر جاتی تھی۔ وہ نیکی نہ ہوتی تھی۔ بہر حال وہ پیدل ہی چلنے کا تیہی کر کے سڑک چھوڑ کر عمارتوں کے پشت والے ویران حصے میں آگیا۔ سڑک سے جانے میں زیادہ وقت صرف ہوتا اور چلنے بھی بہت پڑتا۔

حید چلا تو آیا تھا لیکن حقیقتاً اُس کا ذہن اُسی قتل میں الجھا ہوا تھا۔ پرویز اس کمرے میں روزانہ کسی عورت کو چینخنے پر مجبور کرتا تھا۔ اگر وہ مقتولہ ہی تھی تو اتنے دونوں تک کمرے میں بند کیوں کر رہی دن میں اس نے شور کیوں نہیں چھایا۔ پھر اُس نقب کیا مطلب تھا۔ وہ غیر ملکی آدمی اُس بے صندوق میں کیا لایا تھا۔ وقتاً حید کو یاد آیا کہ فریدی نے اس بکس سے کوئی کاغذ نکال کر جیب میں رکھا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ کہیں قریب ہی سے پڑوں کی تیز بُو آرہی تھی۔

پڑوں کی بو

حید آنکھیں چار چھاڑ کر تارکی میں گھور رہا تھا۔ وقتاً اسے اپنی بائیں جانب والے نشیب میں ٹارچ کی روشنی دکھائی دی۔ تقریباً دو دھانی سو گز کے فاصلے پر جھاڑیوں کے قریب ایک آدمی نظر آ رہا تھا جس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں حید کو ایک دوسرا انسانی جسم سد کھائی دیا، جو ایک سفید چادر میں لپٹا ہوا میں پڑا تھا۔ قریب ہی پڑوں کا میں رکھا تھا۔ اُس آدمی نے میں الٹا کر چادر میں لپٹے ہوئے جسم پر پڑوں انٹلٹانا شروع کیا۔ ہوا کے جھونکے پڑوں کی بو کو دور دور کم پھیلایا رہے تھے۔

حید نے کچھ سوچے سمجھے بغیر اسے لکارنا شروع کر دیا۔
”خُردار! گولی مار دوں گا۔“

اُس آدمی کے ہاتھ سے ٹارچ گرگئی اور وہ ایک ہی جست میں جھاڑیاں پار کر کے نظروں سے او جل ہو گیا۔ حید اپنی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا اس نے زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے پاس سے ٹارچ الٹا کر اور جھاڑیوں میں کھس گیا لیکن پذرہ میں منت سرمانے کے باوجود بھی بھاگنے والے

دفتار فریدی جکد لیش کے ریوالز ہو لشر کی طرف دیکھنے لگا۔

”جکد لیش کیا تم واقعی ہوش میں نہیں ہو۔“ فریدی اسے گھور کر بولا۔

”جی...! جکد لیش گھبرا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔“

”کیا ریوال تھمارے ہو لشر میں موجود نہیں ہے؟“

جکد لیش نے بے اختیار انداز میں ہو لشر میں ہاتھ ڈالا اور پھر ”اے“ کہ کر پڑا۔ ... ریوال موجود تھا۔

”اُلوکی دم فاختہ۔“ حید نے دانت میں کر جکد لیش کو گھوڑتے ہوئے کہا۔

جکد لیش کا جلیدہ دیکھنے کے قاتل تھا۔

”ایشور قسم ان لوگوں سے پاؤچھ لیجئے۔“ جکد لیش یو کھلا کر بولا۔ کاشیبلوں اور پرونو کروں نے حیرت آمیز انداز میں بڑیا ناشروع کر دیا۔

فریدی حید کی طرف مڑا لیکن وہ اتنی دری میں راہداری کے بیرونی سر نے تک پہنچ پڑا۔ اُس نے تیز تیز قدموں سے پائیں باغٹے کیا اور چھانک سے گذرا کر سڑک پر آگیا اور پھر اُر اُب طرف کھڑے ہو کر جو پہنچنا شروع کیا ہے تو پہیٹ دباتے دباتے اس کا بڑا احوال ہو گیا۔

اُس نے اس وقت جکد لیش کے ساتھ وہ شرات کی تھی کہ جکد لیش شاید مرتے وہ اسے نہ بھلا سکے۔ حقیقتاً اسے کچھ بھی نہیں دکھائی دیا تھا اور نہ اس وقت اُس کے ذہن میں شرات تھی۔ اس نے محض جکد لیش کو ڈرانے کے لئے مردہ عورت کے بھوت کا حوالہ دیا۔

اُس کا ریوال چھینتا تھا لیکن جب اس نے یہ محسوس کیا کہ جکد لیش اور اُس کے ساتھی خوف کو کس کرے تک آنے کی بھی بہت نہیں کر رہے ہیں تو دفتار اس کے خود ایسے قلابازی کھائی اسی شرات اس کے رگ و ریش میں کلبلائے گی۔ پھر اس نے خود ہی اسی اچل کو دچائی چکی آدمیوں سے لڑ رہا ہو۔ بھاگنے اور گرنے والوں کی ایکنٹک بھی خود ہی کی.... اور پھر جگ اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا تو اس نے چپ چاپ ریوال رُس کے ہو لشر میں سر کا دیا تھا۔

اول تو خالی پیٹ میں بھی شاذ و نادر ہی آتی ہے لیکن اگر زیادہ دیر تک آتی تو پھر ریاں گولے اس بُری طرح آتیوں میں ٹوکر مارتے ہیں کہ خدا کی پناہ۔ لہذا حید کے معدے؟

مہربعد صادق آرہا تھا۔ ”رہتے رہتے دل میں تیرا درد بھی ہو گیا۔“ پیٹ میں معدے نی جگ

تحک ہار کروہ پھر اسی جگہ واپس آگیا۔ چادر میں لپٹا ہوا جسم اب بھی اسی حالت میں ہے۔
حمدینے اُس کے چہرے سے چادر انھائی اور جھی کر دو تین قدم پچھے ہٹ گیا۔
کیا یہ اسی عورت کی لاش نہیں تھی۔ وہ لاش جسے تھوڑی دیر قبل پولیس اٹھا لے گئی تھی
پھر یہ بیہاں کیسے۔ کیا اس پر اسرار آدمی نے اس پر اس لئے پردول نہیں چھڑ کا تھا کہ اسے
دے؟ آخر وہ کون تھا اور اسے لاش کس طرح طی۔

وہ پھر آگے بڑھا۔ مقتولہ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ حمید پھر ٹھک گیا۔ اسے یاد آ رہا
ہے اُس نے جو لاش کرے میں دیکھی تھی اس کی آنکھیں بند تھیں۔ لیکن یہ کھلی ہوئی آنکھیں زد
سے بھر پور معلوم ہو رہی تھیں۔ حمید نے اس کی پیٹھانی پر با تھر رکھ دیا جو بات ہی چلا گیا۔ وہ پھر ا
کر پیچھے ہٹ آیا؟ کیا اس کا سر پلپا ہے۔ لیعنی سر میں بڑی ہی نہیں۔ خوف کی ایک مشنڈی سی لم
کے جسم میں دوڑ لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

اس نے پھر جی کڑا کر کے اس کے پیڑ پتوں لے لیکن وہاں بھی بڑی ندارد۔ ایک خیال
سے اُس کے ذہن میں گونجتا اور اس نے اس جسم سے لپٹی ہوئی چادر کھینچ کر ایک طرف ڈال
اور پھر اسے یہ سمجھ لیتے میں دشواری نہ ہوتی کہ وہ مجسمہ ربر کا تھا۔ لیکن یہ بھی کم حریت
دریافت نہ تھی۔ آخر اس کا کیا مطلب! ربر کا مجسمہ؟ جو ہو بہو مقتولہ کی نقل تھا۔

حمدی تھوڑی دیر کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے اس مجسمے کو انھیا اور چل پڑا۔... مجسمہ
بھاری نہیں تھا۔ تھوڑی دور پل کر دوہ پھر لوٹ پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں اس واقعہ کا تعلز
اسی معاملے سے نہ ہو۔ لہذا پردول کے میں اور اس چادر کو وہیں چھوڑ دینا مناسب معلوم ہو
لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو لاتا کس طرح
منٹ تک سوچتا رہا پھر اس نے پردول کا میٹن اور چادر جھاڑیوں میں چھپا دی۔

وہ اسی وقت پرویز کے مکان پر جا کر فریدی کو بھی اس کی اطلاع دے سکتا تھا لیکن
دوسری ایکم کے تحت جو اسے اسی وقت سوچھی تھی اس نے واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔
اس نے اس مجسمے کو کاندھے پر انھیا اور چل پڑا۔ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی
نوکروں کی نظر اُس مجسمے پر نہ پڑنے پائے۔ آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا گیا۔ وہ

بی کرے میں پہنچا اور مجسمے کو اس کے بستر پر ڈال کر چادر سے ڈھک دیا۔
اُس سے فراغت حاصل کر کے اُس نے کھانے کے لئے ہلچانا شروع کر دیا... اور پھر
ایپل الٹھے بھی نہ اٹھایا تھا کہ فریدی اور جنکدیش بھی آگئے۔

آج تمہاری خبر ہت نہیں۔” فریدی اُسے مکار کا کر بولا۔
”اطلاع اعراض ہے کہ میں بھی کسی سے کمزور نہیں۔“ حمید نے لاپرواں سے کہا اور جلدی
بلدی منہ چلانے لگا۔

”بیٹھو بھی جنکدیش۔“ فریدی ذائقہ نیکل کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”میں کچڑے بدلتا
رہا ہوں بے تکلف شروع کر دو۔ میں بھی آکر شریک ہو جاؤں گا۔“

فریدی اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ ”اور سناؤ بھائی جنکدیش، بہت دنوں بعد ملقاتا ہوئی۔“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”کھاؤ تا یاد
بی شروع ہو جاؤ! فریدی صاحب ابھی شیو کریں گے۔“

”میں تم سے ٹاراش ہوں۔“ جنکدیش نے گردن اکڑا کر کہا۔ ”تم نے میرا بڑا مظکھہ اڑایا۔
کالیبلوں کے سامنے تمہیں ایسی حرکت نہ کرنی چاہئے تھی۔“

”خدا کی قسم! کسی دن بیچ بازار میں تمہاری بے عزتی کروں گا۔“ حمید بگڑ کر بولا۔
”اگر فرض کرو وہ خادش حقیقت پر مبنی ہو تو تم نے میری گردن ہی کٹوادی تھی۔“

جنکدیش بغلیں جھاگنکے لگا... حمید بولتا رہا۔
”تمہارے مکھے میں لو مڑیوں کے علاوہ آج جنک کوئی اور دوسرا چانور نظر نہ آیا... چوڑیاں
ہیں...!“

وہ نما حمید کے منہ کا نوالہ باہر نکل پڑا اور اس کے منہ سے عجیب طرح کی آوازیں لٹکنے لگیں۔
”اہ...اہ...اہ...اہ...ایہہ۔“

اور اس لبی سی ”ایہہ“ کے بعد وہ کرسی سے ٹھک کر دین پر چلا آیا۔
جنکدیش نے پلٹ کر دیکھا۔ فریدی اُسی مجسمے کو گردن سے پکڑے ہوئے آ رہا تھا۔ حمید کو اس
طریقہ کر دیکھ کر اُس نے اسے زمین پر ڈال دیا اور حمید کی طرف پکا۔

جنکدیش حمید کی بجائے زمین پر پڑے ہوئے مجسمے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ہے خدا تھا کہ فریدی واقعات سن لینے کے بعد جائے اور دوات کی طرف ضرور وڑتے گا۔ لہذا بٹ تو محترم ہی لیا جائے۔

”اور تم وہ چادر اور پڑول کا شن و دین چھوڑ آئے۔“ فریدی برا سامنہ بنا کر بولا۔

”بہت احتیاط سے ایک جگہ چھپا آیا ہوں۔“

”اچھا تو ختم کرو کھاتا۔“

”ختم سر کار۔“ حمید نے پانی کا گلاس چڑھا کر ڈکاری اور پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ”آپ ل بھی کھا لجھج۔“

”وابسی پر۔“ فریدی جکد لیش کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”جی ہاں... اور کیا؟“ جکد لیش نے اٹھتے ہوئے کہا۔

فریدی نے گیرج سے جیپ نکالی۔

”چلو تمہیں ڈرایو کرو۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

”بہت بہتر۔“ حمید نے کہا۔ لیکن فریدی اس کی آنکھوں کی شرارت آمیز چک نہ دیکھ سکا۔ رُڑک سے گذر کر جیپ دیران راستوں پر ہوئی۔ حمید جان بوجھ کر اسے بہت زیادہ ہا ہموار لٹپٹ چلا رہا تھا۔

”یار ہیں بھی کرو۔“ جکد لیش کراہ کر بولا۔ ذرا ہی کی ذہب میں جیپ کے جھکلوں نے اس کی نس مذہبی کردی تھی۔ فریدی خاموش بیٹھا رہا۔ پتہ نہیں وہ نید کی اس حرکت کو جان بوجھ کر نظر ادا کر رہا تھا۔ خیالات میں اس بڑی طرح کھویا ہوا تھا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں ہوا۔

”کیوں....؟“ حمید نے فریدی کو مخاطب کیا۔ ”آپ نے اس کا اندازہ کیے لگایا کہ کوئی اسے نے جارہا تھا۔“

”تم اسی لئے پوچھ رہے ہو ناکہ پڑول کی بو تو اڑ گئی تھی؟“ فریدی نے پوچھا۔

”قطوی!“

”لیکن کافوں کے سوراخوں میں خفیف کی بو باقی رہ گئی تھی اور پھر اس کے بالوں میں ایک دیا ائی بھی بھی ہوئی تھی۔ بہر حال تم چوک گئے۔ اس آدمی کو پکڑنا تھا۔

”پو دیو کا کیا ہوا؟“

”سنو بھی۔“ فریدی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔ ”میا تم بھی ڈر رہے ہو، ربر کا مجسہ ہے۔ میاں حمید بیہو ش ہو گئے ہیں۔“

فریدی کے ہونٹوں پر شرات آمیز مکراہت تھی۔ جکد لیش بھی اس کے قریب پکڑ کر جو زور لگایا ہے تو وہ ”اکھڑ گئے“ کما نعرہ مار کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں تھا یہ مجسہ....؟“ فریدی نے دونوں ہاتھوں سے اس کی گردان دبوچ کر پوچھا۔ ”ارے میں... خس... خس... میں کیا جاؤں۔“

حمدی اس کے ہاتھ جھنک کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”اس سے کام نہیں چلے گا بخوردار....!“ فریدی مکرا کر بولا۔ ”شرارت کے نئے اپناروں مال اسی کے نیچے چھوڑ آئے تھے۔“

”تب تو مجوری ہے۔“ حمید اپنے کان سہلاتا ہوا بولا۔ ”فضول باشیں مت کرو۔“

”میرے ایک دوست نے تحفناکیش کیا ہے۔“ حمید منہ چلاتا ہوا بولا۔ ”تین دن تک سونے نہیں دوں گا۔“ فریدی نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

حمدی نے درویشوں کی طرح ہاتھ اٹھا کر شعر پڑھا۔

”قبر میں جی بھر کے سوتا زندگی کی نیند کیا۔“

”زہر و روا عدم اٹھ اب سوریا ہو گیا۔“

”جی کہتا ہوں! مارتے مارتے سوریا کر دوں گا۔“ فریدی بولا۔ ”راتے میں پڑی ملی تھی۔“ حمید نے لاپرواں سے کہا۔

”غلط کہتے ہو... میرا خیال ہے کوئی اسے جلانے جا رہا تھا۔“

”جی....!“ حمید نوالا ہاتھ سے رکھ کر بولا۔ ”اے جیرت ہوری تھی کہ فریدی اس پر کیوں نکر پہنچا۔ پڑول کی بو بھی اس میں باقی نہیں رہ گئی تھی۔“

”جناب۔“ فریدی نہ سکون آواز میں بولا۔ ”نداق میں مت ٹالو۔... یہ بہت ضروری ہے حمید نے رک رک کر پوڑا واقعہ دھرایا۔ لیکن اس کا ہاتھ اور منہ تیزی سے چل رہے ہے۔

”بھی کہ اس کرے میں ایک ربرا کا مجسم تھا۔“

”تو کیا وہ اُسی کرے میں تھا۔“

”جناب۔“ فریدی سگار سلاکا تاہو بولا۔ ”اُس بڑے صندوق میں وہ مجسمہ ہی لایا گیا تھا۔“

”کہاں سے؟“

”شہر کی ایک جاپانی فرم سے جو کھلونوں کا کاروبار کرتی ہے۔ غالباً پرویز نے باقاعدہ آرڈر کرائے ہوئے تھے اور میر اخیال ہے کہ اس پر کافی پیسہ صرف ہوا ہو گا۔“

”فرم کے متعلق آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“ حمید نے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے کاغذ کا ایک نکلا نکال کر حمید کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر ”جاپانیز چنسل کارپوریشن۔“ چھپا ہوا تھا۔

”یہ پوچھ اُسی صندوق میں ملا تھا۔“ فریدی بولا۔

”بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی ہے۔“ حمید نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”لیکن یہ بھی فی الحال اس عما ہے۔“

”چلو قیاس ہی کیں! لیکن یہ بات تو مانی ہی پڑے گی کہ ابھی تم اسی مجسمے کی شکل کی ایک لاش بچکے ہو۔ اور وہ بھی پرویز کی کوئی کمپنی کے ایک پرہسار کرے میں۔“

”چلے گاں لی میں نے یہ بات.... پھر....؟“

”پھر یہ کہ پرویز کے عجیب و غریب عادات و اطوار۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اچھا صاحب زادے تم نے اُس چھوٹے اور سیاہ رنگ کے صندوق کو بھی دیکھا ہو گا۔ جو ایک بولی کی میز پر رکھا ہوا تھا۔“

”وکھیا تو پوتا ہے۔“

”اُسے بھی دیکھنے کی رحمت گوارا کی تھی تم نے۔“

”نہیں۔“

”اگر تم دیکھتے بھی تو اُس کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے۔“

”میں؟ کیا چیز تھی اس میں۔“

”وکھی بھی نہیں۔“ فریدی نے کہا۔ ”وہ حقیقتاً گراموفون تھا۔“

”ہم اسے ہسپتال بھجو اکر آئے ہیں، اس کی نیند میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔“

اچانک حمید نے بریک لگائی اور جکدیش کا سر اس کی پیٹھ سے نکلا گیا۔

”سنچل کر بیٹھو۔“ حمید نے انہج بنڈ کرتے ہوئے کہا اور نیچے اتر گیا۔

پڑوں کا ٹھیٹ اور چادر بدستور اُسی جگہ موجود تھے جہاں حمید نے انہیں چھپا ہوا تھا۔

پھر وہ انہیں اُس مقام پر لایا جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا۔ فریدی ناٹرچ کی روشنی میں تو جوار کی زمین کا جائزہ لینے لگا۔ ایک جگہ تین چار دیا مسلا نیاں پڑی ہوئی ملیں۔

”غالباً گھبرائہت میں گر گئی ہوں گی۔“ فریدی بولا۔ ”آدمی بہت زیادہ دلیر نہیں ہوتا۔“

زمین سخت تھی اس لئے قدموں کے نشانات دیکھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر فریدی نے اس کے امکانات کو نظر انداز نہیں کیا۔

”تحوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹ رہے تھے۔“

”پرویز کے نوکروں کا کیا ہوا۔“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں! ان کا کیا ہوتا۔“

”بہر حال براچیچیدہ معاملہ ہے۔“ حمید نے کہا۔

”اب نہیں رہ گیا۔“ فریدی بولا۔ ”تحوڑی دیر قبل ضرور تھا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

پھر بقیہ راستہ خاموشی ہی سے طے ہوا۔

گھر پہنچ کر فریدی اور جکدیش نے کھانا کھایا۔ دوران طعام میں جکدیش نے اس کی متعلق کئی بار گفتگو کرنی چاہی لیکن فریدی نے یہ کہہ کر ناٹ دیا کہ وہ خود بھی ابھی معاملہ تو عیت کو بخوبی نہیں سمجھ پایا ہے۔

جکدیش کے چلے جانے کے بعد فریدی نے خود ہی گفتگو چھیڑ دی۔

”اگر یہ ربرا کا نمونہ نہ ملتا ہے بھی ہم اس نتیجے پر ضرور پہنچتے۔“

”کس نتیجے پر۔“ حمید نے پوچھا۔

”گراموفون؟“ حمید نے احتقون کی طرح دھرایا۔
”ہاں گراموفون؟... کیا سمجھے؟“
”گراموفون ہی سمجھا؟“

”ڈیوٹ ہو! آخر اس کمرے میں گراموفون کا کیا کام؟ اور وہ بھی صرف گراموفون
نہ اراد۔ پورے گھر میں ایک بھی ریکارڈ نہ مل سکا۔“
”تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔“ حمید نے کہا۔ ”میرے خیال سے وہ ایک
ہونے کی بنا پر اس کمرے میں ڈال دیا گیا ہو گا۔ وہ کمرہ غالباً اسٹور روم کی حیثیت سے ہے
جاتا ہے۔ کیونکہ نہ تو اس میں الیکٹریک فنگ ہے اور نہ کھڑکیاں وغیرہ۔“
”ٹھیک ہے! لیکن گراموفون کی ان استعمال شدہ سوئوں کے بارے میں کیا کہو گے
میز پر پائی گئی ہیں۔“

”تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ وہ چیزیں۔“
”بہت دریں سمجھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”پرویز وزرات کو ایسا ریکارڈ بجا تھا
صرف چینیں تھیں۔“

”لیکن وہ ریکارڈ۔“
”اس مجسے کی طرح وہ بھی گراموفون سے غائب کروایا گیا۔“
”فریدی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا اور پھر حمید لاکھ کوششوں کے باوجود بھی ان
پر آمادہ نہ کر سکا۔“

وہ کون تھی

دوسری صبح فریدی نے سب سے پہلے اپنال فون کیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ پرویز کی نہ
جاری ہے اور یقین کے ساتھ یہ بتاناد شوار ہے کہ اس کا سلسہ کب فتح ہو گا۔ ہو سکتے
کے لئے سر کے آپریشن کی ضرورت بھی پیش آئے۔
فریدی رسیور رکھ کر کسی سوچ میں ڈوب گیا تھا۔ تھوڑی دری بعد اس نے سر انداز کر

رے کی طرف دیکھا۔ حمید ابھی تک خڑائے لے رہا تھا۔ فریدی نے ہینڈل گھما کر دروازہ کھولا
ری کی پہاڑت تھی کہ سوتے وقت کمرے کو کبھی مقفل نہ کیا جائے۔
”حید...!“ فریدی نے آواز دی۔

”اڑے... ہر... ہر... ہٹ... ٹھ... ٹھ...“ حمید نے بڑا کر کروٹ لی۔
اور پھر فریدی نے چھنجوڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔
”میں مصیبت ہے؟“ حمید حق پھاڑ کر چینا۔
”خیر مجھے کیا۔ میں کہے دیتا ہوں کہ حمید صاحب نہیں ملتا چاہتے۔“ فریدی لاپرواں سے بولا۔
”کس سے...!“ حمید نے زرم لجھ میں پوچھا۔
”ایک لڑکی ڈرائیور روم میں تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“

”لڑکی...!“ حمید نے حیرت سے کہا پھر نہیں پڑا۔ ”مجھے گھس رہے ہیں، بہت اٹھتے۔“
”تمہاری سرضی۔“ فریدی شانوں کو جنبش دے کر جانے کے لئے مڑا۔
”ٹھہریے۔ آپ نے میرے بڑے حسین خواب کا خون کر دیا ہے۔ میں خواب دیکھ رہا تھا
جیسے میں مویشی خانے کا فرشی بنادیا گیا ہوں۔“

”تھے تو اسی قابل۔“ فریدی شفک لجھ میں بولا۔

اور پھر حمید کو یقین کر لیتا پڑا کہ حقیقتاً کوئی لڑکی ڈرائیور روم میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔
اس نے جلدی جلدی شیوں کیا اور بس تبدیل کر کے باہر نکلا تو فریدی کو ناشتے کی میز پر دیکھا جو
نہایت اطمینان سے بیٹھا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔

حمدی کو پھر خیال آیا کہ شاید اس نے اُسے اکو بیٹایا ہے۔ لہذا وہ ڈرائیور روم کی طرف جانے کی
مجاہے سیدھا ناشتے کی میز کی طرف بڑھا۔

”آج موسم خوشنگوار ہے۔“ اس نے اپنے سامنے کی پلیٹ سیدھی کرتے ہوئے کہا۔
”کل بھی خوشنگوار تھا۔“ فریدی بولا۔

”امید ہے کہ پرسوں بھی رہے گا۔“ حمید نے کہا اور کافی اٹھیتے لگا۔

”تو یا تمہیں معلوم ہے کہ وہ چلی گئی۔“ فریدی چوچک کر بولا۔

”تجھے اُنی وقت سے معلوم ہے جس وقت آپ نے اس کی آمد کی خوشخبری سنائی تھی۔“ حمید

لار پر وائی سے بولا۔

”تم شاید مذاق سمجھے ہو۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ لو۔“

اس نے اس کی طرف کاغذ کا ایک ٹکڑا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنا پتہ دے گئی ہے اور کہہ گئی ہے کہ جلدی کی وجہ سے وہ انتظار نہیں کر سکتی۔ حید صاحب کو سچھ دیجیج گا...“ تم اُسے کب سے جانتے ہو۔“

حید نے تحریر پر نظر ڈالی، لیکن مس رعناء سیم کی شخصیت اس کے ذہن کے گوشے میں زابھری۔ سرسری جان پیچان والیوں میں بھی شاید اس نام کی کوئی نہیں تھی۔

پتہ چار بُساولہ۔ دارو والا بلڈنگ تھا۔ اُسے یہ بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے کبھی اُز عمارت ہی میں قدم رکھا ہو۔

”میں نہیں جانتا کہ یہ کون ہے؟“ حید کاغذ پر نظر جائے ہوئے آہستہ سے بولا۔

”بکتے ہو۔“ فریدی نے خونگوار لبجھ میں کہا۔

”آپ کو یقین نہ آئے گا۔“ حید سنجیدگی سے بولا۔ ”لڑکی فراہ معلوم ہوتی ہے، خیر میر دیکھوں گا۔“

فریدی کچھ نہ بولا۔ حید تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کچھ کہے لیکن اس کی مسلسل خاموشی نے خود اُسے ہی بولنے پر مجبور کر دیا۔

”آن کا پروگرام۔“

”کوئی خاص نہیں۔“ فریدی نے بے دلی سے کہا۔

”لکھا آپ اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے ہیں۔“

”قطیعی لے رہا ہوں۔“

”پھر...؟“

”پھر کیا؟ بھی تک کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچا۔“

”اگر میری موجودگی ضروری نہ ہو تو...!“ حید جملہ ختم کئے بغیر ہی خاموش ہو گیا۔

”میں جانتا ہوں کہ وہ تمہاری پرانی شناسا ہے اور تم اُس سے ملنے کے لئے ضرور جاؤ گے۔“

بہر حال میں تمہیں روکتا نہیں۔“

”ٹھکریے....!“ حید نے سعادت مندانہ انداز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد حید کی موڑ سائیکل دارو والا بلڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔ دارو والا بلڈنگ شہر کی مشہور غدار قلعے میں سے تھی۔ اس کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی تیسری منزل پر محلہ خوراک کے دفاتر تھے۔ پہلی دوسری اور چوتھی منزلوں کے قلیٹ رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے اور ان کا کرمائی اتنا زیادہ تھا کہ صرف ذی حصہ تھیں لوگ ہی ان میں رہ سکتے تھے۔

حید چوتھی منزل پر پہنچ کر رسولہ نمبر کے قلیٹ کے سامنے رک گیا، جو مقفل تھا۔ دروازے کی دلائی جا بپس مس رعناء سیم کے نام کی سختی نظر آئی اس کا رہا شاہنہ بھی رعن ہو گیا۔ درستہ راستہ بھروسہ سوچتا آرہا تھا کہ کہیں احمد نہ بننا پڑے۔ وہ فریدی کے مزاد سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب بھی حید اُسے چوٹ دینے کی کوشش کرتا اس کی طرف سے جوابی کارروائی ضرور ہوتی۔ پچھلی رات اُس نے اُسے اُس مجسم کے سلسلے میں یو تو ف بنانے کی کوشش کی تھی لہذا اُسے خدشہ تھا کہ فریدی اُس کا بدله ضرور لے گا۔

حید کھڑا سوچ رہا تھا کہ برابر والے قلیٹ سے ایک لڑکی نکلی اور حید کو وہاں کھڑے دیکھ کر نہک گئی۔ حید نے پہلی ہی نظر میں اس کا پورا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ ایک قبول صورت اور الٹا موڑن قسم کی لڑکی تھی۔ عمر اخبارہ انہیں بے لگ بھگ رہی ہو گی۔ نیلے اسکرٹ میں وہ کافی حسین گل رہی تھی۔

حید نے اپنی قلقت ہیٹھ اتاری اور مودبانہ انداز میں بولا۔

”کیا آپ مس رعناء سیم کے متعلق کچھ بتا سکیں گی۔“

لڑکی نے تحریر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”آپ ظہریے۔ میں انہیں بلاۓ دیتی ہوں۔ غالباً چلکی منزل میں ہوں گی۔“

حید اُس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک گرائیلیل قسم کے اوہیز آدمی کیسا تھا وابس آئی۔ پھر وہ تو اپنے قلیٹ میں چل گئی اور وہ آدمی کھڑا حید کو گھوڑا تارہ۔ اس نے خاکی گبرڈن کے چلکوں پر چوڑی دھاریوں والی بنیا میں پہن رکھی تھی۔ حید نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ نئے میں ہے۔

”کیوں.... بنیا؟“ وہ بھاری بھر کم آواز میں غرایا۔

”لیا مطلب....!“ حید کی بھنوں تن گئیں۔

”ڈھمپ کلک! مطلب پوچھتے ہو۔“ اُس نے ہنس کر کہا۔ ”کہاں ہے لوٹیا؟“
”ہوش میں ہو یا نہیں۔“ حمید کو غصہ آگیا۔

”لوٹیا کہاں ہے؟ مارتے مارتے ڈھمپ کلک بنا دوں گا۔ بتاؤ لوٹیا کہاں ہے ڈھمپ کلک۔“
”شش اپ...!“

”شش اپ سے کام نہیں چلے گا ڈھمپ کلک۔ کل رات وہ تمہارے ہی ساتھ گئی تم
ڈھمپ کلک اب راجھانے آئے ہو۔ بتاؤ ورنہ بھیجا پھاڑدوں گا۔“

حمدی چکر آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ برابر والے فلیٹ میں دستک وے یا اُسی۔
البھار ہے۔ اُسے ساتھ لانے والی اتنی بے تکلفی سے اپنے فلیٹ میں چلی گئی تھی جیسے تھوڑی
قبل اُس سے اور حمید سے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

”میں رعنائیم کے متعلق پوچھ رہا تھا۔“ حمید نے زمی سے کہا۔

”اور نہیں تو کیا میں اُس کی ماں کے بارے میں کہہ رہا ہوں ڈھمپ کلک! بتاؤ لوٹیا کہاں ہے
ہوں۔“ حمید اور پری ہونٹ بھیچ کر بولا۔ ”ادری ڈھمپ کلک کیا ہے۔“

”ڈھمپ کلک ہے۔ بتاؤ لوٹیا کہاں ہے۔“

اس بار حمید کی زبان نہیں چلی بلکہ ہاتھ چلا۔ وہ نشے میں تو تھا ہی۔ تھیڑ کا بارہ نہ سنجال،
لکھرایا تو پیچہ کھڑکی سے جاگی۔ کھڑکی شاہزادر سے بند نہیں تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھل،
اور توازن برقرار رکھ سکنے کی بناء پر اس کی کردہ بھری ہو گئی۔ اس کے منہ سے ایک کرپہ
ٹکلی اور وہ دونوں ہاتھوں سے کر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس پر سے حمید نے ایک ٹھوکر بھی جزوی۔
لیکن دوسرا الحج ایسا نہیں تھا کہ اُسے اس آدمی کی طرف دھیان دینے کا موقعہ ملتا ہو۔ بیٹھا
رہا تھا اور ارد گرد کے فلیٹوں سے لوگ نکلنے لگے تھے۔

حمدی کی نظریں کھڑکی سے گزرا کر کرے کے اندر لگی ہوئی ایک بڑی تصویر پر جم گئیں۔
سو فیصدی اسی عورت کی تصویر تھی جس کی لاش وہ پچھلی رات کو پرویز کے یہاں دیکھے چکا تھا۔
نے پھر ایک اچھی سی نظر ان لوگوں پر ڈالی جو فلیٹوں سے نکل کر بالکنی میں جمع ہو رہے تھے۔
اسکرت والی لڑکی چوت کھانے ہوئے آدمی کو فرش سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جد
اُس بات پر بڑی حرمت ہو رہی تھی کہ فلیٹ والوں نے یہ تک جانے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

ذکریا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہیں چوت کھانے والے سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہ ہو۔
”سالے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ڈھمپ کلک۔“ وہ پھر اٹھ کر حمید کی طرف چھپتا۔ لیکن اس
حید کی ٹانگ چل گئی اور اُسے خود می اعتراف کرنا پڑا کہ اس نے اس سے پہلے کبھی اتنی شاندار
اس (قابض) فارسی میں ”چپ راست“ نہیں ماری تھی۔ وہ پھر ڈھیر ہو گیا اور اس بار اس کا سر
ارسے نکرا گیا۔ وہ بیہو ش ہو گیا تھا۔

نیلے رنگ کے اسکرت والی لڑکی پھر نیچے کی طرف جانے لگی۔

”میرہو۔“ حمید نے اُسے مخاطب کیا۔ ”اوھر چلو! تم نیچے نہیں جا سکتیں۔“

”یکوں؟“ وہ پلٹ کر حمید کو گھوڑنے لگی۔

”اپنے فلیٹ میں جاؤ۔“ حمید تھکمانہ بجھ میں بولा۔

”نہیں جاتی.... تم کون ہو۔ میں ابھی پولیس کو اطلاع دیتی ہوں۔“

”میں پولیس کا باپ ہوں.... اندر جاؤ۔“

لڑکی نے تمباخیوں کی طرف دیکھا لیکن ان میں سے کسی نے بھی اپنی جگہ سے جبکش تک نہ کی۔
معاملات آہستہ آہستہ حمید کی سمجھ میں آتے جارہے تھے۔

”لوکی..... مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ میں تمہیں اچھی طرح پیچانا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں
یہ شریف آدمی تھا ری طرف داری کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ اندر جاؤ۔“

بیہو ش آدمی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا کسی نے یہ بھی دیکھنے کی زحمت گوارانہ کی کہ وہ زندہ
ہے یا مر گیا۔ دغنا حمید نے آگے بڑھ کر اس لڑکی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اس کے فلیٹ میں دھکیل کر
روازہ باہر سے بند کر لیا۔

”آپ کون ہیں؟“ تمباخیوں میں سے ایک نے پوچھا۔

”سرکاری آدمی۔“ حمید آہستہ سے بولا۔ ”ذر اوھر آئیے۔“

حمدی رعنائیم کے فلیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس آدمی کے قریب پہنچے
کیا اُس نے تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”ورعنائیم ہی ہے۔“

”تکہاں!“ اُس نے سر ہلا کر کہا اور حمید کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔

”اس کار عناء سے کیا تعلق ہے۔“ حمید نے بیویش آدمی کی طرف اشارہ کیا۔
”تعلق! کیا بتاؤ۔“ اس نے کہا۔ ان سب نے مل کر ہماری زندگی تیکر کر کھی ہے
ہی کیا آپ نے جو مار تھا کو نیچے نہیں جانے دیا ورنہ وہ اس کے ساتھیوں کو بلالاتی۔“

”ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بھی لڑکی بیہاں ایسی ہے۔“

”نہیں..... صرف یہی دونوں.... اور یہ تائیگر۔“ اس نے بیویش آدمی کی طرف
کر کے کہا۔ ”ایک خطرناک تمہارا غنڈہ ہے۔ ان دونوں سے پیشہ کراتا ہے۔“

”کیا اس کا نام تائیگر ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”نام کوئی نہیں جانتے وہ خود کو فخریہ تائیگر کہتا ہے اور امریکی ڈاکوؤں کی طرح کالباس پہنتا ہے
”ہوں.... بیہاں کہیں قریب فون ہے۔“

”جی ہاں.... میرے فلیٹ میں۔“ تماشا یوں میں سے ایک نے کہا۔ ”میرے ساتھ آئیے

”آپ لوگوں نے پولیس کو اس کی اطلاع کیوں نہیں دی۔“ حمید نے اس سے پوچھا۔

”اپنی شامت بلواتے یہ اور اس کے ساتھی ہمیں زندہ نہ رہنے دیتے۔ معاف کیجیے گا پرا

”خود اس سے پیسے کھاتی ہے۔“

”تھوڑی دیر بعد حمید اسپکٹر جگدیش کو فون کر رہا تھا۔

”بیلو... اسپکٹر جگدیش.... میں حمید بول رہا ہوں.... مقتولہ کی زہائش کا پتہ چل گیا،
والا بلڈنگ کی چوخی منزل پر فوراً پہنچو۔“

حمید سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی کو مقتولہ کا ٹھکانہ کیسے معلوم ہو۔ اُسے اس کے نام کا
کیوں نکر ہوا۔ یہ بات تو اس کی سمجھی میں اچھی طرح آگئی تھی کہ اس وقت فریدی نے دراصل ا

سے پچھلی رات والی شرارتوں کا بدلہ لیا تھا۔

”اس غنڈے کے دوسرا ساتھی کہاں ہوں گے۔“ حمید نے ایک سے پوچھا۔

”نیچے پہلے مالے میں فرینڈز ہوٹل جو ہے نا۔ وہ اسی سالے کا ہے اور اس کے ساتھی ہوئے ہیں۔“

دارو والا بلڈنگ سے کو تو ای زیادہ دور نہیں تھی اس لئے جگدیش کو وہاں پہنچنے میں درینہ الی

”فریدی صاحب کہاں ہیں۔“ جگدیش نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ حمید بولا۔ ”سب سے پہلے ان غنڈوں کو پکڑتا ہے۔“

فیکر والوں کی شاخت پر تائیگر اور اس کے ساتھیوں کو حرast میں لے لیا گیا۔ تائیگر کو
بیویش آدمی تھا اور وہ بوکھلائی ہوئی نظریوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ نیلے اسکرٹ والی مار تھا
بھی حرast میں لے لی گئی۔ یہ بات تو ظاہر ہی ہو چکی تھی کہ وہ لوگ ان لڑکیوں سے پیشہ کرتے
تھے لہذا حمید نے ان سے رعناء کے متعلق پوچھ چکھ شروع کی۔

”تم نے یہ کیسے اندازہ لگایا تھا کہ کل رات کو رعناء جس کے ساتھ تھی وہ میں ہی تھا۔“ حمید
نے مار تھا کو مخاطب کیا۔

”میں نے اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔“ مار تھانے آہستہ سے کہا۔ ”لیکن اس نے سوت
ای تم کا پہنچ رکھا تھا۔“

”لیا وہ بیہاں آیا تھا؟“
”نہیں۔“

”پھر تم نے انہیں کہاں دیکھا تھا۔“
”اُگر لکھ جو میں۔“

”تو تم نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا۔“
”نہیں۔“

”بیہاں اُس کے پاس کون کون آتا تھا۔“

”بیہاں کوئی نہیں آتا۔“ مار تھانے کہا اور سر جھکا لیا۔

”وسائی گر لزو والارو یہ ہو گا ان کا۔“ جگدیش مسکرا کر بولا۔

”کچھ ایسے آدمیوں کے متعلق بتا سکتی ہو جن کے ساتھ تم نے اُسے کبھی دیکھا ہو گا۔“
”یہ بتانا مشکل ہے۔ ہم دونوں کبھی ساتھ نہیں رہے۔“

”کیا تم جانتی ہو کہ کسی نے اُسے پچھلی رات کو قتل کر دیا؟“

”کیا...؟“ مار تھائی اٹھی۔ اس کی آنکھیں خوف اور حیرت سے پھیل گئیں تھیں۔

”صاحب ہم بے قصور ہیں۔“ تائیگر ہاتھ جوڑ کر گڑا گڑا۔ اس کے چہرے پر بھی ہو ایسا
رانے لگی تھیں۔

کے چار سلکیا اور حمید کے چہرے پر نظریں جاتا ہوا بولا۔ ”بک چلو۔“
”بک بک بک بک۔“ حمید نے ٹھنڈا شروع کر دیا اس حرکت میں جھنجھلاہٹ بھی شامل تھی۔
فریدی نہیں پڑا۔

”میں کہتا ہوں اگر میں پٹ جاتا تو۔“ حمید پٹ پڑا۔
”آئندہ کے لئے سعادت مند ہو جاتے اور کیا۔“

حمید نے سوچا کہ زیادہ بات بڑھانا مناسب نہیں آخر اسے اپنی کارگزاریوں کی وحشی بھی تو
انی تھی۔

”آپ کو اس کا نام اور پتہ کیسے معلوم ہوا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”اس کے ملائی کارڈ سے، جو اس کے پس سے برآمد ہوا تھا۔“

”رات آپ نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”کیوں؟“

”یونہی....!“

”اس تصویر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔“ حمید نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر
یہی کے سامنے ڈال دی۔ یہ اُسی تلاشی کے دوران میں ملی تھی۔

”معاملہ بالکل صاف ہو گیا۔“ فریدی آہستہ سے بڑھ لیا۔

اس تصویر کے متعلق حمید نے بھی کچھ سوچا تھا لہذا وہ فریدی کی رائے معلوم کرنے کے
لئے بھیں ہو گیا۔

”اور یہ کہ وہ ایک پیشہ و قسم کی سوسائٹی گرل تھی۔“ حمید نے کہا اور پوری رو داد دہرا دی۔
فریدی خاموش ہو گیا۔ اس کا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ دفتار وہ
نامختر نظرؤں سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

”اس نے ان دونوں کو آر لگپو میں کس وقت دیکھا تھا؟“ فریدی نے پوچھا۔

”ماڑھے چھو اور سات کے درمیان۔“

”ٹھیک۔“ فریدی پھر سوچ میں پڑ گیا۔

”میر تھوڑی دیر تک خاموش رہا لیکن پھر فریدی کی خاموشی برداشت سے باہر ہو گئی۔“

حمدی رعناء سیم کے فلیٹ کی تلاشی لینے کے متعلق سوچنے لگا۔

ایک تصویر

واپسی پر حمید کا سینہ فخر سے بچو لا ہوا تھا۔ پوری نیکو میں قدم رکھتے ہی اُس نے انگریزی میں سیئی بجائی شروع کر دی۔ تلاشی کے دوران میں اس نے چند ایسی چیزوں دریافت کی تھیں کہ اس کی نظرؤں میں بڑی اہمیت تھی۔

نوکروں سے معلوم ہوا کہ فریدی تجربہ گاہ میں ہے۔ حمید بڑی شان سے زینے طے کر اور پری منزل پر پہنچا۔ فریدی شٹ ٹوب میں کوئی سیال نہ ڈالے ہوئے اسپرٹ لیپ کی گریش دے رہا تھا۔ حمید کی آہستہ پر اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور پھر مشغول ہو گیا۔ حمید تھوڑی دیر تک خاموش رہا لیکن جب فریدی اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ خود تھی!

”رعنا سیم آپ کے حسن کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم کوئی حاصلت کر کے آئے ہو۔“ فریدی بدستور سر جھکائے ہوئے ہے
”جی ہاں! میں نے آس سے آپ کی شادی طے کر دی ہے۔“

”شکریہ۔“ فریدی لاپرواپی سے بولا اور پھر شٹ ٹوب کو اسپرٹ لیپ سے ہٹا کر آنکھ
کے قریب لے جاتا ہوا بڑھ لیا۔ ”یہ ذرات تخلیل نہیں ہو سکتے۔“

”خواہ میری کھوپڑی تخلیل ہو کر دریائے نربرا ہو جائے۔“ حمید اپنا اوپری ہونٹ بھج
بولा۔

”کیا مضاائقہ ہے؟ لیکن یہ ذرات۔“

”میں کہتا ہوں آخر اس طرح اکو بنانے کی کیا ضرورت تھی۔“ حمید جھنجھلا کر بولا۔

”محض اس لئے کہ میں تمہیں انگلی پکڑ کر نہیں چلانا چاہتا۔“

”نہیں بلکہ گردن پکڑ کر دھکا دینا چاہتا ہوں۔“ حمید نے منہ بنا کر کہا۔

”سنوا! اس کیس کو تمہیں ہی نہیں لانا چاہے۔ میں آج کل بہت مشغول ہوں۔“ فریدی نے
شٹ ٹوب کی سیال نے ایک برتن میں اٹھیل دی۔ پھر اس نے رومال سے دونوں ہاتھوں

”ابھی آپ نے کہا تھا کہ معاملہ صاف ہو گیا۔“

”اوی!“ فریدی نے چونکہ کراں گڑائی میں اور حمید کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔
”معاملہ قطعی صاف ہو گیا۔ پرویز حق تھا وہاں اس عورت کی موجودگی سے لام
نے اسی ربر کے بھجے کے دھوکے میں اس کی گردان دبادی۔“
”کیا پرویز کو ہوش آگیا۔“ حمید نے پوچھا۔
”نہیں۔“

”پھر آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں۔“

”اس سلسلے میں جتنے بھی واقعات پیش آئے ہیں انہیں سمجھا کر کے ترتیب دے لواد
کی چھپلی زندگی اور اسکے عادات و اطوار کی روشنی میں ان کا جائزہ لو۔ بات سمجھ میں آجا۔
”مجھے ان لوگوں کے بیان پر شبہ ہے۔“ حمید بولا۔

”کیوں؟“

”مجھے وہ بھی اس سازش میں شریک معلوم ہوتے ہیں۔“
”کیا تم قتل کے مقصد سے واقف ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں؟“

”پھر تم نے لفظ سازش کیسے استعمال کیا۔“

”میرا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی پرویز سے ملے ہوئے ہیں۔“

”غلط سمجھے..... یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب یا ان میں سے کوئی اُس آدمی سے تعلق ر
کی وجہ سے یہ حادثہ رونما ہو۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

”یہ قتل پرویز سے نادانشگی میں کرایا گیا ہے۔“

”کس طرح؟“

”جس طرح تمہاری کھوپڑی الٹ گئی ہے۔“ فریدی جھنجلا کر بولا۔ ”میں جانتا ہو
وقت تمہارا ذہن اس عورت میں الجھا ہوا ہے جسے پولیس کے پرورد کر آئے ہو۔“
”اس سے میں بہت بڑے بڑے کام لینے کارادا رکھتا ہوں۔“ حمید اکٹھ کر بولا۔

”بیویت۔“ فریدی تجوہ بگاہ سے نکل کر نیچے چلا گیا۔ حمید نے منہ بنا کر اپنے شانے سکوٹے
ہمیں اُس کے پیچے چل پڑا۔

فریدی ابھی زیسوں ہی پر تھا کہ باہر کی سختی بھی۔ شاید کوئی ملا تھا۔ وہ کچھ دیر میں میں کھڑا
ہیں جب کوئی کسی کا ملا تھا کیا راڑے کے اندر نہ آیا تو وہ خود ہی ڈر انگ روم کی طرف بڑھا۔
وہ الا شاید اُسی کے بھجے سے تعلق رکھتا تھا ایسے لوگوں کے لئے ملا تھا کہ روم کی رسمی قید نہیں
وہ عموماً سختی استعمال کرنے کے بعد ڈر انگ روم میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتے تھے۔

حمد برآمدے ہی میں تھا کہ فریدی ڈر انگ روم سے واپس آگیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک
چال۔

”کچھ نہیں.... فضول.... میں پہلے ہی سمجھا تھا۔“ وہ کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے بڑھا لیا
”لیا....!“

”ٹکر پرنٹ والوں کی روپورٹ ہے۔ پڑول کے مٹن پر تمہاری الگیوں کے نشانات کے علاوہ
لگنہ نہیں ملا۔“

”اس نے دستانے پہنچ رکھے ہوں گے؟“

”ہاں کافی ہو شیار آدمی معلوم ہوتا ہے۔“

”ہو گا.... اُس معاملے کو بھی تو صاف کیجئے۔“ حمید اکٹھ کر بولا۔

فریدی تھوڑی دیر تک اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔

”پرویز نے اس عورت کی نقل کیوں تیار کرائی تھی۔“

”بدختنی تھی سالے کی۔“ حمید نے بھنا کر کہا۔

”اور جیخوں والا ریکارڈ کیوں بنوایا تھا۔“ فریدی رو میں بولتا رہا۔ ”اس کی شخصیت اتنی نہ اسرار
ساتھی؟ وہ دنیا سے بے تعلق اُس عمارت میں کیوں بذریحتا تھا؟ اس کے اندر رفتہ پسنداد
نات کیوں پیدا ہوئے تھے؟“

”حید خا موش رہا۔“

”اس نے دو ماہ قبل جیلانیز مرچنٹس کا پوریشن کے ذریعہ ایک ایسا مجسمہ تیار کرایا، جو ایک
رست کی نقل تھا ایک ایسا ریکارڈ تیار کرایا جس میں صرف جنین تھیں۔ کل رات اُسے اس

وزارہ ہرے میں اس عورت کو مجسمہ ہی سمجھ کر اس کا گلا گھونٹنے لگا ہو۔
”بھلائی کا گلا گھونٹنے سے کیا مراد؟“ حمید نے اُسے ٹوکا۔

”تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ گراموفون پر جیسوں کاریکارڈ لگا کر اس مجسمے کی پوچا کرتا رہا ہو گا۔ کیا نہیں تو کروں کا بیان یاد نہیں۔ کیا پرویز کی ان حرکتوں کا علم نہیں جو وہ تنہے پرندوں کا چھوڑ لہریوں اور جیلوں کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ کیا تم اس کا مطلب بتائے ہو کہ وہ نہ پرندوں کو چھوڑ رہا ہے پرندوں ہی کو کیوں اذیت دیتا تھا.... بہر حال“ وہ تھوڑی دیر رک کر پھر بولا۔ ”میں سنتے پر پہنچا ہوں کہ اگر وہ عورت اُسے روز روشن میں کہیں مل جاتی تو وہ اُسے زندہ نہ چھوڑتا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ.....!“

”قطعی! میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اُس سے یہ قتل نادانستکی میں سرزد ہوں۔“

”آخر وہ کون ہو سکتی ہے۔“ حمید بڑا بولایا۔

”عورت.... عورت.... عورت۔“ فریدی دانت پیس کر بولاتے۔

حمدی اُسے حیرت سے دیکھنے لگا۔

”یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے پہچا چھڑانا محال ہے؟ یہ صرف انہیں نجات میں تم پر جان دیتی ہے جب تم نے اُس کے جذبات ابھار دیئے ہوں اور اس کے علاوہ وہ صرف ماں بن سکتی ہے، بہن بن سکتی ہے اور بیٹی بن کر وفادار رہ سکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھا؟“ حمید بڑا کر بولا۔

”کچھ نہیں میں نے ایک غیر متعلق بات شروع کر دی تھی۔ ویسے مختصر آیہ کہ رعناء بھی نہ کبھی پرویز کی بیوی ضرورتی ہو گی۔“

”بیوی!“ حمید تقریباً جیچ پڑا۔

”قیاس ہے۔ فی الحال میرے پاس اس کا واضح ثبوت نہیں۔“

”اگر وہ اس کی بیوی تھی تو میں بیویوں کے مستقبل سے مایوس ہوں۔“

”بیوی!“ فریدی نے خیال انداز میں بڑا بولایا۔ ”شٹ اپ.... اس لفظ کو بار بار نہ دھراو۔“

”کیا کافن اور کافور دکھائی دیئے گلتا ہے آپ کو۔“ حمید بہن پڑا۔

”فریدی پھر کسی خیال میں ڈوب گیا۔“

کمرے میں مجسمے کی بجائے اُس عورت کی لاش ملی جس کی نقل وہ مجسمہ تھا۔ پھر تم نے کہ کی آدمی کو دیکھا، جو اس مجسمے کو جلانے کی کوشش کر رہا تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ کل رات اس جگہ اس کی ہم خلک عورت نے لے لی تھی۔ آخر پرویز نے اُسے مار کیوں ڈالا؟ اور اغترہ کے ساتھ ہی ساتھ اپنی بے گناہی کیوں ثابت کرتا رہا۔“

فریدی خاموش ہو کر حمید کی طرف دیکھنے لگا پھر آہستہ سے بولا۔ ”مر چنس کار پورا! منتظم نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ مجسمہ خاص طور سے آرڈر دے کر بنا یا گیا تھا اس لئے پرویز نے اس عورت کی پوری تصویر دی تھی ساتھ ہی ریکارڈ کا آرڈر بھی۔“

”چلنے میں سمجھ گیا کہ وہ مجسمہ بنا یا گیا تھا؟“ حمید نے کہا۔ ”لیکن میں اس پر کیسے لفڑ کہ پرویز نے اُسے نادانستکی میں مار دا لا۔“

”اس کی بھی وجہ ہے تم اس کے علاوہ اور کچھ نہیں سمجھ سکتے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ تم اس نقاب کو کیوں بھول گئے۔ چلو خیر اسے بھی جانے دو۔ پرویز نے اگر اسے جان مار ڈالا تھا تو اس نے کیوں لگادیا اس کے لئے کافی موقع تھا ظاہر ہے رات بھر بھی اس کرے میں بند رہتا تو کسی نوکر کی ہمت اس کے قریب آنے کی نہ پڑتی اُس کرے ہی سے خائف تھے۔

”نہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”میں اس نقاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس نقاب ہی کی رہا ہوں کہ پرویز نے اُسے جان بوجھ کر قتل کیا تھا اور اسے ٹھکانے لگادینے کی کوشش اُس نے اُسے مار ڈالنے کے بعد خود ہی نقاب لگائی مگر نہیں.... اگر یہ بات تھی تو وہ کرے کس طرح پہنچی تھی۔“

فریدی نے قہقهہ لگایا۔ ”بس بوجھ لے گئے۔ چلو سنوا! تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت اُس نے اُسے جان بوجھ کریا اپنے ہوش میں قتل کیا۔ ہو سکتا ہے کہ میری تھیوری غلط ہو نے امکانات ہی کی روشنی میں اُسے مرتب کیا ہے۔ میری دانت میں کسی شخص نے، جو اس کے معمولات سے اچھی طرح واقف تھا اس عورت کو نقاب کے راستے کرے میں اُسے وہیں ٹھہرنے کی تاکید کر کے وہ ریکارڈ اور مجسمہ وہاں سے نکال لے گیا اور ہو سکتا۔ نے وہاں دیا مسلمانی اور موم بیتی بھی غائب کروی ہو۔ اس کے جانے کے بعد پرویز اندر وا

پویں کے حوالے کر آیا ہے۔ ان دونوں اس کی زندگی کچھ خنک سی گذر رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ تنشیں ہی کے بہانے اس سے تھوڑے بہت تعلقات پیدا کر لیتا تو یہ پہلے دن اور اجازتی رات میں اتنی گراں نہ گزر تھیں وہ سوچتا رہا اور فریڈی بولتا رہا۔ ”پرویز کی نیند کا سلسلہ شاید ابھی ختم نہ ہو۔ سالہاں سال کی بے خوابی کا شکار ہے، ہن کچھ دن آرام ضرور کرے گا جس خلش نے اُسے نیند سے محروم کر دیا تھا وہ رفع ہو گئی۔“

”کون سی خلش؟“ حمید چوک کر بے خیالی میں بولا۔

”خلش کہ حمید کی موت فریڈی کے ہاتھوں واقع ہو گی۔“ فریڈی نے اوپری ہونٹ بھیج کر کہا۔ ”آخر آپ آج کامنے کو کیوں دوڑ رہے ہیں۔“

”تمہیں یہاں آنے کی بجائے آر لکھو میں جانا چاہئے تھا، ممکن ہے کہ وہ دونوں دہاں روز جاتے رہے ہوں۔“

”میں کہتا ہوں سید حارستہ اختیار کیجئے۔“ حمید نے کہا۔ ”پرویز کے فوکروں میں سے کوئی اس آدمی کو ضرور جانتا ہو گا۔ کیونکہ پرویز کا کوئی توکری اُسے پرویز کے معمولات سے باخبر کر سکتا ہے۔“ ”مجھے یقین ہے کہ وہ سب اس سے لاعلم ہیں۔“ فریڈی کے لمحے میں خود اعتمادی تھی۔

دوسرا پا گل

تین دن گذر گئے۔ لیکن پرویز کی حالت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ پھر بھی ڈاکٹروں کو واقع تھی کہ وہ خود ہی کسی وقت ہوش میں آجائے گا۔

اس دوران میں فریڈی اور حمید دونوں بے حد مشغول رہے۔ حمید نے اپنے شہبے کے مطابق پرویز کے فوکروں کو ہر طرح ہلاکیا جلایا لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ آر لکھو کی تحقیقات میں بھی مایوسی ہی کامنہ دیکھنا پڑا۔ اس سے فریڈی نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رعناء اور وہ گم نام آدمی روزانہ کے گاہوں میں سے نہیں تھے۔ فریڈی پرویز کے کاغذات میں بھی الجھارہ۔ یہ بھی تو دیکھنا قابل ک آخر پرویز کون ہے۔ اس کا ذریعہ آمدی کیا ہے؟ اس کے دوسرے اعزہ بھی ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ حمید اس کی صرفوفیات میں مغل نہ ہوا اور نہ ہی اس نے اس سے بھی دریافت کیا کہ اسے

”نہ آپ شادی کرتے ہیں اور وہ دوسروں ہی کو شادی شدہ دیکھ سکتے ہیں۔“ حمید نے چکلی کا ”میں نہیں چاہتا کہ تمہارا محبوب تین موضوع گفتگو دیر مک جاری رہے۔“ اس نے کہ چند لمحے اپنا خلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کچھ سوچتا رہا پھر آہستہ سے بولا۔ ”بہر حال وہ بھی دھوکے ہی میں ماری گئی۔“

”کیوں؟“

”تم شاید کچھ اور سوچ رہے ہو۔“ فریڈی مسکرا کر بولا۔ ”وہہاں مرنے کی نیت سے تو نہ آئی ہو گد“ ظاہر ہے۔“

”میرا تو خیال ہے کہ پرویز یہ جانتا ہی نہ رہا ہو گا کہ وہ بھی اسی شہر میں مقیم ہے۔“ فریڈی بجا ہوا سگار سلاک کر کہا۔ ”تم بالکل اکو ہو! تم نے مجھے فون کیوں نہیں کیا۔ اُس دوسرا لڑکا حرast میں نہ لینا تھا۔“

”کیوں....؟“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہزاروں طیے تھے۔ خیر جو کچھ بھی ہوا بہتر ہی ہو۔ اب کیا کرنا ہے؟“ وہ سوالیہ نظر وہ حمید کو دیکھنے لگا۔

”غالباً پرویز کی بیوی شی رفع ہونے کا انتظار ہی بہتر رہے گا۔“ حمید بولا۔

”مہمل۔“ فریڈی بڑا بڑا۔ ”اس سے کیا ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اپنا اور اس عورت کا ظاہر کروے گا۔ اس آدمی کے متعلق شاید وہ بھی کچھ نہ بتا سکے جو اس قتل کا باعث بتا ہے۔“

”کیوں؟“

”پھر وہی کیوں؟“ فریڈی جھنجلا گیا۔ ”تم آدمی ہو یا کسی کی نقل۔ یا اپنون کھار کھی ہے اس آدمی کو یہ یقین ہوتا کہ پرویز کی شخصیت پر رہشی ڈال سکے گا تو وہ ایسی حرکت ہی نہ کرتا۔“ حمید کچھ نہ بولا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریڈی کہنا کیا چاہتا ہے۔

”اب ہمیں یہ دیکھا ہے کہ اس نے اس عورت کو پرویز ہی کے ہاتھوں کیوں قتل کر لیا فریڈی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”ضرور دیکھئے۔“ حمید نے بے دلی سے کہا۔ وہ حقیقتاً اس لڑکی کے متعلق سوچنے لگا تھا۔

کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ دارواں والا بندگ کے غنڈے مار تھا سب
ضمانت پر رہا ہو گئے تھے اور حمید مار تھا کے ساتھ مصروف تقیش تھا۔ فریدی نے بھی اس طرز
دھیان نہیں دیا۔

آج بھی حمید نے پہلے ہی سے کوئی خاص قسم کا پروگرام بنارکھا تھا لہذا جب فریدی نے از
اپے ساتھ چلنے کو کہا تو وہ چھیل گیا۔

”میں کہیں نہیں جا سکتا! خواہ خواہ مجھے بورنہ کیجئے۔ میں پرویز والے معاملے میں الجھا ہوں ہوں،“
”اسی سلسلے میں تمہیں تکلیف دی جائی ہے۔“ فریدی بولا۔

”کیوں آپ نے تو کہا تھا کہ میں کسی دوسرا سے معاملے میں مصروف ہوں۔“
”فی الحال میں نے اُسے متوڑی کر دیا ہے۔“

”لیکن میں دوسرا پروگرام بنانچا ہوں۔“
”شتاپ....!“ فریدی بگزر کر بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم آج کل اسی بہانے کس قسم
پروگرام بنارہے ہو۔ تم کل رات بھی مار تھا کے ساتھ آر لچو میں رقص کر رہے تھے۔“

”تو پھر....!“ حمید نے آنکھیں نکال کر کہلہا۔ ”میں اس کی پوچھا کر کے تو مجرم تک پہنچ نہیں سکتا
چلو کپڑے پہنو۔“ فریدی نے اُسے اس کے کمرے کی طرف دھکیلے ہوئے کہا۔

”خوڑی دیز بعد فریدی کی کیڈیا لک کپاؤٹ سے سڑک پر نکل رہی تھی۔
اب تو بتا دیجئے کہ ہمیں کہاں جاتا ہے۔“ حمید بے بسی سے بولا۔

”سعید آباد۔“
”کیا....؟“ حمید اچھل کر بولا۔
”کیوں کوئی خاص بات۔“

”کون سا سعید آباد۔“ حمید نے پھر پوچھا۔
”تو کیا اس صوبے میں کئی سعید آباد ہیں۔“ فریدی خنک لبجھ میں بولا۔

”جانتے ہیں آپ کتنی دور ہے سعید آباد۔“
”امہاسی میں۔“

”اس بھاگ دوڑ کا مطلب۔“

”پرویز کے سلسلہ نسب کا پتہ چل گیا ہے۔“

”جو غالباً عوج بن عنان سے ملتا ہوگا۔“ حمید نے بیزاری سے کہا۔
”وہ سعید آباد کے ایک ریس کا لڑکا ہے۔“

”کیسے معلوم ہوا۔“

”پرویز کے کاغذات سے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اس کا سوتیلا بھائی اب بھی غالباً سعید آباد ہی
ارہتا ہے۔“

”سوچیلا بھائی؟“ حمید چوک کر بولا۔

”ہاں.... لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمارا شکار وہی ہو۔ دیسے ظاہر اس حادثے کا مقصد یہی
ملتا ہے کہ پرویز کی دولت ہتھیاری جائے۔“

”کیوں؟ یہ کس طرح؟“

”یہ اس طرح کہ اگر اس شخص کا پتہ نہیں گلت تو پرویز کا راستہ چنانی کے تختے تک بالکل
فہمی۔“
”اوہ....!“

”لیکن یہ بات پھر بھی صاف نہیں ہوئی کہ اس نہیں اس امر اور آدمی کو پرویز کے معاملات کا علم
گر ہو۔“

حمدید کچھ نہ بولا۔

تمن کھٹے بعد وہ سعید آباد پہنچ گئے۔ دن ڈھل رہا تھا اور اس چھوٹے سے شہر پر اصلاحیں
ری ہو تا جارہا تھا۔ سرور لاج تک پہنچنے میں انہیں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ یہ پتھر کی سلوں سے
لگا ہوئی ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کے سامنے ایک کشادہ پائیں باعث تھا۔ باعث کی چہار
ویاری جدید طرز کی تھی۔

فریدی کی کیڈی چھاک سے گذرتی ہوئی پوری ٹیکو میں جا کر رک گئی۔

حمدید کی نظریں جو ہر چیز کا مفعکہ خیز پہلو علاش کر لینے میں کافی مشاق تھیں یہاں بھی محروم
ہو گئی۔ اس نے برآمدے میں ایک عجیب الخلقت آدمی دیکھا۔ یہ تھا تو نوجوان العمر ہی لیکن
کوئی اپنا حلیرے بڑا مفعکہ خیز بار کھا تھا۔ اگر ڈھنگ سے ہوتا تو اس کی شخصیت یقیناً جاذب توجہ

فریدی۔ ”فریدی نے مکار کر قدرے جھکتے ہوئے صحیح کی۔ تعریف رکھئے۔“ بیگم نے پھر حمید کے کافوں میں شربت کی پیپکاری لگائی۔ اب دودھ بہہ گیا؟“ تویر نے بچوں کی طرح اُس سے پوچھا۔ نہیں بہا؟“ وہ جھنجلا کر بولی۔

میں پروڈری صاحب کے متعلق کچھ پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ پروڈری جھانی؟“ مزرت تویر چونک پڑی۔“ ہاں ہاں فرمائیے۔“ اپنیں ایک حادثہ پیش آگیا ہے؟“ مب اور کہاں؟“ عورت تقریباً صحیح کر بولی۔

اوہ...!“ تویر ہاتھ ہلا کر بولا۔“ یہ پوچھواز نہ ہے یا مر گئے۔“

حمدی نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

چپ رہئے۔“ مزرت تویر گذرا کر بولی۔ پھر فریدی کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔“ ہمہاں پیش آیا بات ہے ہمیں تقریباً تین چار سال سے ان کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوسکا۔“ ہم ان کے متعلق صرف ایک ہی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔“ تویر پھر بولا۔“ زندہ ہیں یا۔۔۔ اگر بیمار ہیں تو کب تک مر جانے کی امید ہے اور یہ کہ کچھ بینک بیٹھنگی ہے یا خالی ہاتھ ہے ہیں۔“

”تویر ڈارلنگ.... خدا کے لئے۔“ زر تویر ہاتھ اٹھا کر بولی۔“ وہ کیوں؟“ نوں سے بیووش ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”ویری گذ۔“ تویر اپنی ران پر ہاتھ مار کر اچھا۔“ تب تو جلد ہی مرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔“ مجھے افسوس ہے کہ مر نے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ حمید نے اُسے آنکھ مار کر کہا۔“ ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔“ تویر نے بیوی کی طرف دیکھ کر ہاں لگائی۔“ نہیں بہہ رہا ہے۔“ وہ دانت پیس کر بولی۔ پھر فریدی سے مخاطب ہوئی۔“ بتائیے تا کیسے ٹھہرے؟“

”انہوں نے ایک عورت کو مار ڈالا ہے۔“

”ہائے غصہ!“ مزرت تویر یعنی پر ہاتھ مار کر اچھل پڑی۔

ہوتی۔ اس نے نیلے رنگ کی سلک کا ایک لمبا سالبادہ چین رکھا تھا اور چیزوں میں غالباً کھال کے سلپر تھے۔ ڈاڑھی موچھیں صاف تھیں۔ سر کے نچلے حصوں میں گھنے اور سیال نیچ کا حصہ بالکل صاف اور سپاٹ تھا۔ شاید اس نے اپنی بھنوں میں بھی منڈ رکھی تھیں۔

فریدی اور حمید کو کار سے اترتے ہوئے دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا لیکن کچھ بولا نہیں۔ پھرے پر ایسی ابھسن کے آثار نظر آرہے تھے جو تھامی پسند آدمیوں کی طبیعت کا خاصہ ہو۔“ ہیلو...!“ اس نے اپنی آنکھوں کو گردش دی۔

فریدی اور حمید اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ حمید کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کے درمیانی حصے کی صفائی میں قدرت کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ اس پر اسٹرہ چلا گیا تھا۔“ کیا تویر صاحب تشریف رکھتے ہیں۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تویر صاحب تشریف رکھتے ہیں فرمائیے۔“ وہ ہنکھناتی ہوئی آواز میں بولا۔

فریدی نے اپنالماقانی کارڈ اس کی طرف بڑھایا۔

”سی آئی ڈی انسپکٹر! گذ گاڑ...! ہلو۔“ وہ فریدی کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

”میں تویر صاحب سے ملتا چاہتا ہوں۔“

”ملئے... ملئے... تشریف رکھتے۔“ اس نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حمدی نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پھر فریدی کو گھورنے لگا۔

”اے منڈو!“ اس نے شاید کسی نوکر کو پکارا۔“ بیگم صاحب کو بولو، سب دودھ بہا جا ر

”تو آپ ہی تویر صاحب ہیں۔“ فریدی نے صفائی کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

”مجی ہاں۔“ تویر نے ہاتھ ملانے کے بجائے اپنی چھڑی فریدی کے ہاتھ میں دروازے کی طرف دیکھ کر چینا۔“ اے بھی دودھ بہا جا رہا ہے۔“

حمدی پر تو نے لگا۔ اگر وہ تھما ہو تا تو اس کا سر ضرور سہلاتا۔

”نہیں بہہ رہا ہے۔“ دروازے سے ایک مترجم قسم کی نسبوں آواز آئی۔

حمدی اور فریدی چونک کمرٹے۔ عورت قول صورت اور دلکش تھی۔ عمر بنی

کے درمیان میں رہی ہو گی۔ دو نوں کھڑے ہو گئے۔

”بیگم آپ سے ملئے... فرید احمد صاحب! اسی آئی ڈی انسپکٹر!“

"ایک عورت نے انہیں مارڈا۔ ہپ ہپ ہرل۔" تسویر تالی پینٹنے لگا۔
"چپ رہو۔ چپ رہو۔" اس کی بیوی اسے جھنجور رہی تھی۔

بمشکل تمام تسویر خاموش ہوا۔ فریدی اُسے تیز نظروں سے گھوڑا تھا۔

"میں آپ سے کیا عرض کروں۔" اس کی بیوی جھینپے ہوئے انداز میں کہہ ری
گر میاں شروع ہوتے ہی ایسے ہو جاتے ہیں۔"

"تو اس خاندان میں سمجھی ایسے ہوئے ہیں۔" حمید نے پوچھا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"مطلوب یہ کہ یہ مرض موروثی تو نہیں۔" فریدی بولا۔

"پرویز بھائی نے کے قتل کر دیا۔ وہ کون عورت تھی؟"

"رعنا سلیم۔"

"نام تو بڑا حسین ہے۔" تسویر بولا۔ "خود بھی حسین رہی ہو گی۔ ارے بھی دودھ بہا جا رہا۔

"نہیں بہہ رہا ہے۔" اس کی بیوی اس کا شانہ تھکنی ہوئی بولی۔

"رعنا سلیم کون تھی؟" اس نے فریدی سے پوچھا۔

فریدی نے جیب سے وہی تصویر نکالی، جو حمید کو رعنا سلیم کے فلیٹ کی تلاش کے طے
ملی تھی۔ اس میں پرویز اور رعنا سلیم دونوں ساتھ تھے۔

"یہ عورت....!" مز تسویر بے اختیار چیزی۔ "ہائے غصب شمینہ بائی۔"

اس نے اپنا منہ بازوؤں میں چھپالیا۔

"شمینہ....!" تسویر آہستہ سے بڑا بڑا لاؤ دیکھوں تو۔

اس نے تصویر زمین سے اٹھا لی۔

"بے شک شمینہ ہی ہے۔" اس نے فریدی کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر اپنی بیوی کی
دیکھا جو بازوؤں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "اے
... سارا دودھ بہا جا رہا ہے۔"

"دیکھا آپ نے۔" وہ فریدی کی طرف خلاست آمیز نظروں نے دیکھ کر بولا۔ "ہے
بیوی ہے۔"

"شمینہ سے پرویز کا کیا تعلق تھا۔" فریدی نے اُس کی بات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔
"وہ پرویز کی بیوی تھی۔ اس کے ہاتھوں ماری گئی۔ اور یہ بیوی بھی....!"

"چپ رہو۔" مز تسویر چین پڑی۔

"کیا ان دونوں کے تعلقات اچھے نہیں تھے؟" فریدی نے پوچھا۔

"پتھر نہیں!" تسویر میں چڑھا کر بولا۔ "تم نے خواہ خواہ میری نئی منی بیوی کو رلا دیا۔ شمینہ
اس کی چڑھا دہن تھی۔ ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔"

"محترمہ ہونے والی بات ہو کر رہتی ہے۔" فریدی نے اُسے دلاسا دیا۔

"کیوں مارڈا۔.... انہوں نے کیوں مارڈا۔"

"یہ تو ان کے ہوش میں آنے پر معلوم ہو گا۔"

"لیا ہوش میں آجائے کے امکانات ہیں۔" تسویر نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔"

"تب تو بیوی شی ہی فضول ہے۔" تسویر بولا۔ "یار کچھ ان کے بینک بیلنਸ کے متعلق تو بتاو۔"

"تسویر تم جانور ہو۔.... بالکل جانور۔" اس کی بیوی چیختی۔

"یہ دیکھتے یہ میری بیوی ہے۔.... میری جان میں بھی تمہیں مارڈا لوں گا۔"

"تمہارا خاندان ہی خونی ہے۔"

"پاندماں! کیا کہا پاندماں۔" تسویر بڑا بڑا۔ پھر فریدی سے پوچھنے لگا۔ "آخر خاندان کے نام پر
مجھے پاندماں کیوں یاد آ جاتا ہے۔"

تسویر کے بیوی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے ہوئے کہا۔ "چلو! اندر چلو۔"

"مالی ڈیڑا انپکٹر رخصت۔" تسویر نے فریدی کی طرف دیکھ کر مایوسی سے کہا۔ "یہ پاگل

گورت مجھے قبری میں دھکیل کر دم لے گی۔ ہائے سب دودھ بہا جا رہا ہے۔"

"نہیں بہہ رہا! اندر چلو۔" وہ اُسے دروازے کی طرف دھکیلتی ہوئی فریدی سے بولی۔ "میں
ابھی آتی ہوں۔"

فریدی اور حمید عجیب نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ٹھوڑی دیر بعد

مز تسویر واپس آگئی۔

”ہاں اب بتائیے انکڑ صاحب۔“ اُس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”پوری گرمیاں مصیبت گذریں گی۔“

”میرا خیال ہے کہ پرویز صاحب کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔“

”ان لوگوں کی نسل ہی ایسی ہے۔“ وہ رازدارانہ انداز میں بولی۔ ”ان کے باپ بھی تصور سے جھکی تھے۔“

”پرویز اور شمینہ کے تعلقات کیسے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”پہلے تو اچھے تھے۔“

”پہلے سے کیا مطلب۔“

”پانچ سال قل ہم سب اکٹھارہا کرتے تھے۔ اس وقت ان کے باپ حیات تھے۔ ان کے اتنا کے بعد بُواڑہ ہو گیا۔ پرویز نے اپنی غیر مقولہ جائیداد نجی ڈالی اور شمینہ کو لے کر کہیں چلے گئے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں کبھی سننے میں آیا کہ افریقہ میں میں یعنی..... اور کبھی جنوبی افریقہ میں۔“

”شمینہ آپ کی چچازاد بہن تھی۔“

”جی ہاں۔“

”اس کے والدین کا پتہ بتائیے۔“

”مجھے افسوس ہے کہ میرے علاوہ ان کا کوئی عزیز قریب زندہ نہیں۔“

”تو نوری صاحب کے علاوہ پرویز کا کوئی اور وارث۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خدا کے لئے نوری صاحب کی باتوں پر دھیان نہ دیجئے گا۔ گرمیوں بھر ان کی یہی حالات رہے گی۔ اکثر مجھ سے کہتے ہیں کہ خدا کرے تم مرجا تو میں دوسرا سی شادی کروں۔ وہ بھی مر جا۔ تو تیسری کروں اور اسی طرح چو تھی.... پانچویں.... کل کہہ رہے تھے کہ میں اپنی پلکشیں بھی کڈاں گا۔ کبھی کبھی کہتے ہیں کہ چھرے پر اُبھری ہوئی ناک بُری لگتی ہے۔ خوبصورت آدمیوں چھرہ بالکل ساٹ ہوتا چاہئے۔ بعض اوقات اپنے دونوں کان پکڑ کر اکھازنے کی کوشش کرے۔ کہتے ہیں یہ کیا ادھر ادھر لکھے ہوئے ہیں کیا خدا یہاں کنوں کے پھول نہیں لگا سکتا تھا۔“

”حید ہنسنے لگا اور آہتہ سے بولا۔“ انہیں ایک شفاف خانے میں داخل کر دیجئے۔ ڈاکٹر حید شفاف خانہ.... تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گے۔“

کار میں لاش

کافی رات گئے فریدی اور حمید سعید آباد سے واپس ہو رہے تھے انہوں نے بڑی دیر تک اوپر فرما رکھا۔ سعید آباد کی کوتولی میں بھی کچھ دیر ٹھہرے تھے۔ یہاں ساری پوچھ گھن تنویر یعنی رہ متعلق ہوئی تھی۔ نوری کے خاندان سے واقفیت رکھنے والے بھی یہ نہ بتا سکے کہ پرویز نے ان بودو باش اختیار کر سکی تھی۔ نوری کے متعلق سب نے تصدیق کی کہ گرمیوں میں اس کا اٹی تو زان گز برا جایا کرتا ہے۔

نوری کا شمار سعید آباد کے نیک نام اور خدا ترس لوگوں میں ہوتا تھا۔ فریدی نے اس کے غلط جو معلومات فراہم کی تھیں انہیں مدد نظر رکھتے ہوئے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ پرویز اسے معاملے میں اس کا بھی ہاتھ ہو سکتا ہے۔

”مگر اس کا پاگل بنن عجیب ہے۔“ حمید نے کہا۔

”ہے تو۔“ فریدی آہتہ سے بولا۔ ”لیکن۔“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس سے ایک بار پھر ملوں گا؟“ حمید نے کہا۔

”مگر پاگلوں سے تو تم ذرتے ہو۔“

”سنجیدہ تم کے پاگلوں سے نہیں۔ میں انہیں پاگلوں سے ڈرتا ہوں جن سے جان پچان نہ ہو۔ اچھا بھلا بتائیے میں کبھی آپ سے ڈراہوں۔“

”اور یہ دودھ کا کیا قصہ ہے۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں پوچھا۔
”دن رات باورچی خانے میں دودھ پکواتے رہتے ہیں۔ ڈراڈرا سی دیر بعد کہتے ہیں دیکھو
ہیجا رہا ہے۔ دودھ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ کہتے ہیں کہ مجھے صرف بالائی پڑنے کا منتظر برا
ن آلتا ہے۔ ہاں آپ نے کسی ڈاکٹر کا نام بتایا تھا۔“

”کوئی نہیں ایو نہی۔“ فریدی نے جلدی سے کہا۔ ”تو پرویز کا کوئی اور وارث نہیں۔“
”جی نہیں! لیکن خدارا.... تو نوری صاحب کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیجئے گا۔“ ممز توری نے کہا۔

”نہیں میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں۔ آپ کی ناگ تونیا کے ہر معاملے میں اڑی ہوئی ہے۔“ فریدی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”میرے خیال میں شادی عورت اور مرد کے زمان میں ایک سماجی معاہدہ ہے۔ اگر طرفین میں سے کوئی اس معاہدے کا احترام نہ کرے تو ان کی سزا موت تونہ ہونی چاہئے کیونکہ دنیا کا کوئی قانون عہد ٹکنی پر اتنی سخت سزا نہیں دیتا۔“

”مگر سوال پھر اسی جھنجularی مرد اگلی، پر آپڑتا ہے۔“ حمید نے کہا۔

”جھنجularی ہوئی نہیں بلکہ مشتبہ مرد اگلی کہو۔“

”مشتبہ کیوں؟“

”ایسے معاملات میں یہوی کو قتل کر دینے والے عموماً اپنی مرد اگلی میں شبہ رکھتے ہیں۔ لہذا ن کی غیر شعوری خواہش یہ ہوتی ہے کہ اپنی جنسی کمزوری کے اُس چلتے پھرتے اشتہار کو بھی شکر کرنے ختم کر دیں اور یہ لاشعوری خواہش عموماً یو اگلی کی حد تک بڑھے ہوئے گئے کا البادہ اوڑھ رخاہر ہوتی ہے۔ یعنی یہ خواہش منطقی شعور کو احتساب کا موقع ہی نہیں دیتی اور عمل یعنی قتل رزد ہو جاتا ہے۔“

”تو اسکا یہ مطلب ہوا کہ یہویوں کی بد چلنی کی وجہ عموماً شوہروں کی جنسی کمزوری ہوتی ہے۔“

”نہیں ایسا تو نہیں بھتیرے نامردوں کی یہویاں انہائی پارسا ہوتی ہیں اور بھتیرے جوان مردوں کی طوائفوں سے بھی بدتر۔ مثلاً وہ عورت جو جنسی یو الہوی کاشکار ہے۔ فولاد کے آدمی کی بھی پابند نہیں رہ سکتی۔ اُسے تو بس اپنی زندگی میں ہر آن اور ہر لخت نیاپن چاہئے۔“

”جنسی یو الہوی کی وجہ کیا ہوتی ہے؟“

”ہوتی ہوگی کچھ مجھے یا تمہیں اس موضوع پر کوئی مضمون نہیں لکھنا ہے۔“ فریدی اکتا کر بولا۔

”لیکن راستہ تو کافی ہے۔“ حمید نے جھنکے دار آواز میں کہا۔

”تو عورت ہی کاتند کرہ کیوں۔“ فریدی کے لمحے میں جلاہٹ تھی۔

”مُضِّلَّ اسلئے کہ مجھے ایک عورت نے جنم دیا ہے اور عورت ہی قبر تک پہنچائے گی شرست۔“

حباب آسما میں دم بھرتا ہوں تیری آشانی کا،

نہایت غم ہے اس قطرے کو دریا سے جدائی کا“

”ابے سور یہ تصوف کا شعر ہے۔“ فریدی ہفتا ہوا بولا۔

فریدی شاید جواب دینے کے موڈ میں نہیں تھا یا پھر شاید کچھ اور سوچ رہا تھا۔ ”آپ شاید اس کی یہوی کے متعلق سوچ رہے ہیں۔“ حمید نے کہا۔ ”ہوتا بھی پا قدرتی بات ہے۔ جب کوئی مجرم آدمی کی شادی شدہ جوڑے کو دیکھتا ہے تو وہ میں نہیں اٹھتی ہے۔ اگر آج آپ شادی شدہ ہوتے تو آپ کی یہوی بھی بیچاری ملنے والوں سے سکھا کر آپ ان کی باقتوں کا میرانہ مانئے گا۔ یہ چو میں یوں گھنٹے سراغ رسان رہتے ہیں۔“

”یہ بات بھی اب صاف ہو گئی کہ تمہیں پرویز کی یہوی تھی۔“ فریدی بولا۔ ”لیکن پیشہ کرنے تم

”ٹھیک یاد آیا! آپ نے اس اطلاع سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ پرویز کی یہوی ہو گئے۔“

آخر آپ نے اس کا اندازہ کیسے لگایا تھا۔“ حمید نے کہا۔

فریدی کچھ دیر تک خاموش رہا پھر بولا۔ ”صرف یہوی ہی کی یہو قاتی کسی آدمی کو اتنا بھی

”لکھتی ہے۔“

”میکیوں؟ کیا کسی محظیہ کی بے وقاری آدمی کو انتقام پر نہیں اکسائی۔“ حمید نے کہا۔

”اکسائیتی ہے لیکن ایسے معاملات میں یہ آگ دیر تک نہیں سلگتی۔...“ محظیہ کسی دوسرے

”ہو کر پچھے جتنے میں مشغول ہو جاتی ہے اور عاشق پکھ دنوں تک تو در دن اک قسم کے فلمی گین-

”رہتا ہے پھر وہ بھی اپنی راہ لگ لیتا ہے یا زیادہ تا باز ہوا تو موقع ملنے پر انتقام لے لیتا ہے لیکن“

”پہلی فرست میں۔ زیادہ دنوں تک یہ روگ نہیں پالتا۔“

”لیکن میں نے تو ایسے بھی عاشق دیکھے ہیں جو محظیہ کے پھوٹ سے خود کو ماموں

”کھلواتے ہیں۔“ حمید بولا۔ ”مگر پرویز۔“

”پرویز تین سال سے نہما تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”مُمکن ہے اُسے علم ہی نہ رہا ہو کہ“

”یہوی کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے جب کوئی عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دیتی ہے تو خواہ شوہر ا

”سے محبت رہی ہو یا نہ رہی ہو اس کی مرد اگلی کو ضرور نہیں لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی مرد اگلی کی ا

”سمجھتا ہے اور ایک چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح انتقام کے لئے بیتاب رہتا ہے۔ پرویز۔“

”جمدہ اسی لئے بیتاب کا تھا کہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ پر چھیننے دیتا رہے۔“

”لیکا آپ اسے درست اور جائز سمجھتے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔

”یہ کسی معلم اخلاق سے پوچھو۔“

”یا شاخ میں جاتا ہوں۔ ہم اوست کادم بھرتا ہوں۔ جب عورت بھی وہی اور مرد بھی وہ تو پھر یہ جباب کہاں تک درست ہے۔ یہ سارے قطرے ایک دن مل کر دریا بن جائیں گے۔“

”نالم توت فراٹس سے بھی دس ہاتھ آگے نکل گیا۔ اس نے پوری انفل زندگی کو جنیز کے سانچے میں ڈھالا تھا اور تو نے جنسیت کے ڈاٹے ابдیت سے ملا دیئے۔“

”میں اس موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا راہ درکھستا ہوں۔“

”تو ہھڑیوں کا ایک جوڑا بھی سے مخصوص کر لیا جائے۔“

”کیوں ہھڑیاں کیوں۔ وہ جناب Health Sun Bath میں رسالے تو کھلے عام فرد خدا ہوں اور میری محققانہ تصنیف پر یہ عتاب.... کتاب کا نام ”عشق مجازی سے عشق حقیقی تک ہو گا۔“

”لکھو گے کیا؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”یہی لکھوں گا کہ عورت اور مرد کے تعلقات پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کرنا حسن ازا سے کبھی ہوئی غداری ہے۔ غداروں کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاسکتا۔ تصرف زندہ باد اور یقہ سب، کچھ مردہ باد۔ علماء کرام بائیکاٹ وغیرہ وغیرہ۔“

”تمہارے والد صاحب ابھی زندہ ہیں۔“

”اور میری کتاب پڑھ کر ان کی زندگی اور بڑھ جائے گی۔“ حمید بھس کر بولا۔ ”میا سمجھتے ہیں پ میرے ابا میاں کو.... میں جو کچھ بھی ہوں انہیں کی بدولت ہوں۔ یہ تصرف میا۔ میں سے سیکھا ہے۔ ایک بار کا لطیفہ سننے۔“

”حید نے رک کر ایک زور دار قہقهہ لکایا اور پھر بولا۔“ میں سی کوئی بارہ تیرہ برس کا رہا ہوا گا۔ ابا میاں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ایک رات ایک صاحبہ مردانخانے میں تشریف لا کیں.... میں دوڑا ہوا والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور انہیں گھبراہٹ میں یہ خبر دی کہ ابا میاں ابھی ابھی دوئی بو تلیں اپنے ساتھ لائے ہیں، اور انہوں نے مردانخانے کا دروازہ بند کر لیا ہے۔ والدہ صاحبہ اُک رنگین مراہی سے تو اتفاق تھیں لیکن یہ بولکوں والی اطلاع ان کے لئے بالکل نئی تھی۔ میں وہ چھٹ پر چڑھیں اور ادھر ہی سے مردانخانے میں چل گیں۔ پھر میں جو بھاگا ہوں تو چھٹا پہاں جا کر پناہ لی۔ مگر دوسرے دن اس بڑی طرح ادھیراگیا ہوں کہ خدا کی پناہ۔“

”ابے سور۔“ فریدی ہنسنے لگا۔

”ووسراللطیفہ سنے! اُس وقت میری عمر پانچ یا چھ سال رہی ہو گی۔ اپنے ایک دن مجھ سے پوچھا کہ تم بڑے ہو کر کیا بنو گے۔ میں نے جواب دیا رعنی۔ وہ منہ چھڑا کر مجھے گھورنے لگے پھر بولے کہاں کہاں ہے۔ میں نے کہاں خالہ جان سے کہہ رہی تھیں کہ آپ رنثیوں کو بہت چاہتے ہیں۔“

”کیوں غپ ہاٹ رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”خداؤم۔“

”غیر حمید صاحب! اگر تم مرد نہ ہوتے تو رعنی ہی ہوتے۔“

”ہائے ہائے کیا زمانہ تھا۔“ حمید نے پوچھا تھا مار کر بولا۔ ”بادہ تیرہ برس کی عمر میں مجھے ایک صاحب کی بیوی سے عشق ہو گیا تھا..... ہائے.... خدا کی قسم میں اس کے مہندی لگے ہوئے نرم و ہازک پا تھے کبھی نہ بھلا سکوں گا اور وہ ابھرے ہوئے ہونٹوں کے گرد لرزتی باریک سی نتھ۔“

”نہچہ! الاحول ولا قوۃ۔“ فریدی نے بُر اسمانہ بنایا۔ ”میا وہ تمہاری کوئی رشتہ دار تھی۔“

”ہاں! میرے باپ کے چھوٹے سالے کی بیوی۔“

”یعنی تمہاری مہمانی۔“ فریدی نے حیرت سے کہا۔

”اب تو مہمانی ہی ہیں۔ مگر اس زمانے میں میں نے سنجیدگی سے خواہش کی تھی کہ کاش وہ بیوی بیوی ہوتی۔“

”تم سے بڑا سور آج تک میری نظروں سے نہیں گز را؟“

”آپ تو سور کہہ کر رہ گئے لیکن ابا میاں اور اسی نے خاصی پٹائی کی۔“

”میا انہیں معلوم ہو گیا تھا۔“ فریدی کے لمحے میں حیرت تھی۔

”میں نے کبھی چھپ کر عشق نہیں کیا۔“ حمید بولا۔ ”ایک دن میں نے مہمانی کو ایک عدد خط لکھ دیا۔ لکھا کیا تھا ایک ناول سے نقل کر دیا تھا۔ اس پر مہمانی نے میرے کان تھام کر دو تھپڑ اور ماںوں نے ہزاروں قصیقہ لگائے۔ والدین تک خبر پہنچی تو انہوں نے الگ او ہیڑا۔“

”اس کے بعد پھر کبھی سامنا کرنے کی ہمت پڑی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”خداؤم! ماںوں کے سامنے انہیں آنکھ مار کر موچھوں پر تاؤ دیا کرتا تھا وہ دونوں میاں یہی تو ہمیں سمجھتے تھے کہ میں نے ان کی چڑھ نکل رکھی ہے۔ مگر میں سنجیدگی سے عاشق ہوا تھا۔“

”اور اب۔“

”وہ ای طرف ہو گا۔“ فریدی تیزی سے بائیں سمت کی جھاڑیوں کی طرف مرا۔ نارچ حمید نہیں میں تھی۔ جب تک وہ اُسے روشنی دکھائے فریدی جھاڑیوں میں کوچکا تھا۔ حمید بھی پاپر وہ دونوں دور تک چھیوں کے جنگلوں میں گھستے چلے تھے۔ دفتار فریدی نے حمید سے کہا۔

”جہیں وہیں شہرنا چاہئے تھا۔ چلو... واپس چلو۔“ وہ پھر سڑک کی طرف دوڑا۔

فریدی نے جھاڑیوں میں گھنسنے سے پہلے نہ تو اپنی گاڑی کا انجمنی بند کیا تھا اور نہ روشنی ہی ان تھی۔

”یا تو کیڈی گئی یادو کار۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔ وہ دوڑ رہا تھا۔

”کیوں....؟“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”سڑک پر روشنی نہیں دکھائی دیتی۔“

وپوری قوت سے دوڑنے لگے تھے، فریدی کا اندازہ درست تھا۔ لاش والی کار عاشر تھی اور یہ کی کیڈی کا انجمن بند کر کے روشنی گلی کر دی گئی تھی۔

”جلدی کرو۔“ وہ جھپٹ کر کار میں بیٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ کسی زخمی بھیڑی یے کی رہا غرار تھا۔ کنی بار کی کوشش کے باوجود بھی انجمن اشارت نہ ہوا۔

”یا محاتم ہوئی ہے۔“ وہ نیچے اتر کر انجمن کا ڈھنکن اٹھاتا ہوا بولا۔ ”نارچ اوڑ راؤ۔“

”چوت دے گیا۔“ حمید چاروں طرف دیکھتا ہوا بڑا بڑا۔

”جلد بازی ہیشہ نہیں تھا جس سے دوچار کرتی ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”مجھے سے غلطی ہوئی۔“

”کار موڑی نہیں گئی۔“ فریدی نے نارچ کی روشنی زمین پر ڈالتے ہوئے کہا۔ پھر دفتار تیزی سے جگا۔ دوسرے لمحے میں حمید نے اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی دیکھی جس پر ہیرے کے لئے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے چھاڑا تھا۔ فریدی اُسے جیب میں ڈال کر کیڈی کی طرف جھپٹا۔ وہ

”سید آبدکی طرف جا رہے تھے لیکن اس بار گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔“

”یا آپ نے کسی کو دیکھا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”کہاگر اس بدحواسی کا کیا مطلب۔“

”آجھا تو تم یہ سمجھتے ہو کہ اس لاش نے یہ سب حرکتیں کی ہیں۔“

”اب تو وہ سو فیصدی ممکن ہو گئی ہیں۔“ حمید مختصر سانس لے کر بولا۔ ”لیکن اب میر اپنے ذہن کو کریدتا ہوں تو اس تھے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہاتھ آتا۔ مجھے دراصل اُن کی تھی عشق تھا۔ ہر دفعہ شخص جو مجھ سے قریب ہے اُسے میں تصور میں تھے ضرور پہنچتا ہوں۔ مثلاً آپ سے محبت ہے آپ کی عدم موجودگی میں جب بھی آپ کی تصویر میرے ذہن پر اکبری آپ کی ناک میں تھے ضرور ہوتی ہے اور نہ تھے کے حق میں سگار۔“

”مارتے مارتے اُو بنا دوں گا۔“ فریدی جھپٹی ہوئی ہنسی کے ساتھ بولا۔

”میں نے لمبی ڈالا ہیوں پر نصیب لہراتی محسوس کی ہیں۔“ حمید نے غمگین آواز میں کہا کیڈی لاک سنسان سڑک پر پھسلتی جا رہی تھی۔ دفعتہ خالف سمت سے ایک کار بر قرقا سے آئی اور گزر گئی۔

”کیوں....؟“ فریدی بے ساختہ چونکا۔ ”کیا یہ حق نہیں تھی۔“

اس نے اپنی کار کی رفتار کم کر دی اور لپٹ کر دیکھنے لگا۔ دوسری حق حمید نے بھی صاف آیا۔ لیکن آواز دور کی تھی۔ فریدی نے تیزی سے کیڈی پیچھے کی طرف موڑا۔ سڑک کے دوں طرف گھنی جھاڑیوں اور چھیوں کے گنجان جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دو تین فرلانگ آیک کار کھڑی ہوئی دکھائی دی جس کا انجمن بند نہیں کیا گیا تھا۔

کار کے قریب پہنچ کر انہوں نے عجیب منظر دیکھا۔ اگلی سیٹ کی بائیں جانب کا دروازہ کھلا تھا۔ ایک آدمی جس کا سر پائیدان پر نکلا ہوا تھا اور بقیہ حصہ کار کے اندر دکھائی دیا۔ فریدی نے گاڑی کی روشنی نہیں گل کی تھی۔ لیکن یہ کار ہیئت لاپیٹس کی راش میں نہ ہونے کی بناء پر کافی رو میں نہیں تھی۔

”نارچ لاو۔“ فریدی نے حمید سے کہا۔

حمد کیڈی کی طرف دوڑا۔ وہ نارچ تو نکال لایا، لیکن انجمن بند کرنا وہ بھی بھول گیا تھا۔ فریدی نے اونہی سے پڑھے ہوئے آدمی کو سیدھا کیا۔ چہرے پر نارچ کی روشنی پڑتے ہی وہ پھر اٹھا۔ ”اوہ.... کہیں دیکھا ہے اسے.... مگر یہ مر جکا ہے۔“

زخربے پر تیز قدم کے ناخنوں کے نشانات تھے۔ کسی نے زخرا اس شدت سے دیباڑا ناخن گوشت میں اتر گئے تھے۔

”میا آپ تنویر پر شبہ کر رہے ہیں۔“ حمید نے پوچھا۔
”قطیٰ۔“

”وجہ۔“

”میں اس وقت کسی بحث میں پڑنے کے لئے تیار نہیں۔ میں نے اس کے متعلق ایک بہت ایسا ہاتھ نہیں معلوم کی۔“
”کیا...؟“

”میں کہ وہ عموماً گریموں میں ہمیشہ اپنی بھنوؤں وغیرہ کی صفائی کر دیتا ہے۔“

”بھی میرا خیال ہے کہ اگر اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہوتا تو وہ پروڈیز کے بینک بیلنس غیرہ کے متعلق کچھ نہ پوچھتا۔“

”ظاہر ہے کہ وہ خود کو پاکیں بنانا کر پیش کر رہا ہے۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا وہ ہر سال گریموں میں پاکیں بننے کی مشق کرتا ہے۔“ حمید نے نہ اس اتفاقہ پا کر کہا۔

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن مجھے اس پر یقین ہے کہ وہ پاکیں نہیں ہے۔“

”آخر اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہو گی۔“ حمید نے کہا۔

”اس کی آنکھیں.... پاگلوں اور ہوش مندوں کی آنکھوں میں برا فرق ہوتا ہے۔“

”چلے صاحب۔“ حمید آتائے ہوئے لبجھ میں بولا۔

”خوبی دیر بعد کیڈی سرور لاج کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ چھانک بند تھا۔ تقریباً آٹھ ہیاں دس منٹ تک انہیں چھانک ہلانا پڑا۔ شاید چو کیدا رسولہ تھا۔“

”گون ہے؟“ اندر سے بھرائی ہوئی آواز آئی۔

”پولیس....!“

”ہاچ... پپ... پولیس.... کیوں؟“

”دروازہ کھولو۔“ حمید نے چھانک پر لات ماری۔

”شش یہ نہیں۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔

”نیک صاحب کے حکم کے بغیر.... نہیں کھل سکتا۔“ اندر سے آواز آئی۔

”اُن سے کہو اپنے فریدی ہے۔“

حمدیکچھ نہ بولا۔ واقعات کے اُس ڈرامائی انداز نے اُسے کچھ سمجھنے ہی نہیں دیا تھا
مرنے والے کے نزدیک پر ناخوں کے نشانات نہ دیکھنا تو مشکل ہی سے یقین آتا کہ،
موت نہیں مرا۔ کارڈیا نیور کرتے ہارت فل بھی تو ہو سکتا ہے؟

فریدی خاموشی سے اسٹرینگ پر جھکا ہوا تھا۔ کیڈی ساٹھ میل کی رفتار سے دوڑ رہی
تقریباً تیس میل نکل آئے تھے اور سعید آباد بہت زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا۔ دفعتاً انہیں ہے
وکھائی دی اور پھر جلد ہی اُس روشنی کا معہ بھی حل ہو گیا۔ سامنے تھی سڑک پر ایک کار
میں گھری کھڑی تھی۔ فریدی نے جھلا کر ران پر ہاتھ مارا اور کیڈی روک دی۔

”جانستہ ہو! وہ کس کی لاش تھی۔“ اس نے بے چینی سے ہاتھ ملے ہوئے کہا۔

”نہیں۔“

”یہ جاپانیز مر چنسل کا پوریشن کا وہی الجبت تھا جس نے وہ جسمہ پروڈیز کے بیہاں پر
اب قاتل نے اس کی لاش بھی جلا دی۔“

دیوار پھٹتی ہے

فریدی چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر اس نے کیڈی اسٹارٹ کر دی۔ بمشکل تمام اس نے
آگے بڑھایا۔ یہ بھی بڑا خطرناک کام تھا کیونکہ جلتی ہوئی کار کے شعلوں نے سڑک
چوڑائی کو گھیر رکھا تھا بس مقرر تھا کہ کیڈی آگے نکل گئی۔

”اب کہاں۔“ حمید نے کہا۔

”سعید آباد.... سرور لاج۔“

”اوہ تو کیا....؟“

”میں تنویر کو چیک کروں گا۔“ فریدی آہستہ سے بڑھا۔ آخر اس نے بھجنیں کیا
کر کھیلیں۔ سر کا درمیانی حصہ کیوں منڈو دیا ہے۔“

”تو کھوپڑی چیک کریں گے آپ اس کی۔“ حمید مسکانہ انداز میں بولا۔
کیڈی کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ حمید نے کلائی پر بندھی ہوئی گھری کیٹرف دیکھا۔ دونسرے۔

”ہیات ہے.... کون صاحب ہیں۔“ بیگم توریکی کیکپاٹی ہوئی سترنم آواز آئی اور حید کی آہمیں یک بیک جاگ اٹھیں۔

”میں ہوں اسپکٹر فریدی۔“ فریدی نے مقدرت آمیز لمحہ میں کہا۔
”ہیات ہے۔“ اندر سے آواز آئی پھر بیگم توریکی نے شاید چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”چھانک دو۔“

کرکٹھ کے ساتھ چھانک کھلا اور فریدی نے زرم لمحہ میں کہا۔

”مز توری یعنی افسوس ہے لیکن اس وقت یہاں میرا آتا ہے ضروری تھا۔“

”فریدی! اگر دیر تک ٹھہرنا ہو تو اندر چلتے۔“ اس کے لمحہ میں اکتاہت تھی۔

”سب ایک بڑے کرے میں آئے۔ مز توری نے گھرے نیلے رنگ کی سلک کا سلپنگ اہن رکھا تھا.... اور پیروں میں ساہ مغلی چلپیں تھیں۔ چیرہ اس وقت پہلے سے زیادہ حسین ہو رہا تھا۔

”فریدی اور حید کی طرف جواب طلب نظر وں سے دیکھنے لگی۔

”آپ کا خاندان خطرے میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”می؟“ وہ بے ساختہ چونک پڑی۔

”توری صاحب کہاں ہیں۔“

”اپ کرے میں سور ہے ہیں... بات کیا ہے؟“ اس کی آواز کیکپاٹی تھی۔

”ڈر انہیں جگا دیجئے۔“

”جگاؤں.... لیکن....“ لمحہ میں چکچاہت تھی۔ ”آخر آپ بتاتے کیوں نہیں۔“

”مگر مہ میں آپ کو ان الجھنوں میں نہیں ڈالا چاہتا۔“ فریدی نے زرم لمحہ میں کہا۔

”اور میں آپ کو یقین دلاتا چاہتی ہوں کہ ان سے کسی معاملے پر گفتگو کرنا غضول ہے۔“

”یا ان کا ذہنی توازن اتنا ہی گڑا ہوا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”کہاں۔“

”ایک بات اور.... کیا وہ ہمیشہ ایسی جالت میں اپنی سہی وضع قطع بنائے رہتے ہیں۔“

”کہاں۔“

اندر پھر قدموں کی چاپ سنائی دی جو بذریعہ دور ہوتی گئی۔

”آخر آپ کس طرح چیک کریں گے۔“ حید آہستہ سے بولا۔

”بس دیکھتے ہو۔“

”اگر وہ توری یعنی رہا ہو گا تو مخاطب ہو گیا ہو گا اور پھر میرا خیال ہے کہ اس کی بیوی بھی اس اور کتوں سے لامنہ ہو گی۔“

”خدا جانے۔“

”اگر وہ توری یعنی تھا۔“ حید بولا۔ ”تو یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ وابس یعنی آگیا ہو۔ کوئکہ کار قواس نے جلا دی تھی۔“

”ٹھیک ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”لیکن یہ تو سچو کہ اس نے وہ کار و بس کیوں نہ جلا دی جا۔ اس نے اسے پہلے چھوڑا تھا۔ اتنی دور جانے کے بعد جلانے کی وجہ کے متعلق بھی تو غور کرو۔“

حید کچھ نہ بولا۔ فریدی یعنی نے تھوڑی در بعد کہا۔

”اُس نے یہ سارے انتظامات پہلے ہی سے کر کے ہوں گے۔ ہم یہاں سے سات بجے گئے تھے۔ سڑاچے آٹھ بجے یہاں سے ایک میل ٹرین جاتی ہے جو تقریباً دھنختے میں ہمارے تک پہنچ جاتی ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ جانے سے پہلے اس نے اسی مقام پر جہاں وہ کار جل رہی ایک موڑ سائکل چھپا دی ہو۔“

”تو اُسے یہاں لا کر مارنے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”شہر میں اُسے لاش جلانے کا موقع نہ ملتا۔“

”پھر بھی اسی وقت یہاں آنے کی منطق میری سمجھے سے باہر ہے۔“ حید نے کہا۔

”کیوں؟“

”ظاہر ہے کہ وہ اپنی کار بھی دیکھے چکا ہے۔ اس نے اندازہ لگایا ہو گا کہ یہ ہم ہی ہیں۔ اس دہ کافی مخاطب ہو گیا ہو گا۔“

”میں کہتا ہوں تم بس دیکھتے جاؤ۔“

”اندھیرے میں دکھائی بھی تو نہیں دیتا۔“ حید نے جھنجلا کر کہا۔

اندر پھر قدموں کی آہمیں سنائی دیں۔

جاہاتا ہا کہ آپ کو کسی الجھن میں ڈالوں۔ لیکن اب بتانا ہی پڑے گا۔” فریدی نے مختصر پرویز کی رواداد ہراوی۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ پرویز کی بیوی اُسے ڈکڑا نہوں کی سی زندگی بمر کرنے لگی تھی۔ اُس کے متعلق اس نے یہ بتایا کہ دونوں کی ٹیکنیکیں پر علیحدہ ہو گئے تھے۔ پرویز کو اس قدر غصہ تھا کہ اُس نے اپنی بیوی کا ایک مجسمہ بنوا کر ہاتھی جذبے کی تیکنیک کا درج پیدا کر لیا تھا۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ کسی نے اس کی بیوی کو کردے کر اُس کرے میں پہنچا دیا جہاں وہ مجسمہ رکھا ہوا تھا اور پرویز نے مجسمے ہی کے دھوکے اُس کا گلاد بادیا۔

خوبی کی بیوی بہت زیادہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

”آپ درست ہیں تا۔“ فریدی نمکرا کر بولا۔ ”میں اسی لئے آپ کو کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔“ ”نہیں میں ڈر نہیں رہی ہوں۔ آخر وہ کون ہو سکتا ہے۔“

”وہ ایسا ہی آدی ہو سکتا ہے جسے پرویز کی موت کے بعد کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسے نہ پہنچ سکے گا۔ میں خوب صاحب کے لئے بہت فکر مند ہوں۔“ مز توڑ بہت زیادہ بے چین ہو گئی۔

”اور سنے! میں نے ابھی راستے میں اُس ایجنت کی لاش دیکھی ہے جس کی معروف پرویز نے سمجھا ہے۔ لہذا مجھے واپس آنا پڑا۔ اس لئے کہ جلدیا بدریر آپ لوگوں پر بھی حملہ ہو سکتا ہے قاتل کو پرویز صاحب اور اس مجسمے کے متعلق ایجنت ہی سے معلوم ہوا ہو گا۔“ ”اور اس نے اس ایجنت کو بھی مارڈا۔“

”میں ہاں۔“ فریدی جلدی سے بولا۔ ”میں پرویز صاحب کا کمرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”میں عرض کر چکی ہوں تاکہ وہ اندر سے دروازہ بند کر کے سوتے ہیں۔“

”آپ کی مرضی۔“ فریدی امتحنا ہوا بولا۔ ”میں نے آپ کو خطرات سے آگاہ کر دیا۔ اب پہنچنے۔“

”تمہری یہ! میں بھلا کیا کر سکتی ہوں۔ آپ خود پہل کر دیکھ لیجھ کے کرہ اندر سے مقفل ہے۔“ ”پہنچے!“ فریدی بولا۔

”مز توڑ ایک کرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔“ فریدی نے دروازے کو دھکا دیا۔ لیکن وہ

”بھنوئیں وغیرہ صاف کر دیتے ہیں۔“

”میں ہاں! لیکن آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔“

”بہتر ہی ہو گا آپ انہیں جگادیں۔“

”اور اگر فرض کیجئے وہ جا گے تو۔“

”جا گئیں گے کیوں نہیں۔“ فریدی نے اتنے بھولے پن سے پوچھا کہ حمید اس پر ہوتے ہوئے رہ گیا۔

”وہ اکثر تین تین دن سک نہیں جاتے۔“ مز توڑ بولی۔

حید چوک کر اُسے گھوڑنے لگا لیکن فریدی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کوئی غیر متوقع بات نہ سنی ہو۔

”اوہو...!“ فریدی بولا۔ ”تو اُنکے اور پرویز صاحب کے مرض کی نوعیت ایک ہی ہے۔“ ”کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے، جو سونا شروع کرتے ہیں تو اکثر تیرے اور دوازہ کھلتا ہے۔ اس دوران میں کتنا ہی شور چاہیے اور دوازہ پیشے لیکن شاید وہ کروٹ نکل لیتے۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ جب یہ کیفیت ہو تو انہیں اٹھایا ہی نہ جائے۔ اگر وہ زبردستی جگائے آن کا ہارت فلی ہو جائے گا۔“

”بالکل یکساں حالات ہیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ پھر چوک کر کہنے لگا۔ ”محترمہ زور دیجئے۔ کیا آپ کا کوئی ایسا عزیز بھی ہے جسے پرویز اور توڑ صاحبان کا ترکہ پہنچ سکے۔“

”کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں۔ خدار مجھے الجھن میں نہ ڈالنے۔“

”توڑ صاحب کس وقت سونے کے لئے گئے تھے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی انہوں نے کھانا کھایا اور اس کے بعد سونے چلے۔“

”انداز اکیا وقت رہا ہو گا۔“

”غالباً ساڑھے سات۔“

”کیا آپ مجھے ان کے کمرے تک لے چلیں گے۔“

”کچھ بتائیے بھی۔“ وہ جھنجلا کر بولی۔ ”اس طرح خواہ نجک کرنے سے کیا فائدہ“

”محترمہ میں ایک بار پھر تکلیف دی کی معافی چاہتا ہوں۔“ فریدی نے مذکور کی

اندر سے بند تھا۔ اس نے کوئی ایسا سوراخ یا جھری تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے اندر جاسکے۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دروازے کے دونوں طرف کھڑکیاں تھیں لیکن وہ بھی بزر اور ان میں بھی شیشے نہیں تھے۔

کرے کے اندر سے بھل کا پکھا جلنے کی آواز آرہی تھی۔ کافی اوپرائی پر ایک روشنداں نظر آیا جو کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر گھر سے نیلے رنگ کوشنی دکھائی دے رہی تھی۔

”دوسری طرف بھی دروازہ ہوگا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔ ”نہیں۔“

”کوئی کھڑکی۔“

”کھڑکی بھی نہیں ہے۔“

”یعنی اگلی دیوار کے بعد کوئی دیوار نہیں ہے۔ اگر دروازہ ہوتا تو مکان کی پشت پر کھلا،“

”جی ہاں۔“

”عجیب بات ہے۔“ فریدی بولا۔ ”وہ کہہ بھی ایسا ہی تھا جس میں پرویز کی بیوی کی لاگئی تھی۔ عجیب معاملہ ہے مگر ہاں! اس میں تو نقبت کا لگائی گئی تھی۔“

”خدا کے لئے کچھ سمجھنے۔“ مزتیر مصطفیٰ باہم انداز میں بولی۔

”بانس کی سیر ہی ہو گی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”ذرا جلدی سے منگوائیے۔“ فریدی نے کہا۔

نوکر بھی بیدار ہو گئے تھے اور وہ کچھ دور پر کھڑے ان لوگوں کو عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھوڑی دیر بعد سیر ہی آگئی۔ فریدی نے اسے روشنداں سے لگایا اور دیکھتے ہی دیکھنے پڑا۔ کرے کے اندر نیلے رنگ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ پر تکلف برسرور لگا ہوا تھا۔ لیکن وہ بالکل خالی تھی۔ تیور کا پیلے رنگ کا لبادہ جو اس نے پہن رکھا تھا، پینگر پر لٹکا ہوا نظر آیا۔ دوسری طرف یادھر اُدھر کی دیواروں میں نہ کوئی دکھائی دی اور نہ دروازہ۔

فریدی چپ چاپ نیچے آتی آیا۔ پھر نوکروں کو مخاطب کر کے بولا۔

”تم لوگ جا کر آرام کرو۔“

”کیا بات ہے۔“ مزتیر اسے جھوڑ کر بولی۔ فریدی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔

”تو نوکروں کے چلے جانے کا منتظر رہا۔“

”محمد مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ مجھے اس طرح آؤ بیانیں گے۔“ اس نے کہا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ مزتیر کے لمحے میں حرمت تھی۔

”کہہ بالکل خالی ہے۔“

”بھی۔“ اس نے آنکھیں چھاڑ کر کہا۔ ”نا ممکن... قطعی نا ممکن۔“

”آپ خود کیلئے لمحے۔“ فریدی نے روشنداں کی طرف اشارہ کیا۔

مزتیر چند لمحے فریدی کے چہرے پر نظر جائے رہی پھر سیر ہی کی طرف بڑھی۔

فریدی اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے قدم لٹکھاڑا ہے تھے۔

رُشنداں میں جھائختے ہی وہ بے اختیار جیخ پڑی۔ سیر ہی کے ڈھنے اس کی گرفت سے نکل گئے اگر فریدی نے چھپت کر اسے ہاتھوں پر نہ روک لیا ہوتا تو وہ بھی اپنی چھاڑا بہن شمیتہ کے پاس پہنچ گئی ہوتی۔ وہ بیہوش تو نہیں ہوئی تھی لیکن حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنے پیر دل پر کڑی ہو سکتی۔ فریدی نے اسے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر ڈال دیا۔

اب حمید سیر ہی پر چڑھ رہا تھا۔ روشنداں میں جھائختے پر اسے یہ سمجھنے پر مجبور ہو جانا پڑا کہ

تیور کی بیوی نے انہیں دھو کے میں رکھا تھا۔ وہ نیچے واپس آنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ سامنے کی

دیوار میں نیچے سے اوپر تک ایک درازی پڑ گئی جو دیکھتے ہی دیکھتے کافی کشادہ ہوتی جا رہی تھی۔ حمید

نے پیچھے پلٹ کر.... فریدی وغیرہ کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دوسرے یہ لمحے میں اس نے

جبس سے ریو الور نکال لیا۔ فریدی مزتیر کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ حمید کو ریو الور نکالتے دیکھ کر اس نے مزتیر کے منہ پڑھا تھا رکھ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کی جیخ کسی طرح نہ رک سکتی۔

ایک آدمی کرے میں داخل ہوا اور دیوار پھر برابر ہو گئی۔ لیکن یہ تیور نہیں تھا۔ اس کے

بال گئے، گھوٹکھریا لے اور پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے، خدو خال جاذب توجہ اور دلکش تھی،

جن ان اور صحت مند تھا۔

”خیڑا رہا....!“ حمید نے روشنداں سے لکارا۔ ”مگر بھائی کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا، اس نے نے گھبرا کر اوپر دیکھا اور روشنداں میں ریو الورڈ کیچ کر اپنے دونوں ہاتھ اور انھلے ”کیا بات ہے؟“ فریدی نے پیچے سے پوچھا۔
”دروازہ توڑ دیجھے۔“

حمد نے محسوس کیا کہ وہ آدمی آہستہ آہستہ دیوار کی طرف کھکھ رہا ہے۔
”اپنی جگہ کھڑے رہو۔“ حمید نے لکارا۔ فریدی دروازے سے شاندار ہائے زور کر رہا دروازہ کچھ زیادہ منبوط نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اوہ دروازے میں چڑھا ہٹ ہوئی اور اوہ ہر جا کیا ہوا کہ حمید سیر ہی سیست دیوار پر پھسلتا ہوا پیچے چلا آیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ریو الور نہیں چا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ فریدی حمید کی پرواہ کے بغیر اندر گھسنے پڑا۔ کرہ خالی تھا اور سامنے والی دیوار درمیانی خلا بد ستور قائم تھی۔ فریدی دیوانہ وار اس سے گذر کر مکان کی پشت پر آگیا۔ کافی قاء پر سامنے ایک تاریک سایہ دوڑ رہا تھا۔ فریدی نے بے تحاشہ اس کے پیچھے بھاگنا شروع کر دیا۔ فریدی نے اسے جلد ہی جالیا۔ بہر حال وہ بہت زیادہ طاقت ور ثابت نہیں ہوا۔ شاید وہ گھبرا ہوا بھی تھا۔ اس لئے اس نے جلد ہی ہاتھ پر بیڑاں دیئے۔

تو یور کے ڈرائیگ روم میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ پر بندھے ہوئے تھے اور پیر بھی آزاد نہ تھے۔

”تو یور کی بیوی برابر پیچے جا رہی تھی۔“ ہائے تو یور کہاں ہیں۔ تو یور کیا ہوئے۔“

”تم اپنی اگلو ٹھی وہیں چھوڑ آئے تھے۔“ فریدی نے اس آدمی سے مکرا کر کہا۔ وہ کچھ نہیں بولا۔ بد ستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”آخراتی جلدی کیا تھی۔“ فریدی اپنی جیب سے اگلو ٹھی نکالتا ہوا بولا۔ ”کل اس کا خاتمہ کر دیجئے اگلو ٹھی۔“ سرز تو یور اگلو ٹھی کی طرف دیکھ کر چینی۔ یہ اگلو ٹھی کر کی ہے۔“

”اس کی؟“ فریدی نے بندھے ہوئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”غلط.... بکواس ایسے تو یور کی ہے۔“

”اور یہ کون ہے؟“ فریدی نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”میں نہیں جانتی۔“

”آپ اپنے شوہر کو نہیں جانتیں! حیرت ہے۔“ فریدی نے کہا اور بڑھ کر اس آدمی کے سر پر بال نوج ٹھیک کر دیا۔ پھر بھنوں بھی نوج ڈالیں۔ ہونوں پر سے پلاسٹک کے ٹکڑے نوجے ہو چے۔ ہو یہ اپنی معنوی وجہت سیست ان کے سامنے تھا۔ اس کی بیوی نے چین ماری اور گر کر پوش ہو گئی۔

پا گلوں کی کہانی

اس کیس نے شہر میں بہنی پھیلادی تھی۔ اخباروں کے کرام رپورٹر کو تو ای اور حکمہ سراج مان کی عمارتوں کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ تو یور حوالات میں تھا اور پرویز کو بھی بچپنی زادت کو شل آپکا تھا لیکن ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق کسی نے بارہ گھنٹے تک اس سے کوئی گفتگو نہ کی۔ مقتول انجیٹ کے متعلق چھان میں کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تو یور کے گھر نے دوستوں میں تھا۔ جس کار میں ان دونوں نے سفر کیا تھا وہ کار پوریشن کی ملکیت تھی۔ تو یور کی بیوی بھی اس بٹ کو جانتی تھی لیکن بقیہ معاملات سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

تو یور نے بڑی مشکلوں سے اعتراف جرم کیا تھا۔ سول پولیس تو اپنے سارے حریبے استعمال کے ہار گئی تھی۔ آخر فریدی نے وہ طریقہ استعمال کیا، جو دوسروں کی نظر و میں انتہائی احتفاظ لے جید تو سمجھا کہ شاید فریدی کے دماغ میں بھی فتوڑا واقع ہو گیا ہے لیکن تو یور کا لیاں ہے کہ اگر سلسلہ کچھ دیر اور جاری رہتا تو وہ کچھ پاگل ہو جاتا۔

فریدی کی نے اسے ایک بڑی سی میز پر چٹ لٹا کر اس کے ہاتھ پر اس طرح کس دیئے تھے کہ جنس نہ کر سکے۔ پھر اس نے اس کے سر کے دونوں طرف دو نختیاں کھڑی کر کے ان میں نہ ٹھکاؤں۔ اب اس کا سر بھی جنس نہیں کر سکتا تھا۔ آنکھیں جھٹ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے ایک ہاتھی منگوائی اور اس کی پیندی میں چھوٹا سا سوراخ کر کے اس میں ذرا سا ہالٹوں کا دیا۔ ہاتھی میں پانی بھرا گیا اور وہ عین تو یور نے سر پر چھٹ سے لٹکا دی گئی۔ توڑی فوراً دی ہو گیا۔ ایک یونہ تو یور کی پیشانی پر پیشی رہی۔ تقریباً آدمہ گھنٹے تک وہ خاموش رہا پھر کس نے بڑی انشادی دیا۔ ”وہ آئی... وہ گری... آ... آ... آئی... آئی... گری...“

گگ.... گگ.... گری۔“

پھر وہ چیختے لگا۔ ”میں پاگل ہو جاؤں گا..... ہٹاڑ..... اس ہٹاڑی کو.... فریدی کینے سو
ہٹاڑ..... وہ گری ارے میری پیشانی پھٹی۔ چھوڑ دو مجھے..... بتاتا ہوں بتاتا ہوں
میں نے ہی ٹھیں کو اس کمرے میں پہنچا لتا۔ میں نے ہی ابجٹ کو مارا تھا۔ وہ گری ارے
مرا.... میں پاگل!“

پھر اس نے سب کچھ اگل دیا۔ وہ ٹھیں سے پرویز کے ایک دوست کی حیثیت سے نلا تھا جو
اس نے بھیں بدلتا رکھا تھا اس نے وہ اسے پہچان نہ سکی۔ تویر کو اس کے مجھے کے متعلق
ابجٹ ہی سے معلوم ہوا تھا۔ وہ ابجٹ تویر کو دونوں حیثیتوں سے جانتا تھا۔ تویر کی حیثیت
بھی اور اس بدلتے ہوئے بھیں میں مشر شمشاد کی حیثیت سے بھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا
دونوں ایک ہی ہیں۔ اس قسم کے مجھے اور ریکارڈ کا آرڈر چونکہ ایک ہی اور حیرت انگیز بات
ان لئے اس نے اس کا تذکرہ تویر سے بھی کیا۔ وہ تصویر بھی دکھائی جس کے مطابق مجھے کی تبا
ہوئی تھی۔ اس سے پہلے حقیقت تویر کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ پرویز بھی اسی شہر میں موجود
اس اطلاع پر اس نے خفیہ طور پر چھان بین کی تو اسے معلوم ہوا کہ پرویز تقریباً تین سال سے
رہ رہا ہے۔ ٹھیں اس کے ساتھ نہیں ہے۔

ٹھیں سے جس طرح اس کی ملاقات ہوئی اس کی تفصیل بھی بڑی دلچسپ تھی۔ تو!
شروع ہی سے گرمیوں کے زمانے میں جنی دیوالگی کے دورے پردا کرتے تھے لیکن ”ا
خواہشات کی سمجھیں سکھم کھلانیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اسے اپنی نیوی سے بڑی محبت تھی اور وہ نما
قلم کی جنسی دیوالگی جس کا وہ شکار تھا اپنی نویعت کے لحاظ سے اسی نہیں تھی کہ کسی ایک پر قائم
کرتی۔ تویر نیک نام بھی رہنا چاہتا تھا اور اپنی ضرورت بھی اس کے پیش نظر تھی لہذا اس
گرمیوں کے زمانے میں خود کو بچ کا پاگل بن کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ بھیں بدلتے کی غرض
وہ ہمیشہ اپنے سر کے بال اور بھنوی منہزادیا کرتا تھا اور اپنی عجیب و غریب نیند کے بہانے
تین دن تک گھر سے غائب رہتا۔ یہ یام قرب وجوار کے شہروں یا سعید آباد ہی کی طوائف
گذر اکرتے تھے یہاں آتا تو اسی ابجٹ کے یہاں ٹھہرتا اور دونوں مل کر عیاشی کرتے۔ ابجٹ
تھا کہ وہ کس مجبوری کی نہام پر بھیں بدلا کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ قطیٰ نہیں معلوم تھا کہ وہ

بھائی ہے۔

ایک رات شہر کے ایک حصے میں تویر کو ٹھیں میل گئی۔ اس رات وہ ابجٹ اس کے ساتھ
نہیں تھا۔ تویر نے ٹھیں کا تعاقب کر کے اس کی جائے رہائش کا پتہ لگایا اور ایک دن اسے راہ میں
روک کر اس سے پوچھا کہ وہ ٹھیں تو نہیں ہے۔ اس نے ٹھیں کو بتایا کہ وہ پرویز کا ایک دوست ہے
اور اس کے یہاں اس کی تصویر دیکھ چکا ہے۔ ٹھیں نے اسے بتایا کہ ان دونوں میں ناجاہی ہو چکی ہے
اور پرویز اس سے ناراض ہے۔ اس پر تویر نے اسے یہ اطلاع دی کہ وہ تو اسے پوچھتا ہے۔ مادر
نہیں بلکہ حقیقتاً اس نے اس کا ایک مجسمہ بنوایا ہے اور وہ بچھا اس کی پرستش کرتا ہے۔ ٹھیں بے
قرار ہو گئی۔ کئی سال طوائفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد وہ پھر سے گھر بسانے کے خواب دیکھنے لگی۔
اس اطلاع نے اس کا مستقبل روشن کر دیا تویر نے اس کا اندازہ پہلے ہی لگایا تھا کہ پرویز نے وہ
مجسمہ کس لئے بنوایا ہے۔ اگر چیزوں والا ریکارڈ بھی ساتھ ہی نہ بنواتا تو شاید وہ بھی بھی سمجھتا کہ اس
نے وہ مجسمہ اپنی محبت کی تیکین ہی کے لئے بنوایا ہے۔

اس کمرے کے متعلق جس میں وہ مجسمہ رکھا گیا تھا ابجٹ سے پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا۔
کمرے کی ساخت کے بارے میں معلوم کرنے کے بعد اس نے اندازہ لگایا کہ وہ کسی کونے ہی پر
ہو گا۔ ایک رات وہ پرویز کی کوئی کی پشت پر پہنچا۔ ایک روشنداں سے چیزوں کی ہلکی آہنی
آرہی تھیں اور پھر اس نے اچھی طرح طمیان کر لیا کہ مجسمہ اسی کمرے میں ہے۔

اس دوران میں وہ ٹھیں سے برادر ملتا رہا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کبھی وہ
پرویز کے سامنے چل گئی تو وہ اسے زندہ نہ چھوڑے گا۔ لہذا اس نے پروگرام بنانا شروع کیا کہ اسے
کی طرح اس سمجھے والے کمرے میں پہنچا کر مجسمہ غالب کر دیا جائے۔ اس طرح سائب بھی مرے
گا اور لامگی بھی نہ ٹوٹے گی۔ پرویز کی چھانی کے بعد اس کی دولت بھی ہتھے چڑھے گی۔

ٹھیں نے پرویز کا پتہ بہت پوچھا۔ مگر تویر نے نہ بتایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ دوڑ روشن میں بھی
ہو سکتا ہے۔

تویر نے اس سے کہا کہ وہ پرویز کو متینگ کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اسے اس کمرے میں پہنچا کر
ال کا مجسمہ غالب کر دے۔ ٹھیں نے اس تویر کو پسند کیا پھر وہ دونوں ایک رات وہاں جا پہنچا۔

تھلات بہترول سے رہ پچھے تھے۔ وہ حقیقتاً اسکی نہیں تھی کہ کسی ایک ہی کی ہو رہی۔ اسی کی بدولت میرے اور تنویر کے درمیان بذارہ ہوا تھا۔ وہ اسکی جگہ رہنما نہیں چاہتی تھی جہاں کوئی نہ کوئی ہر وقت اس کے سر پر مسلط رہے۔ رقیہ بڑی تیک عورت ہے اسی لئے شمینہ نے اس کے ساتھ رہنا کو رانہ کیا؟“

”رقیہ کون؟“ فریدی نے پوچھا۔

”تو نویر کی بیوی۔ ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔ کسی طرح تنویر کو بچائیے درنہ وہ بے ہوت مر جائے گا۔“

”خجال ہے۔“ فریدی بولا۔ ”اس کی گردن پر دودو خون ہیں۔“

پرویز خاموش رہا لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر ہوا تھا کہ وہ شدید ترین قلبی اذیت میں چلا ہے۔

”کیا آپ کو معلوم تھا کہ شمینہ بھی اسی شہر میں موجود ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”نہیں! وہ اب سے چار سال پہلے میرے ایک دوست کے ساتھ فرار ہو گئی تھی اور اس کے بعد سے پھر مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوا۔ بہر حال انقام کی آگ نے مجھے قریب رہ بیباگی کر دیا تھا۔“

”لیکن آپ نے اسے مارکس طرح ڈالا۔“ فریدی نے پوچھا۔ ”کیا آپ کو اس کا احساس نہیں رہنا تھا کہ آپ ایک ذی روس کا گلا گھوٹ رہے ہیں۔“

”اے سوچنے سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کمرے میں اندر رواخ ہوا اکھ کہنے سے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس وقت میں نے نقاب کی طرف خیال نہیں کیا تھا۔ دفعہ بارے دونوں ہاتھ اس کی گردن پر جا پڑے اور غیر شوری طور پر میری گرفت سخت ہو گئی۔ کروں نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے جنہیں سنی تھیں لیکن مجھے اس کا بھی ہوش نہیں۔ میری بھوٹل نہ آیا کہ کیا ہو گیا۔ دوبارہ جب میں ثارچ منگوا کر اندر گیا تو وہ مجسم بھی موجود نہیں تھا۔ تب کی طرف میں نے اس وقت بھی ذہیان نہیں دیا تھا۔ اس کے متعلق تو مجھے آج ہی اخبار کے روپ معلوم ہوا۔“ فریدی اور حمید پچھے دیر سی گفتگو کرتے رہے پھر اٹھ آئے۔

تنویر کو اندر پہنچایا اور وہاں سے وہ مجسم اور ریکارڈ لے کر رفوچکر ہو گیا۔ یہ بات تو اسے ایجنسے معلوم ہو گئی تھی کہ پرویز نے اس مجسم کے معاملے میں بڑی رازداری سے کام لیا تھا تھی کہ اس نے تو کروں کو بھی اس کی ہواںک نہیں لگانے دی تھی۔

سرجنٹ حمید ایک کاہاتھ پکڑ کر کہتا پھر رہا تھا کہ فریدی اس صدی کا عظیم ترین باگی ہے کہ اس نے ایک پاگل پن کی حرکت کر کے اس پاگل سے سب کچھ اگلوالیا... اب وہ اس تیرے پاگل کی رواد اسنے کے لئے بے جھیں تھا جس نے سونے کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ حالات کے معکل خیز پہلواس کے ذہن میں پھل چائے ہوئے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک شوہر بیوی سے محروم ہو گیا اور ایک بیوی شوہر سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ دونوں نے تصوف کی راہ پر زور سے دور نگادی تھی۔

شام کو فریدی اور حمید ہپتال پہنچ۔ پرویز تھکنے سے میک لگائے بستر پر نہیں دراز تھا۔ وہ دونوں اس کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔

”میرا خیال ہے کہ نہیں پہلے بھی آپ حضرات کو دیکھ چکا ہیں۔“ اس نے نقیبہ آواز میں کہا۔ ”حاوٹے والی رات کو۔“ فریدی بولا۔

دفعہ پرویز کے چہرے پر مردی چھا گئی اور ٹھوک لگل کر خنک ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ ”میری دانست میں آپ قطی بے قصور ہیں۔“ فریدی نے کہا۔

”لیکن اب میں زندہ نہیں رہنا چاہتا۔“ پرویز مضمحل آواز میں بولا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہو گیا؟“

”بھی ہاں اخبار... ایک تریض کی عنایت سے اخبار مجھے مل گیا تھا۔“ ”بہر حال تنویر حراست میں ہے۔“

”اس نے جو کچھ بھی کیا اچھا ہی کیا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے کوئی گزند پہنچ۔ شمینہ جب بھی میرے سامنے آتی میں اس کے ساتھ ہی بہت سارے بڑے کرتا۔“

”شردعن میں تو آپ دونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”تعلقات... میں اسے بچ پوچھا جاتا تھا۔ لیکن میں اس کے متعلق ہمیشہ دھوکے ہی میا رہا۔ میں اسے پاک باز سمجھتا رہا۔ لیکن یہ حقیقت بعد کو واضح ہوئی کہ شادی سے پہلے ہی اس کے

ہیا بیوڈگی نہ ہے۔ ”فریدی نے اسے آہستہ سے جھٹکا۔

نہ جانے کیا ہو گیا ہے، ہوتنوں میں۔ ”حید نے سر اٹھا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”کھلی... کیسی کھلی...“

اس نے فریدی کو بھی منہ چڑھایا۔

”میں جاتا ہوں.... گدھے سورا! پلک مقامات پر بیوڈگی کھل جاتی ہے۔“

”اب بتائیے کھلی کو کیا کروں۔“

”جوتے سے کھلاوں گا۔“ فریدی بگز کر بولا۔

بہر حال حید نے وہ رات فریدی پر حرام کر دی۔

اور اس کیس کے سلسلے میں بعد کے واقعات میں صرف یہی بات بہت زیادہ اہم ہے کہ اس نے پرویز کو قتل کی نیت نہ رکھنے کی بناء پر بری کر دیا۔ فاضل جج نے تجویز میں لکھا تھا کہ ارادتا نہیں بلکہ اضطراری کیفیت کے تحت سرزد ہوا تھا۔ جس کی وجہ خوفزدگی بھی قرار دی گئی ہے۔ عدالت کی نظرؤں میں صحیح ممنوعیں میں بحرم تحریر ہی تھا۔ شمینہ کے معاملے میں اسے سال قید باشقت کی سزا دی گئی اور ایجنت کے قتل کے سلسلہ میں سزاۓ موت۔

مر تحریر کی حالت بہت ابتر تھی۔ فیصلہ سنتے ہی وہ عدالت میں بیووش ہو گئی۔ زندہ تو وہ اب ناہے لیکن بڑیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گئی ہے۔ پرویز ہر طرح اس کا خیال رکھتا ہے، لیکن اس کے نہ میں اتر جاتا اس کے بس کی بات نہیں۔

ختم شد

”آج آر لکھوں میں برازو دردار پروگرام ہے۔“ حید نے راستے میں کہا۔

”ابھی تمہارا اول پروگراموں سے نہیں بھر لے،“ فریدی بولا۔

”پتہ نہیں آپ آدمی میں یا بلوٹک پیپر۔“

فریدی کچھ نہیں بولا۔

”ایک بات آج تک سمجھ میں نہ آئی۔“ حید نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ”تو کی شوہر اپنی بیوی بد چلنی نہیں برداشت کر سکتا۔ لیکن عموماً بیویاں اپنے شوہروں کی بد چلنی برداشت کرتی رہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“

”لیکن تمہاری بیوی تمہیں کبھی نہ برداشت کر سکے گی۔“ فریدی بولا۔

”تو کیا میں بد چلن ہوں۔“ حید بگز کر بولا۔

”نہیں تم تو فرشتے ہو۔“

”معاف کیجئے گا۔ جناب میں لاکیوں سے صرف دوستی کرتا ہوں۔“

”ہر پڑھا لکھا بد چلن بھی کرتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”میا کہا۔“ حید بیچ کر بولا۔ ”بد چلن کہہ لیجئے لیکن اگر پڑھا لکھا کہا تو اچانہ ہو گا۔“

فریدی پہنچنے لگا۔

”اگر ہم اس وقت آر لکھوں میں لکھانا کہا میں تو کیا حرج ہے۔“ حید نے کہا۔ وہ دونوں آر لکھوں میں آئے۔ ڈائینگ ہال میں ابھی تھوڑی بہت سمجھا کش تھی۔ حید نے اسکی میز پر قبضہ جالیا جس کے گرد و پیش کئی خوبصورت لاکیاں تھیں۔

”افوہا! تم بھی کہاں آمرے۔“ فریدی آہستہ سے بڑوایا۔

”میا ان لاکیوں سے وحشت ہو رہی ہے وہ کسی رہے گی۔“ حید نے ایک لاکی کی طرف آنکھوں سے اشارہ کیا۔

”خدا نے چاہا تو ہمیشہ بخیریت رہے گی.... اور اڑھ مر مت دیکھو... اے بولے میوناڑ فریدی نے میونو دیکھ کر پکھہ چیزوں کا آڑور دیا اور پھر کمی لکھتے ہوئے قبیلے اس کے آٹے میں کوئی نہیں لگ۔ قریب کی میز پر بیٹھی چار لاکیاں حید کی طرف دیکھ کر بنس رہی تھیں فریدی نے حید کی طرف دیکھا جو سر جھکائے نہیں سنجیدگی سے طرح طرح کے منہ بنا رہا تھا۔

جاسوسی دنیا نمبر 29

پیش رس

”لاشوں کا آبشار“ ایک عظیم مصنف کی عظیم ترین تخلیق ہے! یہ وہ ناول ہے جس کا ہر لفظ، ہر جملہ اپنی جگہ پر نسیانی حقیقوں کے ذخیرے رکھتا ہے۔ اس کے پورے ماحول میں ایک ایسی کشش اور جاذبیت ہے کہ ابتداء سے انہائیک ہر کردار، کسی ڈرامہ کے افراد کی طرح ہستا، بولتا، چیختا نظر آتا ہے۔

اس کہانی کا مرکزی کردار کرٹل فریدی اور حمید کے بجائے ایک مجرم ہے مگر ایسا مجرم جو سماج اور سوسائٹی کے لئے ہمیشہ سے ایک مسئلہ رہا ہے، ایسا عجیب و غریب سوال.... جس کا جواب اب تک نہ دیا جاسکا ہے!

اس ناول میں شاید ہی کوئی ایسا کردار ہو جسے آسانی سے جھلایا جاسکے! کنول کو آج تک لوگ یاد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُسے پھر موقع دیا جائے! حمید کی اور اس کی دلچسپ چھیڑ چھاڑ خصوصاً ابتدائی حصے میں اس کا برتاباد تھہہ اگنیز ہے! نادرہ ایک محبوں سی لڑکی ہے جس کی شکل صرف ایک بار دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی چال.... ذہن میں چپک کر رہ جاتی ہے۔ مسٹر

لاشوں کا آبشار

(کامل ناول)

کیو جو اس ناول کام مرکزی کردار ہے اپنی خوفناک آنکھوں سمیت ہر جگہ ز
آتا ہے۔

اس ناول کا وہ حصہ عجیب و غریب ہے جہاں مصنف نے پاگل خانے
تصویر کشی کی ہے۔ یہ تصویر اتنی مکمل، اتنی جاندار اور انسانی ہمدردی ر
لبریز ہے کہ بے اختیار.... آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔

حمد کے قہقہے اس کی شراریں، اس کے جملے، اس کا حیرت انگیزہ
جو بڑی سے بڑی مصیبتوں میں بھی قہقہے لگانے کے بارے میں سروج
ہے، ایک انوکھی دنیا کی تغیر کرتے ہیں۔

اور پھر کرنل فریدی.... جیسا عظیم سراغ رسماں اپنے کمال
عروج پر نظر آتا ہے۔

پبلشر

الف لیلی کی ایک رات

ہلکی سردیوں کی ایک خوٹگوار رات تھی لیکن یہ خوٹگواری اُسی وقت تک قائم رہی جب تک
سرجنٹ حمید کو راستہ بھلک جانے کا احساس نہیں ہوا۔ وہ سر شام ہی دلاور نگر سے جل پڑا تھا۔ کام
کچھ اتنا ہی ضروری تھا کہ اس نے ٹرین کے وقت کا انتظار کرنے کے بجائے فریدی کی کار استعمال
کی تھی۔ واپسی پر شام ہو گئی۔ تھوڑی دور تو وہ پختہ سڑک سے آیا پھر اس خیال سے کہ سفر مختصر
ہو سکے اس نے ایک جگہ کار کو ایک کچھ راستے پر موڑ دیا۔ یہ اس نے اپنی یادداشت کے بھروسے پر
کیا تھا۔ اس کی دانست میں ایک بار فریدی بنے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ بہر حال حمید کو یقین تھا کہ اس
نے کار غلط راستے پر نہیں موڑی تھی۔

اُسے شہر پہنچنے کی کچھ اتنی جلدی تھی کہ اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ کیڈ لاک جیسی شاندار
گاڑیاں کچھ راستوں کے لئے نہیں ہوتیں۔

مطلع غبار آؤ د ہونے کی وجہ سے چاندنی ہلکی تھی اور جنگل کے نائے سے اس کی ہم آہنگی
بڑی دلکش لگ رہی تھی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ اگر فرق سفر تھاںی سے ہوتی تو اس وقت کیڈی کے
بیچوں کے نیچے کی ناہموار زمین نہ جانے کئے جہاںوں کی سیر کروتی اس وسیع کائنات کے رشتے
تمبا پرورے ہوئے دو دلوں کے لئے راز فاش ہوتے۔ اس کے ذہن کی سطح پر کئی حسین چہرے اُبھر
آئے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو اپنے گرد بکھری ہوئی بکراں خوبصورتی کا ایک حصہ بنانے کے
لئے منتخب کرنے لگا۔

بہر حال اس کا ذہن شاعرانہ خیالات کی وادیوں میں بھکلتا رہا اور وہ خود جنگل میں... جب
کافی دیر ہو گئی اور وہ بد گد کا عظیم الشان درخت نہ ملا جہاں سے اسے باہم طرف مڑنا تھا تو اچانک

تیک ہوئی جاتی۔

وہ کھڑا کچھ سوچ رہا تھا کہ دفتار اسے اپنے سامنے کچھ دور پر روشنی دکھائی دی جو کچھ راستے ہے اٹھ کر سامنے کی جھاڑیوں پر پھیل گئی اور پھر ایک آواز سنائی دینے لگی جو کسی ٹرک ہی کے بنن کی ہو سکتی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک تیز رفتار ٹرک جھاڑیوں سے نکل کر مخالف سمت میں رُنگی جید سوچنے لگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سڑک ہی کی طرف سے آئی ہو۔

وہ پھر کیڈی میں جای بیٹھا اور اسی طرف چل پڑا جدھر سے ٹرک آیا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد اچانک اسے پھر رک جانا پڑا۔ باہمیں طرف ایک کشادہ راستہ تھا۔ نہ رف ہموار بلکہ باقاعدہ دونوں طرف مالٹی کی گھنی جھاڑیاں تھیں لیکن خود رو نہیں۔ ان کی کاٹ چھانٹ اور باقاعدگی کسی آدمی کی مر ہون منت تھی۔ یہ راستہ ایک چھوٹے سے سلاخوں دار اچانک پر ختم ہو گیا تھا جو بند نہیں تھا۔ مدھم چاندنی میں ایک سفید ہی عمارت کے آثار نظر آرہے تھے۔ جید کو حیرت تو ضرور ہوئی لیکن کیڈی کے لئے پانی کی ضرورت نے اسے بڑھنے نہیں دیا۔ اس نے کار موڑی اور پھانک سے گذر کر پا میں باغ میں پہنچ گیا۔ جو اپنی وسعت کے اعتبار سے پائیں باغ سے بھی بڑی کوئی چیز تھی۔ جس کے درمیان میں ایک بڑی ہی عمارت تھی لیکن طول و عرض کی معاشرت سے اس کی اونچائی غالباً بہت ہی کم تھی۔ سامنے ایک طویل برآمدہ تھا جس میں برتن قلعے روشن تھے۔ قریب ہی کہیں سے گھٹ گھٹ انہت کی آواز آرہی تھی جو غالباً کسی زیادہ طاقت والے ڈانکا موکی تھی۔

برآمدے کے سامنے والی روشن پر مڑنے کی بجائے حید نے کیڈی اسی طرف روک دی۔ برآمدے میں کوئی نہیں تھا اور آس پاس بھی کوئی نہ دکھائی دیا۔ حید نے سوچا کہ اس جدید طرز کی عمارت میں جسے ڈانکا موکے ذریعے روشن کیا جاتا ہے گھنی ضرور ہو گی۔ وہ کیڈی نے اتر ہی رہا تھا کہ دفتار اس کی آنکھیں چندھیا گیں۔

اگر یہ تھیہ گھنیا اور پرانی نہ ہوتی تو وہ بھی سوچتا کہ وہ چہرہ سیاہ پر دے کی اوٹ سے اسی طرح ٹھاٹھا جیسے بدی سے چاند نکل آئے سفید سلک کا مبالا بادہ ہمکورے لیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور اس لبادے کے اوپر سیاہ مل کھائے ہوئے گیسوں میں ایک خوابیاں اور سلگا ہوا ساچہرہ جس کے خدوخال آنکھوں میں گد گدی پیدا کر رہے تھے اور جب وہ برآمدے کی روشنی کی زد سے نکل کر

وہ سارے شاعر ان خیالات سر اسیکی کی دلدل میں جا پھنسے۔ اس دوران میں نہ تو اسے ورنہ احساں رہ گیا تھا اور نہ یہی دھیان تھا کہ سڑک سے کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے۔ کیڈی کے انہی کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے پانی تھوڑا ہی رہ گیا ہو۔ پھر دل تو خیر ملکی میں کافی تھا کار کے پچھلے حصے میں بھی کئی میں بھرے رکھتے تھے۔

اس نے کار روک دی لیکن انہیں بند نہیں کیا۔ چند لمحے کچھ سوچتا ہا پھر کار اسی طرف دی جدھر سے آیا تھا۔ ایک جگہ پہنچ کر اسے دورست نظر آئے جو مختلف سمتوں میں پڑے گئے اور ان کے درمیان گھنا جگل تھا۔ حید کے لئے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ ان میں سے کوئی راستے سے آیا تھا۔ اس نے نیچے اتر کر پہلویوں کے نشانات دیکھنے شروع کئے لیکن بد قسمتی سے زندگی سخت تھی کہ وہ نشانات نہ ملنے پر اس میں سما بھی تو نہیں سکتا تھا اور آسمان تو خیر ازل سے دور ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ آخر کار اس نے جیپ ٹھوٹ کرا ایک روپیہ اور دونوں را ہوں کوڈہن میں رکھ کر ناس کیا۔ روپیہ آواز کے ساتھ زمین پر گرا اور وہ جگ دیکھنے لگا۔

”ہمذ.....!“ وہ آہستہ سے بڑھا یا اور کار اسٹارٹ نکر دی۔ اب وہ تن بہ لقدر یہ ایک را۔ پر ہو لیا۔

کچھ دیر پہلے کی حسین چاندنی کفن یا کسی مقدس کنوادری کی طرح بور لگنے لگی تھی۔ روپیہ چادر اور سانٹے کا ربط ٹوٹ چکا تھا۔ وہ حسین پھرے جو کچھ دیر قبل ذہن کی سطح پر انہرے۔ جھلامت کے غبار میں چھپ گئے اور وہ پختہ سڑک! وہ آدھ گھنٹہ چلتے رہنے کے باوجود بھی نہ ملی۔ کیڈی کا سنجیدہ ترین انہیں پیاس سے بے قابو ہو کر شور مچانے لگا تھا۔

”شامت ہے شامت۔“ حید نے بڑھا کر کیڈی روک دی۔

چند لمحے بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر نیچے اتر آیا۔ پانی کا مسلسلہ بہت ضروری تھا اور نہیں کیا؟ دو جار گھنٹے اور سہی لیکن پانی ہی کہاں مل جائے گا۔ اگر وہ سڑک ہی رہا تو کہیں نہ کہیں کامیابی ضرور ہو جاتی۔ آتے وقت راستے میں اس کی تیلات دیکھتے تھے مگر یہاں جگل میں اگر کوئی ہوتا بھی تو ضروری نہیں کہ اس کی رسا

روش پر آت آئی تو دھنلی چاندنی میں گویا جان پڑی۔
وہ حمید سے ایک گز کے فاصلے پر کھڑی اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھی اور جو کوایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے اپنے جسم کی مشین چلتے چلتے دھنگائی ہو۔
”آپ کون ہیں؟“ تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی اور حمید کو ایسا معلوم ہوا جیسے چاندنی برا اٹھی ہو۔

”مم.... مسافر....!“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”کیا چاہئے؟“ اس بار گھنٹیاں سی نئی اٹھیں اور حمید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آدمی بڑی سیکس اپیل ہے۔

”پانی....!“ حمید نے کیدی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ختم ہو گیا ہے۔“
اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کم سے کم الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہے لڑکی واپس چل گئی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ہولے ہولے ہو ایں تیرتی چلی جاوی ہو۔
حمدید نے جیب سے رومال نکال کر پیسے کی وہ بوندیں خٹک کیں جو اس دوران میں اس پر پھوٹ آئی تھیں۔ دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ لڑکوں کے معاملے میں بالا اناڑی ہی ہو۔ اس سے پہلے کبھی اسے کسی لڑکی کا قرب نہ نصیب ہوا ہو۔

تحوڑی دیر بعد وہ بھر بر آمدے میں دکھائی دی اور اس نے حمید کو اشارے سے بیانی۔
حمدید کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ بر آمدے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہی لڑکی ہے جو کچھ دیر قبل اس کے قریب چاندنی میں کھڑی تھی؟ لباس تو وہی تھا لیکن شکر کے معاملے میں اسے اپنی یادداشت پر پورا پورا اعتماد تھا۔ یہ وہ لڑکی توہر گز نہیں تھی پکھد دیر قبل اسکے حواس خمسہ پر نرمی طرح چھاگئی تھی۔ البتہ اس کی آنکھیں بھی خوابیاں تھیں۔

”راستہ بھٹک گئے ہو۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ آواز میں اتنی دلکشی نہیں تھی۔

”جی ہاں.... کیا آپ براہ مہربانی کا رکے لئے پانی دلوں سیکس کی۔“

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم آدمی ہو۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔

”جی....؟“ حمید کی آنکھیں حرمت سے پھیل گئیں۔

”جس بتاؤ کیا تم آدمی ہو۔“ اس بار اس کی آواز شدت جذبات سے کپکاری تھی۔

”میں نے ابھی تک غوری نہیں کیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر پانی....!“
”اپ کھانا بھی میرے ہی ساتھ کھائیں گے۔“ لڑکی اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں نے پہاں سال بعد آدمی دیکھا ہے۔“
پہاں کر حمید کو بھی سنجیدہ ہو جاتا پڑا۔ اس کے لئے یہ خیال بھی توہین آمیز تھا کہ کوئی لڑکی میں رہی ہو۔

”بیں تو آپ مجھے دری تک دیکھئے۔“ حمید نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”تھہار انام کیا ہے؟“ لڑکی نے حمید کا رہا تھا اپنے اتحاد میں لیتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔ ”ڈیماٹر....!“ حمید بولا۔ ”اور آپ کا۔“

”کنوں؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔ ”میں ایک تالاب میں اُگی تھی۔“
حمدید بدق تھام بھی ضبط کر کے بولا۔ ”اور.... میں.... مجھے کچھ شکاری ہمالیہ پہاڑ سے پکڑ چکے۔ مجھے وہ دون اچھی طرح یاد ہے۔“

”ہمالیہ پہاڑ سے؟“ لڑکی نے پر اشتیاق لبھے میں کہا۔ ”اندر چلو.... یا یہیں بیٹھ جاؤ۔“
حمدید نے وہیں بیٹھنا زیادہ مناسب سمجھا۔

”ہاں تو تم کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”حمدید لمحے غور سے اسے دیکھتا رہا پھر بولا۔“ لیا آپ کے والد صاحب گھر پر تشریف نہیں رکھتے۔“
”والد صاحب کیا ہوتا ہے؟“

”بہت نہ رہتا ہے۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”اگر گھر پر موجود ہو تو آپ جیسی صاحجز ایسا نہیں بنائیں رہتی ہیں۔“

”لیا بھیگ جانے پر اچھی نہیں لگتی۔“ وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

”میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اگر آپ پانی دلوں دیتیں....!“

”پانی ادا..... کھانے کے بعد۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“

”تب تو آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“ لڑکی نے نایوی سے کہا۔

”اچھا مجھے بھوک ہے.... منگوایے کھانا۔“

”ہاں! کل یہ کچھ تھی اور آج کچھ ہے۔ مکنون میں بنتی اور بگرتی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔
”غزالاً اس سلسلے میں کسی انگوٹھی یا چراغ سے مددی جاتی ہوگی۔“ حمید نے انتہائی سمجھدی سے کہا۔
”اوہ...! وہ چوک کر جیرت سے بولی۔“ تو آپ جانتے ہیں۔“

”میں...؟“
”بھی کہ میں ایک جن کے قبضے میں ہوں۔“

”جی ہاں۔ میں نے آپ کے متعلق الف لیلے میں یہی پڑھا تھا۔“ حمید چڑکر بولا۔ دیسے کیا
میں آپ کے والد صاحب کا نام پوچھ سکتا ہوں۔“
”والد صاحب۔“ وہ زیر لب بڑھا دی۔ ”آخر یہ کیا بلا ہے؟“
”مجھے یقین ہے کہ اس وقت وہ بلا گھر میں موجود نہیں ہے۔“ حمید نے اور پری ہوتی بھیجنی کر کہا۔
”آپ کچھ خفا معلوم ہوتے ہیں۔“

”مجھے جلدی ہے! اگر آپ پانی دلوادیتیں تو اچھا تھا۔ دیسے میں پھر کبھی بھی حاضر ہو سکتا ہوں۔“
”کیا میں اتنی رہی ہوں۔“ لڑکی ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔
”آپ غلط سمجھیں مجھے جلد واپس جانا ہے۔“

حمدی کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ پاگل ہے۔
”طاولت... او طالوت۔“ لڑکی نے جھٹی کو آواز دی۔
وہ پھر جھپٹ کر باہر نکلا۔
”کھانا لاؤ۔“

اس نے ایک نیز اٹھا کر ان کے درمیان میں رکھ دی اور اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پھر
واپس آیا۔ وہ اپنے ہاتھوں پر ایک برا ساخوان اٹھائے ہوئے تھا۔
جیسے ہی خوان نیز پر رکھا گیا حمید کے دیوتا کوچ کر گئے۔ خوان میں ایک برا سا سانپ کندی
ملے چمن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں روشنی میں چک رہی تھیں۔
حمدی نے بیٹھے ہی بیٹھے جست لگائی اور دوسرے لمحے میں وہ برآمدے کے نیچے تھا۔
”بیمارتے... میری جان۔“ لڑکی چھٹی ہوئی جپھٹی۔
اُن نے حمید کو بوج لیا اور آہستہ کہنے لگی۔ ”یہ طالوت... سور برداشیہ ہے۔ تم ڈر گئے؟“

”طاولت... او طالوت۔“ لڑکی نے کسی کو آواز دی۔
حمدی بے اختیار جھپٹ پڑا۔ سامنے والے دروازے سے ایک گرانٹیل جھٹی جھپٹ کر
جس نے زمانہ قدیم کے جھٹی غلاموں کا سالاباں پہن رکھا تھا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
”کھانا بیسیں لاؤ۔“ لڑکی نے اس سے کہا۔

جھٹی کے جانے کے بعد حمید اسے چیرست سے دیکھنے لگا۔

”طاولت بڑا و فادر جانور ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب میں تالاب میں اگی تھی تو
کی شکل میں کامیں کرتا ہوا میرے گرد منڈلانے لگا تھا۔“
حمدی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں آپھنسا ہے۔ اس دیرانے میں اس قسم کی عمارت
موجود ہی کم جیرت انگیز نہ تھی۔

”ہاں تو آپ ہمالیہ سے کس طرح لائے گئے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔
”باندھ کر۔“ حمید بولا۔ ”اس وقت میرے پورے جنم پر ایک ایک فٹ بے بال تھے۔
”بال! لیکن اب تو نہیں ہیں۔“
” وجہ یہ ہے کہ میں روز صحیح اور سے نیچے تک شیو کر ڈالتا ہوں۔ میر پر تھوڑے سے
یاد گار جھوڑ دیے ہیں۔“

”اوہ...!“
”تھوڑی دیر تک خاموش رہی پھر حمید بولا۔ ”اور والد صاحب کہاں اگل تھیں جو آپ سے
مجھے ملی تھیں۔“
”کون؟ کیا یہاں؟“ لڑکی کے لمحے میں جیرت تھی۔

”جی ہاں....!“
”لیکن یہاں تو میرے اور طالوت کے علاوہ اور کوئی نہیں۔“
”تو پھر مجھے دھوکا ہوا ہو گا۔“ حمید نے لاپرواںی سے کہا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اُنکے
بیان پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہر چند کہ وہ اُن سے شرات ہی سمجھ رہا تھا پھر بھی اس مکان اور
کمکنون کے متعلق کچھ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو گیا۔
”میر اخیال ہے کہ یہ عمارت زیادہ پرانی نہیں ہے۔“ حمید بہ خیال انداز میں بولا۔

بی خبانیاں... تمہیں شہد میں پر اعتراف تو نہیں۔
”نہیں! اعتراف کیوں ہوتا۔“

”میں سمجھتا ہیم تم اسے قواعد کے رو سے غلط قرار دے دو۔“
”مبت کرنے والے قواعد کی پرواہ نہیں کرتے۔“ لڑکی سنجیدگی سے بولی اور حمید سونپنے لگا
باب اتنی ڈھیٹ لڑکی سے کچھی ملاقات نہ ہو۔

”تو تم محبت کرنا چاہتی ہو۔“ حمید دردناک آواز میں کراہا۔ لیکن اس کی آواز دبی دبی سی تھی۔
ن کا بھی تو خیال تھا کہ اگر اب امیاں قسم کے کوئی بزرگ گھر پر موجود ہی ہوئے تو کیا ہو گا۔
”جیسے جیسا تو تم کون ہو۔“ لڑکی اُس کا ہاتھ دبا کر بولی۔

”اوہر چلو...!“ حمید نے مالتی کی جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا۔
بودنوں برآمدے سے اتر کر روش طے کر کے لان پر آبیٹھے۔ لڑکی سوالیہ انداز میں اُس کی
دیکھ رہی تھی۔

”میری داستان بہت درد بھری ہے۔“ حمید ایک آہ بھر کر خراش کھینچ کر بولا۔ ”آئے غصے دہن
گل... انداز میں رہنے والا شہر بے نسل و مرام کا ہوں اور لوگ مجھے شہزادہ امر و بخت
ما۔“

میدنے محسوس کیا کہ وہ لڑکی ایک بے تحاشہ قسم کے تحقیقے کو نہایت صفائی سے دبائی۔
تلہبہ۔

نیمرے باپ شہنشاہ شلبم نصیب نے مجھے پیدا کرنے کے سلسلے میں ایک خانہ باغ ترتیب دیا
بے دستور نجومیوں سے حکم لگوادیا کہ باہر برس تک عورتیں میری شکل نہ دیکھنے پائیں لیکن
پر حال شہنشاہ شلبم نصیب کہ جب میں پانچ ہی سال کا تھا تو ایک عورت نے مجھے اس طرح
اپنے اُس دن سے یہ حال ہے کہ میں صحر اصرہ جنگل جنگل مارا بھرتا ہوں۔ لہذا کبھی پڑوں
کچھی پانی ختم۔ اس غریب الوطی میں ایک یہہ کچنی کے اجنبی کے چکر میں پڑ کر کار بھی
ماپڑی۔“

”حید آہ مرد بھر کر خاموش ہو گیا۔
کیا پوچھنے لگے۔“ لڑکی تھوڑی دیر بعد بولی۔

”نہیں....!“ حمید دانت بھینچ کر بولا۔ ”شاید یہ پاگل خانہ ہے۔“
”دولت خانہ۔“ لڑکی نے سنجیدگی سے صحیح کی۔

جسی خوان اٹھا کر پھر اندر چلا گیا۔ وہ شروع سے تجھے بند مشین کی طرح حرکت کرتا آیا۔
اس دوران میں ایک بار بھی اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ حمید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ کسی جا
میں پہنچنے والا ہے۔

”خفا ہو کر نہ جاؤ۔“ لڑکی نے اُسے برآمدے کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔
”حمید کا عجیب حال تھا۔ غصہ انہی اور ندامت تیوں نے ایک ساتھ اس پر یلغار کر دی تھی
لڑکی اُسے پھر برآمدے میں کھینچ لے گئی۔

”یہ طالوت.... واقعی بڑا کینہ ہے میں معافی چاہتی ہوں۔“
”حمید حقیقتاً اس فکر میں تھا کہ کسی طرح نکل بھاگے۔
”تو آپ پانی...!“

”آج رات میں نہہر جاؤ تو کیا حرج ہے۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔
”کیوں؟“

”آج وہ جن نہیں آئے گا۔
”محترمہ! یہ بیسویں صدی۔“ ”حید اپنا اوپری ہونٹ بھینچ کر بولا۔ ”آج کل کے لئے
شرارت بیکار ہے۔“

”شرارت! میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“
”حید نے سوچا کہ اس طرح سر مارنا فضول ہے۔ کیوں نہ وہ بھی انہیں خرافات پر اتر آئے
لہذا وہ اپنے حرکات و سکنات میں ڈرامائی انداز بیدار کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کیا یہ چاندنی کل بھی اتنی ہی حسین تھی۔“ ”حید کی آواز خوابیاں تھیں۔
”چاندنی...!“ لڑکی نے سکی سی لی۔

”ایسی ہی چاندنی تو تھی جب میں۔“ ”حید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
”کیا؟“ لڑکی کی آنکھیں کچھ اور نشلی ہو گئیں۔ حید اتفاق میں دیکھنے کی ایکسٹر کر رہا تھا۔
”وہاں.... اس پار.... جہاں بھار کے خوش گلوپر ندے.... طربیہ گیت گاتے ہیں سنہری

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں اس روایہ جن کے پنج سے کس طرح چھڑا اول۔“

”آہ میں اس تابکار خوک پیکر سے تھک آگئی ہوں۔“

”اکی؟“ لڑکی نے پر اشتیاق لجھے میں پوچھا۔

”پچھے لگاؤ کہ اس نے اپنی زندگی کا پیر کر لایا ہے یا نہیں۔“

”نہیں کر لیا۔ میں پوچھے پچھلی ہوں۔“ لڑکی ایک بیساخہ قسم کی مسکراہٹ کو دبا کر بولی۔

”تب تو میں اُسے کسی بیسہ ایجنت کے چکر میں پھنسا کر تمہیں صاف نکال لے جاؤں؟“

”چھ...!“ لڑکی اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ایک بار میں نے بھی اسی طرح اپنی جان بچائی تھی۔“

”کیسے؟ کیا بات تھی۔“

”اب سے ایک سال پہلے کی بات ہے۔“ حمید اپنے پاپ میں تمبا کو بھرتا ہوا اولاد۔

صحر اپھرتا پھر اتنا ایک شہر میں جانکلا..... کہ نام جس کا نگار سلطانہ تھا۔ شہر پناہ کے پھانکے نے ایک جم غنیر دیکھا۔ بہت سے لوگ ایک گدھے کو پکڑے اس کی ناز برداریوں میں تھے۔ جیسے ہی میں نے پھانک میں قدم رکھا گدھے نے دولتیاں جھاڑیں اور ان لوگوں سے کر تیر کی طرف آیا اور میری ناگلوں میں سے اس طرح لکھا کہ میں دوسرا اس کی پیشہ پر سوار تھا۔ لوگوں نے تالیاں بجا کیں نفرے لگائے اور ٹوپیاں اچھالیں۔ پھر اس کی مجھے گدھے پر سے اترنے نہ دیا اور مجھے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے جلوس کی شکل؛ بڑھے۔ میں نے ایک شخص سے کہ مرد عقیل و فہیم معلوم ہو تاھا اس عزت افزاں کی دتواس نے کہا کہ جہاں پناہ بادشاہ بنا دیئے گئے۔“

”بادشاہ۔“ لڑکی کے لجھے میں حرمت تھی۔

”ہاں! یہ اس ملک کی رسم تھی! جب بادشاہ مر جاتا تھا تو لوگ ایک گدھے کو پکڑ کر بادشاہ کا انتخاب کیا کرتے تھے۔ گدھا ہے اپنے اوپر سوار کر لیتا ہی بادشاہ بنا دیا جاتا۔ آئینہ بڑی اچھی تھی لیکن اس مرد عاقل نے ایک بات اور بھی بتائی ہے سن کر مجھے وجہ میں گدھے سے اتر جانا پڑا۔“

مید ناموش ہو کر پاپ سلاکنے لگا۔

ہمیبات تھی!“ لڑکی بے چینی سے بولی۔

اس نے بتایا کہ مرتبے وقت یہ گدھا بادشاہ پر سوار ہو جاتا ہے اور اس وقت تک تمہیں اُترتا ہے۔ اس کا دام نہ تکل جائے۔ بہر حال میں نے گدھے سے اُتر کر شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ مجمع نے کہا کہ شاہی گدھے کی توہین نہیں برداشت کی تمہیں اس کی آنکھوں کی کمزوری کا ثبوت پیش کرنا پڑے گا۔ بات بڑھ گئی آخر فیصلہ یہ ہوا ہے کو کسی ماہرا مراض چشم کے پاس لے جایا جائے۔ قصہ مختصر یہ کہ گدھے کی آنکھیں ٹھیک نہیں اور واقعی وہ کمزور نہیں۔ گدھے کے لئے چشمہ خریدا گیا۔ چشمہ لگتے ہی کمخت نے یہی طرف رخ کیا۔ میں نے پھر غل غپڑہ مچایا کہ یہ نئے میں معلوم ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے کو پکڑ لیا۔ کیونکہ انتخاب کی ساعت میں پچھلی تھی۔ انہوں نے کہا کہ انتخاب کل ہو گا۔ ہاتھ تھا ہی ساتھ رہے گا۔ تو اے تاز نین پری تھا۔ گدھا میرے پیچھے لگ گیا۔ بجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کس طرح یہ چھا چھڑا گا۔ آخر ایک تدبیر سوچ گئی۔ میں یہہ کمپنی کے ایجنت کی تلاش شروع کر دی۔ تدبیر مہربان تھی کہ جلد ہی مل گیا۔ میں نے گدھے کا تعارف کر لیا اور وہاں سے نود گیا رہا ہو گیا۔ پھر کافی رات گئے ایجنت کے ٹھکانے ہ گیا۔ گدھا وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے وہ رات ایجنت ہی کے یہاں بسر کی اور رات بھر ہوئے کے لائق ٹھیں میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ میں بھی اپنی زندگی کا بیسہ کراؤں گا۔ دن گھنی میں میں اُسے اپنے ساتھ لے کر شہر پناہ کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ پہلے دن کی نا گھنی کافی بھیز تھی۔ گدھا چشمہ لگائے اداں کھڑا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اپنی سے بیزار ہو۔ جیسے ہی دونوں وہاں پہنچے وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا میری طرف بڑھنے کیلئے ایجنت نے کمکھار کر اے اپنی طرف متوجہ کیا اور اس پر نظر پڑتے ہی گدھے کا گلہ۔ ایجنت اس کے پیچھے دوڑتا ہوا جیچ رہا تھا۔ منے تو سہی مسٹر۔ خدارا مستقبل کے لئے کچھ پڑا۔ آپ کے پھوٹے چھوٹے پچھے.... آپ کے بوڑھے مال باپ.... آپ کی عزیز از نعمتیں.... پھر گدھے نے کسی طرح جان نہ پکتی دیکھ کر ایک کنویں میں چھلانگ مال طرح میں بادشاہ بننے بننے پی گیا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ گدھا کثرت سے براثنی پیتا

آسمانی فارس

نہ جانے کب تک حمید پر وہ عجیب و غریب نیند طاری رہی۔ دوسرے دن... اگر سورج کی کرنیں سید ہی اس کے چہرے پر نہ پر تیس تو وہ سوتا ہی رہتا۔ رخال نیند کا سلسلہ نوٹ گیا اور اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ کیڈی ہی میں بستر کر رہا تھا لیکن پلی سیٹ پر لیٹھے لیئے وہ کھڑا کر انھوں بیٹھ۔ ڈرامیوں کرنے والے کی پشت اُس کی طرف تھی اور وہ پکڑ فریڈی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

چچلی رات کے سارے واقعات حمید کے ذہن میں چکر لگا رہے تھے۔ اُس نے ایک بار پھر ہمیں مل کر چاروں طرف دیکھا اور اسے یقین آگیا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا ہے۔ ساتھ ہی یہی کی آواز بھی سنائی دی۔

”آرام فرمائیے! آرام فرمائیے آپ انھوں بیٹھے۔“

حمدی نے جست لگائی اور اُس کے برابر پہنچ گیا۔ کیڈی شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ”میں کہاں تھا؟“ حمید نے بے ساختہ پوچھا۔

فریڈی نے اُسے گھوڑ کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھنے لگا۔

”میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔“ حمید نے پھر کہا۔ فریڈی اپنے ہونٹ سچنچنے خاموش رہا۔ حمید کی بوکھلا بہث اور بڑھ گئی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ کافی اُسے معلوم نہیں کہاں اور کس حال میں پایا ہو۔

”میں تمہارا تبادلہ کر ادینے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔“ فریڈی تھوڑی دیر بعد بولا۔

”تبادلہ تورات ہی کو ہو گیا ہوتا... مگر...!“

”میں کوئی سڑی بھی داستان یا اس حرکت کا جواز سننے کے لئے تیار نہیں۔“

”میں کہتا ہوں میری بات تو سننے۔“

”اُس کی ضرورت نہیں۔“

”اچھا تو یہی بتاو جائے کہ میں آپ کو کہاں اور کس حال میں ملا تھا۔“

”حمدی! کو اس مت کرو۔“

”تم۔ واللہ اعلم بالصواب۔“

لوگی بے تحاشہ نہ رہی تھی۔ حمید نے اتنی دیر میں بناوٹ کا سارا جاہل توڑ دیا تھا۔ دیریں تک ہفتی رہی پھر یہ کیک سنجیدہ ہو گئی اور مضھل آواز میں بولی۔

”پیارے امرود بخت مجھے کسی طرح نکال لے چلو۔ ہائے یہ چاندنی رات اور اُس کا جن کا تصور بھی میرے لئے تکلیف دہ ہے۔“

”اگر تمہیں یقین ہے کہ اُس نے اپنی زندگی کا بیسہ نہیں کرایا تو تمہیں اس قدر دلوادوں گا۔ دوسری بات یہ کہ اب مجھے جانا چاہئے... اور پانی۔“

”نہ جاؤ پیارے امرود بخت...!“ لوگی ٹھنک کر بولی۔

”اف فو! مجھے یہ کمپنی کا ایک ایجنت بھی تو تلاش کرتا ہے۔“

”اچھا کھانا تو کھالو۔“

”بجھنے! اگر اس باروہ طالوت کا پچ...!“

”اوہ! تم سمجھے نہیں تھے۔ دراصل کھانا تیار نہ رہا ہو گا۔ اسی لئے اس نے جھلا کر کی ہو گی۔“

”خیر! آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ واقعی آپ کمال کی آدمی ہیں۔ جب بھی اگذروں گا آپ سے ضرور ملوں گا۔ اب تو آپ سنجیدگی سے اپنا تعارف کرو تجھے۔“

لوگی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”میں سمجھی نہیں۔“

حمدی نے سوچا اب اسے کچھ اور سمجھانا بیکار ہے۔ پھر کبھی سمجھا جائے گا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں برآمدے میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ دونوں میں وہی پہا

تکنی گفتگو چڑھی ہوئی تھی۔ لیکن حمید سوچ رہا تھا کہ کھانے بہت لذیز ہیں۔ خصوصاً شام کا کھانا تھا۔

کھاتے وقت اسے کچھ نیند آنے لگی۔ باہر چاندنی کی خنک چادر پھیلی ہوئی تھی اور اس کو خوبصوردار شایع گلڑے گل رہے تھے۔ آنکھوں کے پپٹوں میں گد گدی ہو رہی تھی اور اس کو ہڈی میں سر و رانگیز لہریں تھیں اس کا دہنہا تھے چچے سمیت اٹھا ہی رہ گیا اور اسے گہری نہ

تھا۔

”ہیاہیشہ کے لئے۔“ حید نے ذرماں انداز میں پوچھا۔
”مگر آؤٹ۔“

”میں کچھ نہیں کہتا۔“ حید انتہا ہوا بولا۔ ”اگر آپ کسی غلط فہمی میں بجا ہیں تو بتلار ہے بن اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ نے مجھے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔“

فریدی اُسے غور سے دیکھ رہا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ حید کے الفاظ کو تو لئے کی کوشش رہا ہے۔
”کیوں؟“ وہ آہستہ سے بولا۔

”بات کچھ ایسی ہی ہے کہ جس پر آپ یقین نہیں کریں گے۔“

”ہوں!“ فریدی اپنے ہونٹ بھیجن کر رہا گیا۔

”میں اگلی سیٹ پر تھا یا بچھلی پر۔“

”بچھلی پر...!“

”اور کار کہاں تھی۔“

”مرڑک کے کنارے۔“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”مرڑک کے کنارے۔“ حید نے اپنی کبوڑی سہلاتے ہوئے دہر لیا۔

”اب کوئی لیکی داستان دھرا دو جس پر مجھے یقین آجائے۔“

”آف فوہا! یہ تو میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

”ضرور یقین کروں گا۔ کیونکہ تمہارے ساتھ شہین کی دو خالی بوتلیں بھی تھیں۔“

”بوتلیں؟“ حید آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

”چبوور مت کرو! وفع ہو جاؤ۔“

”عجیب مصیبت ہے۔“

”جاؤ بابا جاؤ... میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ میں اب کسی بات کیلئے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”میں شاید جہنم سے بھی اسی طرح نکال دیا جاؤں۔“ حید اپنے جیب میں پڑے ہوئے پاپ کو

ٹوٹا ہوا بولا۔

”تمہارے ساتھ کون تھا۔“

”بڑی مصیبت ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ حید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ اسے یقین تھا فریدی اس کی داستان سن کر صرف قہقہے لگائے گا۔ یہ بھی اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ پہلی رات کو اُسے بے وقوف بیالا گیا تھا۔ شاہی نکڑے کھاتے وقت طاری ہونے والی غنوڈی اُسے یاد تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پھر اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا فریدی اُسے اسی عمارت سے لایا ہے یا کہیں اور سے؟ کوئی پہنچ کر فریدی حید کی طرف دیکھے بغیر اترنا اور اندر چلا گیا۔ حید چند منٹ بیٹھا کپکو سوچتا رہا پھر کیڑی گیراج میں لے جا کر کھڑی کر دی۔

فریدی اندر ونی برآمدے میں ٹھیل رہا تھا اور اس کا موڈ زیادہ خراب تھا۔ حید چپ چاپ اُر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ فریدی نے ایک بار پھر اسے گھوڑ کر دیکھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ حید کی لجسن بڑھتی جا رہی تھی۔ آخر فریدی نے اُسے کہاں اور کس حال میں پایا تھا۔ وہ بھی اس کے کمرے میں چلا گیا۔

”بہتر ہی ہے کہ تم اس وقت کہیں مل جاؤ۔“ فریدی اس کی طرف مڑ کر بولا۔

”میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔“ حید مسکرا کر بولا۔

”میرا موڈ بہت خراب ہے۔“

”آپ تو اس طرح تاؤ کھارہ ہے ہیں جیسے میں آپ کی کنوڑی لڑکی ہوں۔“ حید اپر ہونٹ بھیجن کر بولا۔ ”اور آپ نے مجھے کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لیا ہو۔“

فریدی پھر اسے گھوننے لگا۔

”اگر آپ فوراً ہی سیدھے نہ ہو گئے تو شاید آپ کو پچھتا پڑے۔“ حید نے کہا۔

”سُب چلو۔“ فریدی سگار سلاگتا ہوا بولا۔ ”لیکن تمہاری ان حرکتوں کی بنا پر مجھے بڑا ندامت ہوتی ہے۔“

”کن حرکتوں کی بناء پر؟“

”مجھے چڑھا رہے ہو؟“ فریدی تیز لمحے میں بولا۔

”سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“

”بہتر ہی ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

ہیا لوگی... وہ نہ جانے کون تھی اور کیا تھی۔ کتنی عجیب تھی... چال کتنی حرمت انگیز تھی۔“
ہر بت انگیز نہیں بلکہ قیامت کہو۔” فریدی منہ بنا کر بولا۔ “تمہاری بدولت مجھے کافی
مندی ہوئی ہے۔ پولیس کی ایک گشتوں لاری لے کر تمہاری تلاش میں جانا پڑا اور تم جس حال
مالے اس کا تو اس بھی تقاضا تھا کہ میں ڈوب مرتا۔“
”پھر آپ نے وہی بات کہی۔“ حمید جھنگلا کر بولا۔ ”آپ کوں ڈوب مرتے کیا میں آپ کی
بچھتہ ہوں۔“

فریدی کو پھر غصہ آگیا اور حمید موقع کی نزاکت کا حساس کر کے اس کی بیٹھے تھکنے لگا۔
”خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ایک بار دیکھا ہے، اور دوسری بار
بیٹھے کی ہوں ہے میں اسی عمارت کے قریب ہی کہیں ایک جھوپڑی ڈالنے والا ہوں۔“

”چھوڑو ختم کرو۔“ فریدی اکتا کر امتحنا ہوا بولا۔ ”اب اگر تم نے کبھی بلا ضرورت شراب
تھال کی تو میں تمہیں وہ حکم دے کر نکال دوں گا۔“

”اس وقت ایشیا کا عظیم ترین سراغ رسان بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔“ حمید نے ہونٹ
کوڑ کر کہا اور فریدی کی پلٹ پڑا۔ قمل اس کے کہ وہ کچھ کہتا حمید پھر بولا۔ ”اگر میں آپ کو دلاور گر
کے قریب ہی کہیں ملا تھا تو یقیناً میں نے شمپین کی دو بوتلیں صاف کر دی ہوں گی۔ غصب
لداک شمپین کی دو بوتلیں اور میں اسکی تک زندہ ہوں۔ کیا میں دلاور گر کے قریب ہی ملا تھا۔“
”نہیں۔“ فریدی نے بیزاری سے کہا۔
”پھر کتنا قابل رہا ہو گا۔“

”فضول وقت نہ برپا کرو۔“ فریدی لاپرواٹی سے بولا حمید کے خیال دلانے پر وہ بھی اس
کل پر سمجھی گئے غور کرنے لگا تھا۔ حمید اسے دلاور گر سے تقریباً پینتیس چالیس میل کے
فاتحے پر ملا تھا۔ شمپین کی دو بوتلیں صاف کر دینے کے بعد اتنی دور کا سفر شاید فولاد کے آدمی سے
نگرانہ ہو سکتا اور یہ چیز بھی تقریباً ممکن تھی کہ حمید نے اتنا سفر کر پکنے کے بعد رک کر دو
بوتلیں پہنچائی ہوں۔ یہ بات فریدی بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ حمید شراب کا عادی نہیں ہے۔
”مر کی بات یہ کہ اگر کوئی عورت وہاں اس کے ساتھ آئی اور اسی کی ترغیب پر حمید نے یہ حرکت
کرنا الگ تو پھر وہ خود کہاں ٹھکی۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنی دور پیدل تونے گئی ہو گی۔“

”کیا کسی دوسرے کا سراغ بھی پیا جاتا ہے۔“ حمید نے پوچھا۔
”آئینہ دیکھو...!“ فریدی نے ڈرینگ میبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”میں سچ کہتا ہوں کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“ حمید فریدی کی طرف مڑ کر بولا۔

”خیر آپ یقین کریں یا میں مجھے وہ داستان دہرانی ہی پڑے گی۔“ حمید نے کہا۔
اور پھر اس نے الف لیلی والی داستان شروع کر دی۔ فریدی لاپرواٹی سے سنا تھا نہ تو
ہنسی آئی اور نہ اس نے کسی موقع پر حرمت ہی کا انطباق کیا جس حمید سب کچھ کہہ چکا تو فریدی
ہونٹوں پر ایک خفیہ سی مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

”یہ کہانی بیسویں صدی کے معیار سے مطابقت نہیں رکھتی۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن شاید میں
نہیں جانتے کہ وہ عمارت کس کی ہے؟“
”نہیں میں نہیں جانتا۔“

”اگر جانتے ہوئے تو اس سے کم از کم اس قسم کی کوئی داستان منسوب نہ کرتے۔“
”کیوں؟ وہ کس کی ہے۔“

”ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی کی۔“

”ڈاکٹر نارنگ کی؟“ حمید کی آنکھیں حرمت سے بھلی گئیں۔ ڈاکٹر نارنگ وہ پھر بڑا بیل
اے حقیقتاً حرمت تھی۔ ڈاکٹر نارنگ نہ صرف اس شہر بلکہ پورے ملک کے مشہور تن
آدمیوں میں سے تھا۔ نہ صرف اعلیٰ حکام بلکہ وزراء تک اس کا احترام کرتے تھے۔ بہر حال؟
متین تھا کہ وہ اس ڈرامے سے کیا مطلب اخذ کرے جو پچھلی رات اس عمارت میں کھیلا گیا تھا۔
یہ بھی جانتا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ غیر شادی شدہ تھا۔ لہذا یہ بھی نہیں سوچا جاسکتا کہ وہ اس کی رہی ہو گی۔

”کیوں؟ کیا سوچنے لے گے؟“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اب اصل واقعہ بیان کر جاؤ۔“

”خدا کی قسم میں نے جو کچھ بھی کہا ہے اس میں ایک فیصدی بھی جھوٹ نہیں۔“

فریدی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔
”خیر...!“ حمید آہستہ سے بڑا بیل۔ ”میں پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ آپ یقین نہ کریں گے۔“

فریدی نے پھر حمید کی طرف دیکھا جو اس طرح ہوت سکوڑے بیٹھا تھا جیسے سیئن بجا ارادہ کر رہا ہو۔

”آج تمہیں پاگل خانے میں داخل ہونا ہے۔“ فریدی نے مسجد گیت سے کہا۔

”میا....؟“ حمید بے سانتہ اچھل پڑا اور فریدی کے ہونٹوں پر شراست آمیز مسکراہٹ در پاگل... خانے.... میں۔“ فریدی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ ”میرا خیال ساجد حقیقتاً پاگل نہیں ہے۔“

”کون ساجد؟“

”بگر قتل فرید والا کیس بھول گئے۔“

”کرتل فرید۔“ حمید اپنے ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔

”چھ ماہ قبل کی بات ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بھلا تمہیں کیوں یاد ہو گی۔ کرتل ف پراسرار طریقے پر قتل کر دیا گیا تھا اور جس کی ہمین غائب ہو گئی تھی۔“

”نہ جانے کتنوں کی بہنیں روزانہ غائب ہوتی رہتی ہیں۔ میں کہاں تک خیال رکھوں۔“

مسکرا کر بولا۔

”تب پھر تمہیں اس کیں کی تفصیل کہاں یاد ہو گی۔ معاملہ تقریباً دب ہی گیا تھا۔ لیکن رات کو....!“

”دفعائیلی فون کی گھٹنی بھی۔“ فریدی نے ریسیور اٹھایا۔

”ہیلو! فریدی بول رہا ہے.... اے۔“

فریدی کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ پڑا.... اور اس نے مظہریانہ انداز میں اُتھایا۔ ”ہیلو.... ہیلو.... کہاں.... کیسے؟.... آتا ہوں۔“ وہ ریسیور رکھ کر تیزی سے طرف مژا۔

”چلو....؟“ وہ دروازے کی طرف بھاگا۔

حمداس کے پیچے دوڑ رہا تھا۔

گیراج سے کار نکلتے وقت اس کے ہاتھ کا پہنچا ہے تھے۔ حمید نے کبھی اسے اس مال نہیں دیکھا تھا۔

”میا ہے۔“ اس نے گھٹنی گھٹنی سی آواز میں پوچھا۔

”وزیر خزانہ۔“ فریدی تھوک نگل کر بولا۔ ”وزیر خزانہ بھرے مجھ میں قتل کر دیے گئے۔“

”بھرے مجھ میں۔“ حمید اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

کیڈیلاک سڑک پر فرانٹ بھرتی رہی اور وہ دونوں خاموش رہے۔ تھوڑے تو حمید نے یہ پوچھا کہ مارڈ کہاں ہوا اور نہیں فریدی نے بتایا۔ اس کی آنکھیں وٹا اسکریں پر جھی ہوئی تھیں اور ہاتھ بیڑنگ پر حرکت کر رہے تھے۔ اس کے علاوہ اور بقیہ جسم قطعی بے جان معلوم ہوتا تھا۔

حمدید کار میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنے چہرے سے لپ اسک کے دھبے صاف رہا تھا۔

”اپنے بہاں سے کس کس کی ڈبوٹی تھی۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

”کئی انپکٹر تھے، پرمنڈٹ بھی تھے۔ بڑی حیرت کی بات ہے۔ وزیر خزانہ کی مخالفت کہیں نہیں تھی۔ نیک نام وزراء میں سے تھے۔“

”یہ حداث کہاں ہوا۔“

”میونور سی میں.... وہ شعبہ فلکیات کا انتظام کر رہے تھے۔ تفصیل نہیں معلوم ہو سکی۔“

”قاتل ضرور پکڑ لیا گیا ہو گا۔“ حمید بولا۔

”قاتل....!“ فریدی آہستہ سے بڑا لیا۔ ”کسی نے شاید قاتل کی شکل بھی نہ دیکھی ہو۔“

”کیوں....؟“ حمید چوک کر بولا۔

”مل اس وقت تمہیں یہی بتانے جا رہا تھا کہ فون کی گھٹنی بخے گئی تھی۔“

”کیا؟“

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی پیشانی پر سلوٹس پڑی ہوئی تھیں۔

اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو حمید اس کی خاموشی پر جھنجھلا جاتا۔ لیکن خود اس کا ذہن اس نے اپنے سوال کا دھیان لٹک نہ رہا۔

یونور سی کی کپاڈن پولیس والوں سے بھری تھی۔ ہر طرف سرخ گپڑیاں اور خاکی ٹوپیاں نظر آرئی تھیں۔ خصوصاً جلسہ گاہ جو کئی بڑے بڑے شامیانوں پر مشتمل تھی عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ فریدی اور حمید بھیزی میں گھستے چلے گئے۔ ڈاکس کے گرد پولیس آفسروں نے گھیرا اڈاں دیا تھا

ڈاکس پر شہر کے اعلیٰ حکام اور کچھ مہرزاں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ انہیں میں فریدی کے ٹھیک آئی۔ جی اور ڈی۔ آئی۔ جی بھی تھے۔ ڈاکس کے دامنے سرے پر ایک نہ ہبی پیشوا دعا کیس پڑھ رہا فریدی کو دیکھ کر ڈی آئی تھی نے اسے ڈاکس پر آنے کا اشارہ کیا۔

گولی مقتول کی پیشانی پر لگی تھی۔ حمید نے لاش پر سے اپنی نظریں فوراً ہٹالیں۔ بدجنت کے مختلف سوچ رہا تھا جس نے اتنے اچھے آدمی کو موت کی آغوش میں دھکیل دیا تھا میں ان کی غلام و دستی اور خدا ترسی کی دھوم تھی۔ نہ جانے کتنے یتیم اور بیوائیں انہیں کے ہمراز زندگی بسر کر رہی تھیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک لاش کی طرف دیکھتا رہا پھر ڈی۔ آئی۔ جی اسے ڈاکس کے اتار لے گیا۔ حمید بھی ساتھ تھا۔

”میں نے ہی تمہیں فون کیا تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی فریدی سے کہہ رہا تھا۔ ”اُف میرے غد نہ جانے وہ کیا بala تھی۔ میں یہیں موجود تھا... وہ تقریر کر رہے تھے۔“

”قاتل...؟“ فریدی نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”کہاں کا قاتل، کیسا قاتل، نہ جانے وہ کیا چیز تھی۔“ مکن توڑا تک جیسی نہیں تھی؟ آواز ویسی ہی تھی۔“

فریدی نہ خیال انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”فنا میں تیرتی ہوئی آئی تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہتا رہا۔ ”بُن ایک لخت ڈاکس کے سامنے رہی اور آڑی میل فشر دوسرے لمحے میں نیچے آتی۔“

”اور وہ پھر اسی طرح دابیں گئی جیسی آئی تھی؟“ فریدی نے کہا۔ ”ڈی۔ آئی۔ جی اثبات میں سر ہلا کر بولا۔“ پھر میں نے تو دیکھا نہیں۔ لوگوں کا بیان ہے کہ تیر کی طرح اور پچھتی چلی گئی... اور پھر نظریوں سے غائب ہو گئی۔“

حمدید سوچ رہا تھا کہ کیا فریدی پہلے ہی سے واقع تھا۔ اس کا یہ جملہ کہ کسی نے شاید قاتل شکل بھی نہ دیکھی ہو۔ اسی پر دلالت کرتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ ”آڑی میل فشر تقریر کر رہے تھے؟“ فریدی نے پوچھا۔ ”ہاں انہوں نے تقریر شروع ہی کی تھی۔“

”مایک سے کتنے فاصلے پر تھے۔“

”وہی جو فاصلہ عموماً کھا جاتا ہے۔“

”مایک کہاں گیا؟“ فریدی مصطفیٰ بانہ انداز میں چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”مایک.... بھی مایک سے کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے دلی سے کہا۔ ”پتہ نہیں اس انفری میں کیا ہوا۔“

”میں مایک کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں ہے کسی کے حواس درست نہیں۔ تمہیں کیا الزام دوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا اور ڈاکس کی طرف چلا گیا۔

فریدی مجسمانہ نظریوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ”آخر مایک کیوں۔“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی نے کوئی جواب نہ دیا وہ بھی ڈاکس کی طرف جا رہا تھا۔ اس نے ڈاکس پر کھڑے ہو کر روں طرف نظریں دوڑائیں۔

”اوہ....!“ اس کے منہ سے بے ساختہ لکھا اور وہ ڈاکس سے اتر کر سیدھا اس طرف پہنچاں۔ ان نائکروفن کے لوازمات اکٹھا تھا۔ وہ چند لمحے ان کا جائزہ لیتا رہا پھر حمید سے بولا۔

”تم یہیں پھر وہ... یہ ساری چیزیں روکی جائیں گی۔“

”وہ پھر ڈی۔ آئی۔ جی کے پاس واپس آیا۔“

”میں نے وہ سارا سامان رکوادیا ہے؟“

”کون سا....؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”نائکروفن کے لوازمات۔“

”بھی اس سے کیا ہو گا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنجلا کر بولا۔

”کیا وہ مشین اتنی بڑی تھی کہ اس میں کم از کم ایک آدمی بیٹھ سکے۔“ فریدی نے سوال کیا۔

”نہیں اتنی بڑی نہیں تھی۔“

”تب پھر مشینیں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتیں۔ میڑو کپنی میں جہاں سے نائکروفن آیا ہے تک پھر مشینیں اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتیں۔“ میڑو کپنی میں جہاں سے نائکروفن آیا ہے

”تلخا فرمت میں پہرہ لگانا چاہیے تاکہ کوئی چیز ادھر سے اور ہرنہ ہونے پائے۔“

”اور....!“ ڈی۔ آئی۔ جی اسے غور سے دیکھنے لگا۔
”جلدی بچجئے۔“ فریدی نے کہا اور بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دوسرہ حملہ

ایک گھنٹے کے اندر اندر پورا ملک سراستیگی کا شکار ہو گیا تھا۔ اخبارات کے ضمیمے چھپ رہے تھے۔ شہر میں تو ایسا سنا تھا جیسے قبرستان ہو۔ دو کافیں بند تھیں۔ سڑکوں پر فوجی دستے گز کر رہے تھے۔ راہ گیر گوشیوں میں گفتگو کرتے اوہر سے اوہر نکل جاتے اگر کسی کے ہونوں مسکراہٹ بھی آئی تو وہ دوسرے ہی لمحے میں چوک کر اس طرح سمجھیہ ہو جاتا جیسے اس سے یہ کلاش کے سر ہانے سر زد ہوئی ہو۔

وزیر خزانہ بہت اچھے آدمی تھے اور جب کوئی بہت اچھا آدمی قتل کر دیا جاتا ہے تو کافیں ذرہ ذرہ سو گوار معلوم ہونے لگتا ہے۔ ہواں تک آہیں بھرنے لگتی ہیں۔
عام آدمیوں سے زیادہ لوگ پریشان تھے جن کی ذمہ داری مقتول کی جلسہ گاہ سے گھ سلامت واپس جانے ہی پر ختم ہو سکتی تھی۔ بھکر سراغ رسانی کی عمارت کے بڑے کمرے میں سب اکٹھا تھے۔

آئی۔ جی کا چہرہ اُترنا ہوا تھا اور اس کے گرد بیٹھے ہوئے دوسرے آفسر ایک دوسرے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ چند لمحے پیشتر ان کے درمیان... گرام گرم بھیش ہوئی تھیں اور افیصلہ ہوئے بغیر ختم بھی ہو گئیں تھیں۔

اس آسمانی رائفل کا مسئلہ اتنا آسان نہیں تھا کہ چند گھنٹوں کی نشست میں اس کی تہہ پہنچا جاسکتا۔ اس کے متعلق تواتا بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ وہ آئی کس سمت سے تھی اور کس سمت۔ دیکھنے والے صرف اتنا بات کہتے تھے کہ وہ ایک لبے اور لمبائی کی مناسبت سے بہت ہی چوڑے صندوق کی محلل کی تھی۔ فائر کی آواز ایسی ہی تھی جیسی کسی رائفل کی ہوتی ہے۔

انپکٹ آصف انپکٹ ماہر کی طرف جھکا ہوا آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”شولاک ہو مز کے صاحب ندارد ہیں۔ خواخواہ میثرو والوں کے پیچے پڑ گیا ہے۔ میرے شیر کی ہربات نہیں!“

”بھالا ایکروں سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔“
انپکٹ ماہر کوئی جواب دینے کے بجائے دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ آئی۔ جی اپنی بھاری کمرانی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”یہ درست ہے کہ اس آسمانی حربے کے سامنے کبھی بے بس تھے نہ سوال تو یہ ہے کہ کسی ایسے حربے کا وجود ہی کیوں! آخر ہم سب کس لئے ہیں۔ مجھے اپنے بھگے فرخا۔“

کوئی کچھ نہ بولا۔ سب کو جیسے سانپ سو گنگہ گیا ہو۔
”مجھے سب سے زیادہ شکایت تم سے ہے۔“ آئی۔ جی کی آواز پھر سنائی دی۔
اور ان سب کی نظریں دروازے کی طرف اٹھ گئیں کیونکہ آئی۔ جی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ بازے میں انپکٹ فریدی دلکھائی دیا۔ اس کے پیچے سرجنت حمید تھا۔ دونوں کے چہروں سے لن کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

”مجھے انہوں ہے کہ میں کچھ نہ کر سکا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھے۔ حمید کے ریک کا کوئی آدمی مینگ میں موجود نہیں تھا۔ اس لئے وہ اٹھے پاؤں واپس چلا گیا۔

”ماں کیروں فون کا کیا تصدہ تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خیال پیدا ہوا تھا۔ لیکن فی الحال کوئی مقبضہ برآمد نہیں ہو سکا۔ ویسے میں اب بھی بھی اہوں کہ اس حدادنے کا کچھ نہ کچھ تعلق ماں کیروں فون سے ضرور ہے۔“

”کیوں؟“

”اُمگی سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی کہ مخفین آدمی کی قوت ارادی کی پابند ہو جائیں۔ وہ نہیں کی میکانیکی ہی سسٹم کے تحت چلتی ہوں گی۔“

فریدی کی خاموش ہو گیا۔

”ٹھیک ہے! کہتے جاؤ۔“ آئی۔ جی بولا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ وہ یقیناً اور اس ہی سے کنٹرول بالا ہو گی۔“

”اور اس میں ٹیلی ویژن سسٹم کا بھی دخل معلوم ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”اکی لئے میں ماٹیک پر زور دے رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اگر ہم یہ نہیں تسلیم کرتے تو پھر ہمیں یہ مانا پڑے گا کہ وہ کسی آدمی کی قوت ارادی عین پابند ہے۔ اسے چلانے والے نے سوچ لیا کہ آزمیں منذر کو ختم کرتا ہے۔ لہذا وہ مشین انہیں تلاش میں چل پڑی۔“

آئی۔ جی۔ کچھ نہ بولا۔ شاید اسے فریدی کا لہجہ تاگوار گزرا تھا۔

”شاید آپ کو وہ اڑن بھی نہیں۔“ اسپکٹر آصف فریدی کو مخاطب کر کے بولا۔ ”جنو پچھے جنگ عظیم میں جرمنوں نے استعمال کئے تھے۔“

”اڑن بھ۔....! آئی۔ جی۔ آصف کو گھوڑے نے لگا۔“ ان کا یہاں کیا سوال؟“

”اڑن بھوں کا سشم دوسرا تھا۔“ فریدی نے آصف کو مخاطب کیا۔ ”ان کی اڑان اور میں سمت اور فاصلے کے تعین کو دخل تھا۔ اس لئے وہ بعض اوقات غلط جگہوں پر بھی گرفتار ہیں۔ فرض کیجئے وہ برلن سے لندن کے لئے روانہ ہو گئے تو وہ ادھر ادھر بھکتے ہوئے لندن میں پہنچیں گے۔ انہیں بکنڈول کرنے والی مشین انہیں لندن کی سمت برلن اور لندن کے درمیان فاصلہ کا تعین کر کے روانہ کرے گی۔ بس اتنے ہی فاصلے پر پہنچ کر وہ گرجائیں گے چاہے وہ لندن ہو چاہے کوئی اور جگہ۔ سمت کے تعین میں ذرا سی بھی غلطی انہیں لندن کے بجائے کہیں اور سکتی ہے۔“

”غیر متعلق بحث سے کیا فائدہ۔“ آئی۔ جی۔ نے اسے ٹوکا۔

”ہاں تو جتاب والا میں یہ عرض کر رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ آزمیں منذر کے گرے افراتفری کے دوران میں ماں یکروfon بدلتا گیا۔“

آئی۔ جی۔ حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

”وہ شخص جو میڑو کپنی کی طرف سے ماں یکروfon پر مامور تھا، حرast میں ہے۔“ فریدی بھر بولا۔ ”اس کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ جلسہ شروع ہونے سے آدھا گھنٹہ قبل ماں یکروfon خراب ہو گیا تھا۔ اس نے اسے بنانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ اتنے میں ایک آدمی یہ تجویز پیش کی کہ کپنی سے دوسرا منگوالیا جائے چونکہ ماں یکروfon کی دیکھ بھال کرنے والا اس نے خود جانا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر اس نامعلوم آدمی نے کہا کہ اگر وہ ماں یکروfon طلبی کے لئے تحریر دے دے تو وہ متلوں میں لا سکتا ہے۔ حافظ نے فیر کے نام ایک پچھے

”ویا اور وہ آدمی دوسرا ماں یکروfon لے آیا۔“

”اوہ....!“

”لیکن جلسہ گاہ میں بعد کو جو ماں یکروfon ملے۔ اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔“

”خاص بات؟“

”یعنی ان کا مکہبز مردی تھا جو عام طور پر ہوتا ہے۔“

”اُس دوسرے آدمی کا پیٹہ چلا۔“ آئی۔ جی۔ نے پوچھا۔

”میں نہیں! اس میڑو کے فیجر کا بیان ہے کہ دوسرے آدمی کا میکروfon جلسہ گاہ میں گیا ہی نہیں رہنا۔ اس صورت و شکل کا کوئی آدمی اس نکل کچھ تھا۔ دوسرے آدمی کا میکروfon جو جلسہ گاہ میں ملا تھا اس کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ میڑو کپنی کا نہیں تھا۔ ویسے اس پر میڑو کپنی ہی کا نام درج تھا۔ ہردو لا اور ڈاپسیکر سروس۔“

آئی۔ جی۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔

”حقیقتاً تم مجھے کی ناک ہو۔“

فریدی کے ساتھیوں کے منہ چڑھ گئے لیکن ڈی۔ آئی۔ جی۔ بے اختیار مسکرا پڑا تھا۔ یہ سکر اہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے کوئی باپ اپنے بچے کی تعریف کی دوسرے سے سن کر کھل اٹھے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر آئی۔ جی۔ نے کہا۔

”تواب کیا کرتا چاہئے۔“

”ڈی۔ آئی۔ جی۔ صاحب میرے طریقہ کار سے بخوبی واقف ہیں۔“ فریدی تھوڑے توقف کے بعد بولا۔

اُس پر ڈی۔ آئی۔ جی۔ نے آئی۔ جی کی طرف جگ کر آہستہ سے کچھ کہا اور آئی۔ جی پر خیال انداز میں سر ہلانے لگا۔

کچھ درپورے کرے میں سر گوشیاں ہوتی رہیں پھر آئی۔ جی کی آواز سنائی دی۔

”بہر حال آپ لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھئے۔ یہ کیس خاص طور سے کسی کے پیرو نہیں کیا ہے۔ ہر ایک کو کوشش کرنی ہے۔“

اُن محض سر ہدایت کے بعد مینگ برخاست ہو گئی۔ سب چلے گئے لیکن فریدی وہیں

موجود رہا۔

”اب بتاؤ۔“ ذی۔ آئی۔ جی فریدی کی طرف مخاطب ہوا۔ آئی۔ جی کی نظریں بھی اس
چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”میں نے چھپلی رات اس را اکٹل کو پرواز کرتے دیکھا تھا۔“ فریدی نے کہا۔

”کیا....؟“ دونوں بیک وقت بولے۔

”اور میرا خیال اُسی طرف گیا تھا۔“

”تو کیا تم پہلے ہی سے اس کے متعلق جانتے تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”تھوازابہت۔“

”پھر بھی تم نے کچھ نہ کیا؟“

”کل رات سے قبل مجھے اس کے وجود پر یقین نہیں تھا۔“ فریدی نے کہا۔ ”حقیقتاً کل رار
بھی مجھے یقین والث نہیں تھا۔ اس کا تو اس وقت خیال آیا جب میں نے حادثے کی خبر سنی تھی۔“

”تم نے اُسے کہاں دیکھا تھا؟“

”شہر کے اتری حصے میں وہ زیادہ بہنڈی پر نہیں تھی۔“

”مدد ہرگئی تھی؟“

”شرق کی سمت!“ فریدی۔ لہا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لوگ اس کا انتخاب کر رہے تھے،“

”تو کیا تم ان لوگوں سے بھی وان甫 ہو۔“

”بھی نہیں۔“

”بہر حال تم نے اپی معلومات کو چھپا کر اچھا نہیں کیا۔“ آئی۔ جی کا لجھ ناخوٹگوار تھا۔

”بنات والا.... معلومات کی نوعیت ہی اسکی نہیں تھی کہ جس پر فوری ایکشن کیا جائے کہ۔“

”یعنی....!“

فریدی نے ذی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”آپ کو کرٹل فرید کا کسی تو یاد ہو گا۔“

”کرٹل فرید۔“ ذی۔ آئی۔ جی ذہن پر زور دیتا ہوا بولا۔ ”وہ جس کی بہن....!“

”جی ہاں! اوہی....!“

”کیا کیس تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”کرٹل فرید! ایک ریٹائرڈ فوجی تھا۔“ فریدی بولا۔ ”دولت مدد مگر شریف قوم کے لوگوں
میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اب سے چھ ماہ قبل کسی نے اس کی کوئی بھی نیت میں قتل کر دیا۔ اس کی
بین قتل والی رات ہی سے غائب ہے اس کا پرائیوریٹ سکریٹری اس حادثے کے بعد پاگل ہو گیا تھا
جو آج بھی پاگل خانے میں ہے۔ بہن کرٹل ہی کے ساتھ رہتی تھی۔“

”لیکن اس معاملے سے اس کا کیا تعلق....؟“ آئی۔ جی اتنا کہا بولا۔
”وہی عرض کرنے جا رہا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔ ”ایک ہفتہ قبل کی بات ہے کہ ایک ایسے
آدمی سے ملاقات ہوئی جو کرٹل کے پرانے ساتھیوں میں سے تھا۔ دوزان گفتگو میں اس سے پتہ
چلا کہ کرٹل ایک اچھا میکینک اور انجینئر بھی تھا۔ وائرلیس اور میلی ویژن اس کے محظوظ ترین
موضعات تھے اور وہ بچھلے کئی سالوں سے اس گلری میں تھا کہ انہیں کی بنیادوں پر کوئی ہزار یار
کرنے اس وقت میں نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہ دی تھی لیکن جب بچھلی رات پرواز کرنی ہوئی وہ
ئے مجھے نظر آئی تو قدرتی طور پر اس شخص کے الفاظ مجھے یاد آگئے۔“

”کیس کا انچاپر ج کون تھا؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔
” غالباً اس پکٹر سدھیر۔“ فریدی نے کہا۔ ”میں اس زمانے میں گارسائیں والے معاملے میں
المجاہد ہوا تھا۔ بہر حال کرٹل کے قتل کی نہ تو آج تک وجہ معلوم ہو سکی اور نہ قاتل ہی کا سارا غلام
اور اس کی بہن کی حریت انگیز روپوشنی ابھی تک پروفہر راز میں ہے۔ سدھیر کا خیال ہے کہ شاید وہ
بھی قتل میں شریک تھی۔ لیکن میں واقعات کی روشنی میں ایسا سمجھنے کے لئے تیار نہیں۔ کرٹل کا
یکریٹری پولیس کو عجیب حالت میں ملا تھا۔ کرٹل کی بہن کے بستر پر خون کے چھوٹے چھوٹے
دھبے تھے اور وہ اس طرح بے ترتیب تھا کہ جیسے اس پر سونے والے کو کسی سے جدا جہد کرنی پڑی ہو۔“
”تو کر کہاں تھے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”شاگرد پیشہ میں جو کوئی تھی سے کافی فاصلے پر ہے اور انہیں صبح ہی اس حادثے کی اطلاع ہوئی تھی۔“
”کچھ اس کا بھی اندازہ ہے کہ ان تمام معاملات میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔“ آئی۔ جی نے پوچھا۔
”فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

کافی دیر تک ان تینوں میں بحیثیں ہوتی رہیں۔ لیکن آخر میں متوجه وہی صفر، نہ کوئی فیملے
اور کا اور نہ طریق کارہی کا تعین کیا جاسکا۔

فریدی نے اطمینان کا سانس لیا۔ حمید کے گولی نہیں لگی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے گلروں ناس کا چہرہ زخمی کر دیا تھا اور خود فریدی کی پیشانی کا رخ بھی انہیں ٹکزوں کے لگنے کا نتیجہ تھا۔ اس نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کیا اور راگیر سے بولا۔

”ٹھیک ہے! سب ٹھیک ہے۔“

”کسی نے اس پیلی کار سے گولی چلانی تھی۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میں نے خود دیکھا تھا۔ یہ کیا فت آگئی ہے اس شہر میں۔“

”گولی! نہیں کسی شریرنچے نے پھر پھیکا تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”کمال کرتے ہیں آپ اپنے جناب میں نے خود دیکھا تھا۔“

”آپ کو دھوکا ہوا ہو گا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

راگیر جیسے ایک دوسرے کامنہ دیکھتے رہ گئے۔

کیدیلاک سول ہسپتال کی طرف جا رہی تھی۔

حمد تھوڑی دیر بعد کسمایا اور کراہ کر سیدھا ہو گیا۔ سامنے لگے ہوئے آئینے پر نظر پڑتے ہی بکھری ہی جیچ نکل گئی۔ اس کا سارا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

”چھوٹا مت۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”گھبر اؤ نہیں زخم گھرے نہیں ہیں۔ منھی منھی رچیں معلوم ہوتی ہیں۔“

”اوہ آپ بھی تو۔“

”میری فکر مت کرو۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”بُل تقدیر ہی تھی... ورنہ... گولی میرے اپنے شانے کو چھوٹی ہوئی نکل گئی ہے۔ اگر کوٹ میں شولڈر پیڈنہ ہوتا، تو ہڈی صاف تھی۔ البتہ چھپلی سیٹ بر باد ہونے کا افسوس ہے۔“

حمد نے پٹ کر دیکھا۔ چھپلی سیٹ میں بڑا سارا رخ تھا۔

”تو کیا وہی را لفٹ تھی۔“ حمید بول کھلا کر بولا۔

”نہیں گولی ایک کار سے چلانی گئی تھی۔“

”کمار سے۔“

”ہاں اور وہ محفل تمہاری وجہ سے نکل گئی۔ میں سمجھا شاید تم اللہ کو پیارے ہو گئے۔“

فریدی کے دوسرے ساتھی ماں سیکر و فون کے محافظ کے تباۓ ہوئے جلیے سے چھٹے ہوئے تھے وہ انہیں رینا ٹرینگ روم میں چھوڑ کر مسکرا تاہو باہر آگیا۔

شہر کی حالت اب تک ویسی ہی تھی۔ دیرانی اور سو گواری میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ فریدی کی کیدیلاک تیزی سے سڑک پر پھسل رہی تھی۔ حمید اور وہ خاموش تھے غالباً وہ دونوں اس سے بھی بے خبر تھے کہ ایک دوسری کار کیڈیلاک کا تعاقب کر رہی ہے۔

”فی الحال ساجد ہی والی کڑی اپنے ہاتھ میں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”کون ساجد۔“ حمید نے پوچھا۔

”وہی کرٹل کے فریدی کا سیکر ٹھیری جو پاگل خانے میں ہے۔ اس سے کرٹل کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا تھا۔ بنے ہوئے پاگلوں کو راہ راست پر لانا بڑا دشوار کام ہے اور کرٹل کی بہن کا سراغ! نہ تو اس کا کوئی فونو ہی دستیاب ہو سکا اور نہ مکمل حلیہ اعلیے کے متعلق اختلاف پیانیاں پائی جاتی ہیں۔ البتہ ایک چیز سب کے بیانات میں مشترک ہے اور وہ ہے اس لڑکی کی جاہ۔ سب یہاں کہتے ہیں کہ چلتے وقت وہ میں سے کچھ اوپر تیرتی ہوئی سی معلوم ہوتی ہے۔“

”کیا؟“ حمید بے ساختہ اچھل پڑا۔ لیکن اس کی جیسے ایک سینڈ بھی قائم نہ رہ سکی۔ کوئی کہ اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کے کان کے قریب ہی ایک فائزہ ہوا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں فریدی کی جیچ سنائی دی اور حمید کے چہرے پر لا تھاد جھبڑیاں ہی آئکر لگیں کیدیلاک ایک جھیکے کے ساتھ رک گئی۔

”یہ حادثہ ایک سنسان سڑک پر ہوا تھا۔ دو ایک لوگ جو ادھر سے گزر رہے تھے فریدی کی کار کی طرف جھپٹے۔ فریدی اپنی پیشانی دبائے حمید پر جھکا ہوا تھا۔ جس کا سر سیٹ کی پشت سے مکر ایک طرف ڈھلک گیا تھا۔ حمید کے چہرے پر کمی جگہ خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ فریدی بنے اسے سنجھانے کے لئے اپنی پیشانی سے باٹھ ہٹالیا اور اس کے چہرے پر بھی خون کی چادر پھیل گئی۔“

”ٹھہریے۔ ٹھہریے۔“ ایک راگیر اس کی مدد کے لئے لپکا۔ چار پانچ آدمی کار کے گرد اکٹھا ہو گئے تھے۔

کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔

”مکاش گولی میرنے ہی لگی ہوتی۔“ حمید شندھی سانس بھر کر بولا۔ ”اب میرے چہرے پر شمارگنگ کے داغ ہوں گے اور کوئی لڑکی میری طرف دیکھنا بھی گوارانہ کرے گی۔“
”لڑکی...!“ فریدی نے منہ بنا کر کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔
”ہائے۔“ حمید آہستہ سے کہا۔
”میں نے مائیکروفن کے معاملے میں بلڈچاکر غلطی کی تھی۔“ فریدی بولا۔

پُر اسرارِ مسٹر کیو

اس حیرت انگریز رائل کے مقتول نہ صرف شہر یا ملک بلکہ ساری دنیا میں چر میگہ ہو رہی تھیں۔ خصوصاً شہر کے لوگ تو نبیری طرح سبھے ہوئے تھے۔ ملک کی سر بر آور دہڑھ خوف اور اندیشون کا شکار ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن کے اخبار نے وزیر خزانہ کے قتل کے ساتھ ہی محکمہ سراغ رسانی کے بہترین افراد پر حملہ کی بھی خبر چھاپی تھی۔ اخبار بینچے والے گلی کوچوں میں چینخت پھر رہے تھے۔
”محکمہ سراغ رسانی کے دو آفسروں پر بھی قاتلانہ حملہ، دونوں آفسروں اپنے زخموں ڈرینگ کرنے کے بعد حیرت انگریز طریقے پر غائب ہو گئے۔“

یہ فریدی اور حمید کے زخمی اور غائب ہونے کی خبر تھی۔ انہوں نے سول ہسپتال میں اس زخموں کی ڈرینگ کرالی تھی اور پھر اپنے حملے کے اعلیٰ آفسروں کو اطلاع دیئے بغیر روپوش ہوا تھے۔ اخبارات کی اطلاع تودراصل یہی تھی لیکن عام آدمی اسے کیا سمجھتے کہ اسی دن محکمہ سراغ رسانی کے ڈی۔ آئی۔ جی کی کار دلاور گنگر کی طرف کیوں جا رہی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی کے ساتھ سپرنشنڈنٹ اور دو انپکٹر بھی تھے۔ ڈی۔ آئی۔ جی خود کار ڈرائیور رہا تھا۔ پینتیس میل پنچتہ سڑک پر چلنے کے بعد کار ایک کچے راستے پر مڑ گئی۔ پھر وہ اس عمارت میں داخل ہوتی دکھائی دی جس میں سرجنٹ حمید نے ایک حیرت انگیز رات گذاری تھی۔
ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی عمارت میں موجود تھا۔ اسے محکمہ سراغ رسانی کے آفسروں کا کوئی میں دیکھ کر حیرت نہ ہوئی کیونکہ وہ مقتول مسٹر کے گھرے دوستوں میں سے تھا۔

بلڈ نمبر 9

ڈاکٹر نارنگ دوسرے بدن کا ایک لمبا تر نگاہ آدمی تھا۔ عمر پچاس اور سامنے کے درمیان میں رہی۔ لیکن صحت مند ہونے کی بناء پر یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا ہے۔ آہستہ آہستہ گفتگو کرنے کا عادی تھا اور دوران گفتگو میں اپنی نظریں خاطب کے چہرے پر ہٹائے رکھتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ اسے کبھی کسی سے کرخت آواز میں گفتگو کرتے نہیں سنائیں۔

”میں ان تمام لوگوں سے مل رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”جن سے متقول منظر کے قریبی تعلقات تھے۔“

”میں بھی انہی بد نصیبوں میں سے ایک ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز کیپا گئی۔

پھر ڈی۔ آئی۔ جی کافی دیر تک متقول کے دوسرے دوستوں کے متعلق پوچھ گجھ کر تارہا۔ رب واپسی کیلئے بالکل تیار تھا تو اس نے اپاٹک ڈاکٹر نارنگ سے کہا۔ ”مجھے ایک شکایت بھی ہے۔“
”کہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے میز پر رکھے ہوئے گلدان کی طرف نظر جاتے ہوئے کہا۔

”یہاں پر سو رات کو میرے بھکے کے ایک آدمی کے ساتھ براخطر ناک مذاق کیا گیا۔“

”یہاں.....!“ ڈاکٹر نارنگ چوک چوک پڑا۔ ”میں نہیں سمجھا۔“

”کسی صاحبزادوی نے اسے کوئی نشہ آور چیز کھلادی تھی۔“

”صاحبزادوی نے۔“ ڈاکٹر نارنگ کے لنجھے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، وہ راستہ بھلک کر اوہر نکل آیا تھا۔“

”اُسے غلط فہمی ہو گئی ہو گی۔ یہ حادثہ کہیں اور پیش آیا ہو گا۔“

”اُسے یقین ہے؟“

”تب اس نے خواب ہی دیکھا ہو گا۔“ ڈاکٹر نارنگ مسکرا کر بولا۔ ”یہاں ہمیشہ اس عمارت کا منتظم چند نوکروں کے ساتھ رہتا ہے اور وہ بھی میری ہی طرح تجدی کی زندگی سر کر رہا ہے۔ میں زیادہ تر شہر میں رہتا ہوں۔ کبھی کبھی اوہر بھی آنکھا ہوں۔ پرستوں میں یہاں جیس تھا۔ یہاں کسی لوگی کی موجودگی سرے ہی سے متعلقہ خیز معلوم ہوتی ہے۔“

”میرا خیال ہے کہ اس طرف اس ساخت کی کوئی اور عمارت نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔
”نہیں۔“

”اس نے بالکل بھی نقشہ بتایا تھا۔ جو میں اس عمارت کا دیکھ رہا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی۔ حجی
”محظی حیرت ہے۔“

”اس نے ایک جبشی غلام کا بھی ذکر کیا تھا۔“

”جبشی غلام۔“ ڈاکٹر نارنگ بے ساختہ ہنس پڑا۔ ”تب تو اس نے حقیقتاً خواب دیکھا ہو گا۔
”دو لاکیاں تھیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اسی کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”ان میں سے ایک
ایسی تھی ہے ہم عرصہ سے تلاش کر رہے ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ یک بیک سخیدہ ہو گیا اور پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ چند لمحے بعد ایک قدر
صورت نوجوان اندر داخل ہوا۔ جس نے سر کا سوت پہن رکھا تھا اور گردون میں شوخر گموں
تائی تھی۔

”پرسوں رات کو یہاں کون تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ نے اس سے پوچھا۔

”حج... حج... کوئی بھی تو نہیں... کوئی نہیں۔“ منتظم ہلکا نگاہ۔

”جھوٹ مت بولو۔“

”جی کوئی نہیں... میں... میں... سس... حج... حج...!“

”ہلکا کیوں رہے ہو... کوئی ضرور تھا۔“ ڈاکٹر نارنگ کی آواز بلند ہو گئی اور سیکریٹری کا پیغام

”حج... حج... مم... مم... معافی چاہتا ہوں۔“

”کون تھا...؟“

”ڈاکٹر کرنگا...!“

”یہ کیا بلا ہے۔“

”فلم ڈائرکٹر، میرا دوست ہے۔ اور ہر شونک کی غرض سے آیا تھا۔ میں نے آپ کی اجازہ
کے بغیر ٹھہرایا تھا۔ معافی چاہتا ہوں۔“

”کوئی جبشی بھی تھا ان کے ساتھ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“

”اور دو لاکیاں بھی۔“

”جی نہیں صرف ایک تھی کنوں۔“

”کسی سافر کو یہ تو فہ بنا یا گیا تھا؟“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔

”جی ہاں... وہ کنوں کی شرارت تھی... میں منع کرتا رہا... مگر؟“

”اُسے کوئی نشہ آور چیز دی گئی تھی۔“ نارنگ نے پوچھا۔

”نشہ آور... اوہ... شاید وہ اسی لئے سو گیا تھا۔“

”صاف صاف بتاؤ۔“

”اُسے یہ تو فہ بنانے کا پروگرام کنوں ہی نے بنا یا تھا۔“ منتظم نے کہا اور شروع سے آخر

مک پوری داستان دہرانے کے بعد بولا۔ ”کنوں اور جبشی کے علاوہ کوئی اور اس کے سامنے نہیں

ہے۔ پھر کنوں نے اُسے کھانا کھلایا اور کھاتے ہی کھاتے وہ سو گیا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کوئی نشہ آور

نیز تھی۔ پھر ہم اُسے اسی کی کار میں ڈال کر سڑک پر چھوڑئے تھے۔“

”تم جانتے ہو کہ تم لوگوں نے کتنا برا جرم کیا ہے؟“ نارنگ بولا۔ ”اگر وہ سانپ اُسے کاث لیتا تو۔“

”جی... دراصل اُس میں زہر نہیں تھا۔ ناگ اُسے کسی میں کی شونک کے لئے لایا تھا۔“

”لیکن کسی کو کوئی نشہ آور چیز کھلادینا بھی جرم ہے۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم گرگر کیا۔

”لڑکیاں دو تھیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جی نہیں ایک تھی۔“

”تمہاری بدولت مجھے ذلتِ نصیب ہوئی۔“ ڈاکٹر نارنگ کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا وہ

ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف سڑک بولا۔ ”آپ اسے لے جائیے اور جو کار وائی مناسب سمجھئے مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”میں معافی چاہتا ہوں۔“ منتظم پھر گرگر کیا۔

”دوسری لڑکی کون تھی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گرج کر پوچھا۔

”حج... حج... دوسری لڑکی.... مم... ناگ کی محبوبہ تھی۔“

”تم نے اب تک اُسے چھپایا کیوں تھا۔“

”وہ... نن... ناگ...!“

”مگر اُو نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نرم لمحہ میں بولا۔ ”میں نارنگ جی کی بدنتی کے خیال سے

«حضور میں تباہ ہو جاؤں گا۔» نتفظم گر گزایا۔

تھیں میں منٹ کے اندر اندر کوٹھی چھوڑ دینی ہے۔“ڈاکٹر نارگ نے خشک لبجے میں کہا رانٹ کر باہر چلا گیا۔

نتظام اس کے عادت و اطوار سے اچھی طرح واقع تھا اور اس لبجے کو خوب سمجھتا تھا۔ چاروں پار اس نے اپنی ضروری چیزیں ایک سوت کیس میں بھریں اور باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر نارگ مالٹی کی ماریوں کے قریب آم کے درخت کے سامنے میں کھڑا تھا۔ اس نے نتفظم کو جاتے دیکھا اور منہ بیڑ لیا۔

سوٹ کیس دزمنی تھا۔ بھی وہ اُسے ہاتھ میں لٹکاتا اور کبھی کاندھے پر رکھ لیتا۔ ساتھ ہی اتحو وہ یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ کب تک اور کہاں تک اس طرح جائے گا۔

کچھ راستے کے دوسرا موت تک پہنچنے پہنچنے اس کے دونوں ہاتھ شانوں سے علیحدہ ہوتے طوم ہونے لگے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح وہ پہنچنے سڑک تک پہنچ ہی گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں رہا تھا کہ کدھر جائے۔

وہ غفتگوست مخالف بے ایک کا یہ آتی دکھائی دی۔ چونکہ وہ اسکرین سورج کے سامنے نہیں تھا لئے کارڈ رائیو کرنے والے کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرت کی لہر دوڑ گئی رودہ ہاتھ انھا کر پہنچنے۔“تاگر...!“

کار اس کے قریب آ کر رک گئی۔

”بیلوراجن... کہاں؟“ کارڈ رائیو کرنے والے نے کہا۔

”ارے یار کیا بتاؤ۔... شاید اس وقت پیدل ہی شہر جانا پڑتا۔“

”بھلا کیوں؟ چلو سوت کیس اندر رکھ دو۔“

راجن نے بچھلی سیٹ کی کھڑکی کھول کر سوت کیس رکھ دیا۔ اب اس نے دیکھا کہ بچھلی سیٹ پر ایک آدمی اور بھی تھا۔ اس نے مسکرا کر سوت کیس رکھوانے میں مدد دی۔ راجن کے لئے صورت نبی تھی۔

”اوھر آ جاؤ۔“ تاگر نے اگلی سیٹ کی کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔

راجن بیٹھ گیا اور کارچل پڑی۔ رفتار زیادہ تیز نہیں تھی۔

تمہیں درمیان میں نہ لاوں گا۔“

نتظام تھوڑی دیر تک سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر تھوک نگل کر بولا۔“ پہلے وہی لڑکی باہر ہوئی تھی پھر اُس نے اندر جا کر اُس سافر کا تذکرہ کیا۔ تاگر اندر تھا اس نے جماں کر باہر دیکھا اور کوئی سے تھوڑی دیر تک سر گوشیاں کر تاہم پھر اُس نے کنوں کو باہر بیچ کر اس لڑکی کو ایک کمر میں بند کر دیا۔ میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگا کہ وہ سافر دراصل ایک ایسا ریس ہے جو اس کی محبو پر ڈورے ڈالنے کی فکر کر رہا ہے.... وہ اُسے اچھی طرح یہاں وقف بنا کر رخصت کرے گا۔ اسی بعد اس نے مجھ سے کہا کہ میں اس لڑکی کا تذکرہ کسی سے نہ کروں کیونکہ وہ اسے بزم پر ڈیورس روں سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”تمہیں اس لڑکی سے گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا تھا۔“

”بھی نہیں وہ بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اس کی آنکھوں...!“

”ہاں ہاں کہو! اگھر اُو نہیں۔“

”اس کی آنکھوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بیداری میں بھی کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔“

”تم ناگر کو کب سے جانتے ہو۔“

”بچھلے ماہ اس سے شہر میں ملاقات ہوئی تھی۔“

”یہاں بچھلی بار آیا تھا۔“

”نہیں دوسری بار۔ اس سے پہلے بھی اس نے یہاں دو تین دن تک قیام کیا تھا۔ لیکن اُن

وقت وہ اکیلا ہی تھا۔“

”اس کا پتہ۔“

”سولہ پرنس اسکو اُر... دولت گنج۔“

”سپر نئندھن نے پتہ نوٹ کیا اور ڈی۔ آئی۔ بھی نے ہاتھ کے اشارے سے گفتگو کا سلسلہ کر دیا۔“

”جاو...!“ ڈاکٹر نارگ سیکریٹری کو گھورتا رہا۔ پھر ڈی۔ آئی۔ بھی بولا۔ ”مجھے اس واقعہ افسوس ہے۔“

”اب بہتر بھی ہے کہ تم اپنا بستر گول کرو۔“

”پولیس تمہاری تلاش میں ہے۔“ راجن ہاپٹا ہوا بولا۔ ”تمہاری ہی وجہ سے مجھے مار سے ہاتھ دھونے پڑے۔ میں تمہیں منع کر رہا تھا۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی تھی۔ وہ آدمی درا ملکہ سراغ رسانی کا کوئی آفسر تھا۔ یاریک بتاؤ وہ لڑکی کون تھی۔“

تاگر ہٹنے لگا۔ ”پرواہ مت کرو پیارے۔ میرا بہت بڑا... کاروبار ہے۔“

”مگر.... میں نے پولیس کو سب کچھ بتایا ہے۔ البتہ تمہارا پتہ بتاتے وقت مجھے ہوش تھا.... اور میں نے صحیح پتہ نہیں بتایا۔“

”کسی بات کی فکر مت کرو۔“ تاگر گردن جھک کر بولا۔

”یقین بتاو، وہ لڑکی کون ہے۔“

”میری محبوبہ! میں اُسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کہیں سے بھگا کر لائے ہوں۔“

”ہاں....!“ تاگر نے کہا اور اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔

کاراکپے راستے پر مر گئی۔

”اوھر کہاں؟“ راجن نے پوچھا۔

”جلد پنچیں گے کم از کم دس میل کا فرق پڑ جائے گا۔“

راستہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ دنوں طرف سرکندوں کی اوچی اور جھاڑیاں تھیں۔

”اور کیا پوچھا تھا پولیس والوں نے۔“

”اور تو کچھ بھی نہیں لیکن حیرت ہے کہ انہوں نے مجھے اس خیال سے گرفتار نہیں کر اس میں ڈاکٹر ناگ کی بدنامی تھی اور ڈاکٹر ناگ نے مجھے اس طرح نکال دیا۔“

”فی الحال تم شہر میں کہاں جاتے۔“ تاگر نے پوچھا۔ ”کیا کوئی تمہارا دوست یا عزیز دہاں ہے۔“

”کوئی نہیں! میں تمہارے ہی پاس جاتا اور پھر کوئی اور انتقام کرتا۔“

تاگر نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر راجن بولا۔

”یارہ کنول بڑی تیز لڑکی ہے۔“

”کیوں.... کہیں عاشق تو نہیں ہو گئے اس پر۔“ تاگر نے بحمد اسا قہقهہ لگایا۔

”پہ نہیں کیوں وہ میرے ذہن پر نہری طرح چھا گئی ہے۔“

”تو پھر عشق اور کسے کہتے ہیں۔“

”عشق بہت اوچی چیز ہے۔“ راجن سنجدگی سے بولا۔

رنگتارا جن کے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی نے دنوں ہاتھوں سے اس کی گردن پکڑ لی۔ راجن نے ترپ کر پلتا چاہا لیکن دوسرا لمحے میں اس کے منہ پر ایک گھونسہ پڑا.... اور کار رک گئی۔ اگر کے اندر شدید قسم کی جدوجہد ہو رہی تھی۔ تاگر نے دوسرا گھونسہ مارا اور راجن کی نکسیر ثوٹ گئیں وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹا دیئے ہوئے پھر ہاتھ اٹھایا لیکن اس بار اسی کا جبڑہ راجن کے ہاتھوں بیکاڑ ہو گیا۔

راجن کار سے نیچے کو دیگا۔ وہ دنوں بھی اس کی طرف جھپٹے لیکن شاید راجن لڑنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ وہ بے تھا شے ایک طرف دوڑنے لگا... وہ دنوں اس کا تعاقب کر رہے تھے۔ رنجتارا ہمیں طرف کی جھاڑیوں سے ایک فائز ہوا۔ راجن نے بھاگتے بھاگتے جیخ کر ایک جست کا گلی اور گر کر ترپے لگا۔ اس کی کپٹی سے خون کا فوارہ نکل رہا تھا۔

تعاقب کرنے والے رک کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ پھر دنوں اس طرف جھپٹے جہر سے فائز ہوا تھا۔ جھاڑیاں سنسان پڑی تھیں۔ البتہ ان میں بارود کی بھلی سی بوچھلی ہوئی تھی۔ دنوں چند لمحے اذھر اور بھر دیکھتے رہے پھر راجن کی طرف لوٹ آئے جو جھٹکا ہو چکا تھا۔ انہوں نے کار کا پچھلا حصہ کھوں کر پڑوں کے تین کنٹر نکالے اور انہیں لاٹر پر خالی کرنے لگے۔ ”نہ جانے کون تھا؟“ تاگر کے ساتھ والے نے کہا۔

”مشرکیو (Q) کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔“

”مشرکیو!“ دوسرا ایک پکاپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”آخریہ مشرکیو ہے کون؟“

”کام کرو کام۔“ تاگر نے مضطربانہ انداز میں کہا۔ ”کہیں تمہاری کھوڑی میں بھی چھٹاک بھر نہ سزہ اتر جائے۔“

”یار میں تھک آگیا ہوں.... اس کام سے۔“ دوسرا بولا۔

”معلوم ہوتا ہے.... بچ جھ.... موت منڈلاری ہے تمہارے سر پر۔“

پڑوں ڈال دینے کے بعد وہ لاش سے دور ہٹ گئے۔ پھر تاگر نے ایک دیساں لگائیں سلکا کر لاش

کی طرف اچھا دی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہاں آگ ہی آگ تھی۔ واپسی پر انہیں کارمند پرچہ ملا جس پر تحریر تھا ”اپنے کام سے کام رکھو! اور حکم کی تعقیل کرو! مسٹر کو کے متعلق کہہ موت کو دعوت دینا ہے۔“

حمدید پاگل خانے میں

سرجنٹ حمید نے چیڑے لگا رکھے تھے۔ آنکھوں میں وحشت تھی اور شیو بڑھا ہوا تھا۔ بے ترتیب تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے ان میں برسوں سے تیل نہ پڑا ہو۔ سر میں خس دنالہ اور گرد و غبار کا عالم یہ ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ حق مجھ پاگل ہو۔ چہرے پر متعدد چھوٹے چھوٹے زخم جن پر کھڑتے بننے لگی تھی۔ اس کے شناساؤں میں سے اگر کوئی اُسے اس عال میں دیکھ لیتا تو ہرگز بیچان سکتا۔

وہ تین دن سے اس موقع پر شہر بھر میں مارا مارا بھر رہا تھا کہ شاید کوئی اللہ کا بندہ اُسے پا خانے بھجوادے۔ لیکن وہ ابھی تک تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ اس دوران میں نے متعدد شرارتیں کی تھیں مگر لوگوں نے اسے پاگل خانے بھجوادیں کی جائے اس کی حرکت میں خاصی دلچسپی لی۔ عموماً اس کے پیچھے ہر وقت چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاصی بھیز ہوا کرنی تھی۔ اس نے فریدی سے کہا کہ اس درود سری سے کیا فائدہ، براؤ راست اسے پاگل خانے میں دیا جائے۔ لیکن فریدی نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ فریدی کا کہنا تھا کہ مجرم بہت مقتول معاہوت ہوتے ہیں۔ ذرا سی غلطی پوری ایسیم پر پانی پھیر لکتی ہے۔

جس دن سے ان دونوں پر حملہ ہوا تھا فریدی بہت زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔ خود روپوشی ادا کر کے اسی نے ذی۔ آئی۔ جی سے استدعا کی تھی کہ وہ ذاکر ناگر کے سے مل کر حمید والے معاملے تحقیق کرے۔۔۔ اور یہ معاملہ تواب کافی روشنی میں آپکا تھا کہ وہ لڑکی جو حمید کو اس عمارت پہلے نظر آئی تھی کر کل فرید کی روپوش بہن نادرہ ہی تھی۔ ذی۔ آئی۔ جی نے ذاکر ناگر کے سے جو پتہ حاصل کیا تھا وہ سرے ہی سے بیکار ثابت ہوا۔ اس عمارت میں ناگر نام کا کوئی آدمی نہ رہتا تھا اور قلمی دنیا میں بھی کوئی اس نام سے واقف نہیں تھا۔ نہ کنول نامی کسی ایکٹر لیں ہی کا ر

ل کا اور اس خبر نے تو ذی۔ آئی۔ جی کی رہی سہی امیدوں پر پانی ہی پھیر دیا کہ ذاکر ناگر نے پیغمبر کو اسی دن بر طرف کر دیا تھا۔ بہر حال اب راجن کی بھی تلاش جاری تھی۔

ان دو تین دنوں کے دوران میں حمید کو بعض اوقات ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے وہ حق مجھ

اکل ہو گیا ہو۔ وہ قریب بہر وقت دعا مانگا کرتا تھا کہ اے پاک پروردگار اپنی پہلی فرست میں پاگل خانے بھجوادے۔ ورنہ یہ پیچھے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے چلنے والے شریر بچے مجھے حق مجھ اکل بنا دیں گے۔ اپنی ایسیم کامیاب ہوتے نہ دیکھ کر اس نے کہی بار سوچا کہ اب عورتوں کو بھی چھیڑنا شروع کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ عورتوں کو چھیرنے والے کو کسی طرح معاف نہیں کیا جاتا خواہ پاگل آدمی ہو خواہ پاگل کتنا۔ بعض اوقات تو لوگ ایسے پاگل کے کو بھی مار مار کر آدمی ہائیتے ہیں۔

آج صبح ہی سے وہ ادھر ادھر اچھل کو دچھاتا پھر رہا تھا۔ کسی کو مسکرا کر آنکھ مارتا، کسی کو منہ چھلایا اور کسی کو چوچنے دکھاتا۔ صبح ہی اس نے سب سے پہلی شرارت یہ کی تھی کہ ایک چوراہے کے گول چھوڑتے پر جا چڑھا تھا۔ تریک کا سپاہی موجود نہیں تھا۔ اس لئے اس کے فرائض انجام دینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ وہ ناچ ناچ کر گذرتی ہوئی کاروں کو گذرنے اور رکنے کے اشارے کرتا۔ ڈرائیور مخفی بھس کر اسے گھونسہ دکھاتے اور گذر جاتے۔

وہ تقریباً آدھے گھنٹے تک بھی کرتا رہا۔ پھر ڈیوٹی والا تریک کا نشیبل آگیا اور اس نے بدقت تمام اسے چھوڑتے سے ہٹایا۔ لیکن وہ بھی اسے پاگل خانے بھجوادیں پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔ حمید دل ہی دل میں اسے گالیاں دے کر وہاں سے ہٹ گیا۔

لیکن آج اس نے تھیہ کر لیا تھا کہ وہ پاگل خانے ضرور جائے گا۔

بڑے چوک میں پیچ کر حق مجھ اُسے اپنی قسم جاگی معلوم ہونے لگی۔ اس نے ذہنرک مجھریٹ کو دیکھا جو اپنی کار سے اٹر کر فٹ پا تھے پر چڑھ رہا تھا۔ حمید نے سوچا کہ یہ آخری موقعہ ہے۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے نکل گیا تو پھر مرتے دم تک پاگل خانے کا دیدار نصیب نہیں ہو گا۔

ہائے جانی سنو تو سہی۔ حمید ذہنرک مجھریٹ کے پیچھے لپکتا ہوا بولا۔

ذہنرک مجھریٹ چلتا رہا۔

”او نیلی ہیست... پلٹ میری جان... ہائے رکو جانی... نیلی ہیست... نیلی ہیست۔“

ڈسٹرکٹ محیطہ بیٹ پلٹ پڑا۔
حمدینے بینے پر ہاتھ مارا اور اسے آنکھ مار کر مکرانے لگا۔

"مری جان... اب تو رحم کرو، عاشق دیکر پر۔"

پتہ نہیں ڈسٹرکٹ محیطہ بیٹ کے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ البتہ اس کے ڈراموں نے جو کہ حمید کی گردن پکڑی اور حمید اس سے لپٹ پڑا۔
اس طرح اُسے پاگل خانے پہنچنے کا موقع نصیب ہو گیا۔

پاگل خانے کے چھانک کے قریب ہی اندر کی جانب ڈپسٹری تھی جس کے آگے باہم سماں پڑا ہوا تھا۔ حمید نے بے شمار آدمی دیکھے جو انتہائی سمجھی گئے سے کسی نہ کسی کام میں مشغول تھے۔ کوئی پھولوں کی کیاریوں میں پانی دے رہا تھا۔ کوئی مہندی کی باڑھ کترہا تھا کہ کوئی رسی بٹ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ پاگل تو کسی طرح نہیں ہو سکتے۔

اُسے ڈپسٹری والے سماں کے بیچ ایک بخوبی بھادایا گیا۔ اچانک ایک صاحب جو کافی تربنگے تھے اُس کے سامنے آکر کھڑا ہو گئے۔ حمید کا دل دھڑکنے لگا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ تھا کہ وہ خود بھی تو پاگل ہے۔ اگر کسی سے ہاتھاپائی کی نوبت آگئی تو اسے تکلیف نہ کرنا پڑے گی۔ وہ صاحب تھوڑی دیر تک جلوگھورتے رہے پھر انہوں نے کوئی ہلانا شروع کر دیے۔

"اب... ابے... یہ کیا کہ ہے۔" سماں کے بیچ سے کسی نے لالا رہا۔
"جھائی کے سامنے دم ہلا رہا ہوں۔" ان صاحب نے آنکھوں سے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

وہ دوسرا آدمی بھی چھوڑنے پر چڑھ آیا۔ اس کے چہرے پر لمبی سی ڈاڑھی لہڑا بھی تھی اور آنکھوں میں بالا کی سنجیدگی تھی۔

"دم...!" اُس نے اپنی ڈاڑھی پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس طرح ہلانی جاتی ہے...!"
تک تمہارا دماغ صحیح نہیں ہوا۔"

پھر ان میں سے ایک ڈاڑھی ہلا تارہ اور دوسرا کوئی ہے مٹکا تارہ۔

حمدینے اٹھ کر ناچتا شروع کر دیا۔ عافیت اسی میں نظر آئی۔ آخرہ بھی پاگل ہی تو تھا۔
جو لوگ ادھر ادھر کاموں میں مشغول تھے وہ بھی ایک ایک کر کے اکٹھا ہونے لگے۔ بڑا

پاگل خانے کے منتظموں نے اس ہنگامے کو فرو کیا۔
ٹکل کو تھوڑی دیر بعد حمید کا طبعی معافی شروع ہوا جو اتنی جلدی اور لاپرواٹی سے ختم کر دیا گیا کہ نہ کوچھ تھا۔

بہر حال ڈاکٹر نے روپورٹ میں لکھا کہ وہ ایسا پاگل نہیں تھا جسے کہیں الگ باندھ کر رکھا بائے۔ حمید کے چیزوں سے اتردا کر پاگل خانے کا بابس پہنیا گیا جو ایک جا گھمیا ایک شلو کے اور ایک بڑا پٹھی کی پر مشتمل تھا۔

اُسے باغ میں نی کیاریاں کھو دنے اور کھادو ڈالنے پر لگا دیا گیا۔

حمدید کی نظریں اُسے ڈھونڈ رہی تھیں جس کے لئے وہ یہاں آیا تھا۔
اس کے ساتھ اور بھی کئی آدمی اُسی کام پر لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں بار بار گھورنے لگتا تھا کہ اُنہیں پاگل کیسے سمجھ لیا جائے۔ وہ سب نہایت سنجیدگی اور خاموشی سے اپنے کاموں میں صرف تھے۔

دفعہ باغ کے باہر اس جگہ شور سنائی دیا جہاں کچھ پاگل رسیاں بٹ رہے تھے۔ حمید اچھل کر گواہ گیا۔ ایک پاگل ایک درخت کے تنے سے چھٹا ہوا چیخ رہا تھا۔ "مار ڈالوں گا...!... سالے دو... دوہت تیری کی...!"

وہ اپنائیں تھے سے نکلے زور کر رہا تھا۔ پاگل خانے کے دو محافظ اُس کی طرف چھپے۔ پہلے تو انہوں نے اُسے ہٹانے کی کوشش کی لیکن جب کامیاب نہ ہوئے تو اس پر کوڑے بر سانے ٹردی کر دیے۔ گرد و درخت سے لپٹا ہی رہا اور پھر کچھ دیر بعد بیوشاں ہو کر گرپڑا ڈپسٹری سے اڑ پڑا گیا اور اسے اس پر ڈال کر مریضوں کے وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ حمید کے ساتھی خاموشی سے ہر اپنے کاموں میں مشغول ہو گئے۔
تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک بولا۔

"اس کے لاشور میں بچپن ہی سے ظالمانہ رجہات پر دروش پاتے رہے ہیں۔"

حمدید بوكھلا کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ یہ پچاس بچپن سال کا ایک قوی البث آدمی تھا۔ چہرے ہمگی اور بڑی ڈاڑھی تھی۔ پیشانی کشادہ اور چمکدار تھی۔ آنکھیں غماک اور دھنڈلی تھیں ناک کے جوڑ پر نظر آنے والا نشان ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اب سے پہلے بھی چشمہ لگاتا رہا ہو گا۔

بارکوں کے قریب پہنچ کر حمید شش و بیچ میں پڑ گیا کہ اب اسے کیا کرننا چاہئے۔ کسی نے اسے تک قیام کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں مختلف قسم کی عمارتیں تھیں۔ بعض عمارتوں میں ان کو ٹھریاں تھیں جن میں لو ہے کی سلاخوں والے دروازے تھے۔ ان میں غالباً خطرناک قسم کے پاؤں رکھے جاتے ہوں گے۔ ایک بہت بڑا مین کا ہٹڈا بھی تھا۔ جس کے نیچے سے شمار پلٹک تھے اور نمبر ٹڑے ہوئے تھے۔

جید سوچ رہا تھا کہ اسے بھی پاگل بن کی کوئی نہ کوئی حرکت ضرور کرنی چاہئے لیکن پھر نفلوں کے کوڑے کا خیال کر کے اس کی روح لرز گئی۔

دغنا سے قریب ہی کہیں بھینس کے ذکر انے کی آواز سنائی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک
نیم کے درخت سے پیچے رگڑ رگڑ کر بھینسوں کی سی آوازیں نکال رہا تھا۔ حمید چونکہ پڑا
انکہ اس کا چہرہ ڈاٹھی اور موچپوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن خدوخال وہی تھے، وہی آنکھیں... یہ
پڑھنے تھے جبکہ حمید نے فریدی کے فال میں گھنٹوں اس کی تصویر دیکھ کر اس کے خدوخال کو ڈاہن
کر زکا کو شش کر تھی۔

جیسے ہی حمید اس کے قریب پہنچا اس نے جھپٹ کر اس کے بینے میں سر اڑا دیا اور پچھے کی فریلے لگا۔ حمید نے قدم جوادیے تھے۔ اس نے اس کا سر اپنے بازوؤں میں جکڑ کر آہستہ سے ”بینے... بینے ساچد... تم ہاگل نہیں ہو۔“

ساجد ترپ کر اس کے بازوؤں سے نکل گیا۔ وہ اُسے حیرت اور خوف کے ملے جلے انداز گور رہا تھا۔

کرٹل کی اڑنے والی رانگل نے وزیر خزانہ کا خون کر دیا۔ حید نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہے کہا۔ ”نادرہ ابھی تک غائب ہے۔ اب تمہیں بولنا ہی پڑے گا اور اگر نہیں بولو گے تو بہت ساتھ نئے اختصار کئے جائیں گے۔“

"تم کوں ہو۔" سا جھد خوفزدہ آواز میں بولا۔

”میں کوئی بھاگا ہوا۔ لیکن، تمہرے بولنا ہے اس سے گا۔“

”میں کچھ نہیں بخواہ جانتا تھا اگلے!“

"ہونہے ساگل!... ساگل تو میں بھی ہوں۔" محمد مسکرا کر بولا۔ "میر، جانتا ہوں کہ سالا

لا شعور جوانی جلوں کا گھوارہ ہے۔ ”اس نے ایک پاگل کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سینز بھجھے ہو۔ پاگل نے نفی میں سر ہلا دیا اور پہلے پاگل نے کہا۔ ”ایک قسم کا مخفی شعور سمجھ لوز اختر میں کہہ سکتے ہو۔ مخفی شعور دراصل جیوانی جلوں کے لئے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مگر اسے کیا سمجھو گے۔ خیر اسے یوں سمجھو میں اس وقت ناچتا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہ ناچتا چاہا۔ مخفی شعور کہتا ہے کہ تم یونیورسٹی کے پروفیسر ہو۔ تمہیں ہر گز نہ ناچتا چاہے۔۔۔ لیکن میں اسے شروع کر دیتا ہوں۔“

اس نے پچ گاہ کرنا چنان شروع کر دیا۔

سیاں نے انگلی مردوڑی رے... رام کسم شرمائی

وہ تمکن تھک کر اپنی انگلی مرڈٹا اور شرما نامہ اور ساتھ ہی گھنی ڈاڑھی میں فاحشہ عمر تو کی طرح مسکرانے کی کوشش بھی کرتا جا رہا تھا۔

”شراپ۔“ ایک محافظت کا کوڑا اس کی پیٹھ پر پڑا اور وہ تملا کر دوہرا ہو گیا۔ جب محافظ چاڑی تو اس نے گھٹنوں میں منہ دیکر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

حید سوچ رہا تھا کہ یہ پاگل بھی غیر شعوری طور پر جابر قتوں سے خاکہ رہتے ہیں ورنہ مخاطب ہیں اس کے ایک ہی تھپڑ کافی ہوتا۔ وہ حقیقت کوئی بڑھا لکھا آدمی معلوم ہوتا تھا کچھ تو

نہیں کہ اس کا پروفیسر والا حوالہ درست ہی رہا ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مختلف حصوں سے شورائٹھٹا پھر ”شراپ شراپ“ کی آوازیں آئیں اور سکوت طاری ہو جاتا۔

شام ہو گئی لیکن وہ ملا جس کی حمید کو تلاش تھی۔ پانچ کے گھنٹے کے ساتھ ہی کام روکا دیا تھا۔ لیکن اب بھی بعض ایسے تھے جو کام ہی سے چھٹے رہنا چاہتے تھے اور انہیں کام سے الگ کر کے لئے بھی حافظ کو کوڑے پھٹکارنے پڑتے اور پھر جب وہ سب اپنی بار کوں کی طرف لوٹ رہا تھا تو اسکے سامنے نوجہ کر قریب آ کر آستہ سے کہا

”کل ایک مرد اگھنسا مکمل ہو جا چکا، پھر میڑا کے اکٹھے بنا چھرا رکا۔ اُنھے“

گا بح نکلوں گا ۱۱۲ ۱۱۳ ۱۱۴ ۱۱۵ ۱۱۶ ۱۱۷ ۱۱۸ ۱

”میں نہیں جانتا۔“

”تم نے پھر وہی ضد شروع کر دی۔“

”خدا کی قسم میں نہیں جانتا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کسی کو اس کے متعلق کچھ معلوم ہو۔ ہر حال مجرموں کا ایک جم غیر اس کا تابع فرمان ہے۔“

”اور تم بھی انہیں میں سے ایک ہو۔“

”مم.... میں۔“ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

”گھبراو نہیں۔ تم سر کاری گواہ بنا کر چھوڑ دیئے جاؤ گے۔“

”میں بھیں بہتر ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”شاید مسٹر کو مجھے بیچ عدالت میں بھی زندگی پھوڑے۔“

”اوہ.... تو کیا وہ ایسا ہی خطرناک آدمی ہے۔“

سابد صرف سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوا یاں الزہری تھیں۔ ”وہ ہزاروں آدمیوں کا شہنشاہ ہے۔“ ساجد تھوڑی دیر بعد بولا ”لیکن ان میں سے شاید ہی کی کو معلوم ہو کہ ایک کادو سرنے سے کیا تعلق ہے۔“

”ہوں۔“ حمید سر ہلا کر بولا۔ ”میں سمجھ گیا تم کس طرح اس کے چکر میں پہنچتے تھے۔“

سابد نے فورائی جواب نہیں دیا۔ اس کے چہرے سے چکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ ”میں دراصل! مجھ سے ایک بار ایک جرم سرزد ہو گیا تھا جس کے متعلق میں یہ سمجھتا تھا کہ لپرہیش پر دہ پڑا رہے گا۔“

”چلو میں تم سے اس کے متعلق کچھ نہیں پوچھوں گا۔“ حمید جلدی سے بولا۔

”لیکن....!“ سابد یوتارہا۔ ”مسٹر کیوں کو اس کا علم تھا۔ اس نے مجھے بلک میل کیا۔ مجھے اس کا طرف سے ایک خط ملا جس میں اس جرم کی تفصیل درج تھی اور مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ اگر

میں نے مسٹر کو کیا ہر خواہش کے آگے سر نہ جھکا دیا تو اس کی اطلاع پولیس کو دے دی جائے گی۔“

”تو تم نے اسے کس طرح مطلع کیا تھا کہ تمہیں منظور ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ٹیلی فون کے ذریعے! اس نے مجھے نمبر لکھا تھا.... کہ اگر مجھے منظور ہو تو اس نمبر پر فون کرو۔“

میڈیکل شٹ قاعدے سے ہوتا ہی نہیں۔ محض سچھل ہٹری دیکھ کر پاگل پن کی قسم ہو کر کے نمبر لگادیے جاتے ہیں۔ چلو یہی اگلو جلدی اس قسم کی حرث مخوری ہر محکمے میں ہو رہی ہے۔

”میرا.... شاند..... میرا وقت بھی قریب آگیا ہے۔“ ساجد آہستہ سے بڑا لایا۔

”تو کیا تم نے ہی کر قتل کو قتل کیا تھا۔“

”نہیں! ہرگز نہیں۔“

”پھر تمہاری موت کیوں قریب آگئی ہے۔“

”مار ڈالو.... مار ڈالو.... لیکن مار ڈالنے سے پہلے کسی بھی کی طرح مجھے چھما بھجا کر مست۔“ ساجد نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

”جب تم جرم نہیں ہو تو تمہیں کس بات کا ذریعہ۔“ حمید نے پوچھا۔

”بہلاو نہیں مجھے۔“ ساجد کا نیپٹا ہوا بولا۔ ”مارنا ہے تو مار ہی ڈالو... اب تو تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ میں پاگل نہیں ہوں۔“

”حید اس کے ایک ایک لفظ پر غور کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک جھپٹ بیٹھنے کا اس پر جو رہ ہوا تھا وہ بھی اس کے پیش نظر تھا۔“

”تم خواہ خواہ ڈر رہے ہو۔“ حمید اسکے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا اور وہ جیچ کر چیچھے ہٹ گی۔ ”میرا تعلق محکمہ سراغِ رسانی سے ہے۔“ حمید پھر بولا۔

”ساجد کسی خوفزدہ شکاری کی طرح دبک رہا تھا۔“

”اگر تم یہ چاہتے ہو کہ تمہیں یہاں سے نکال کر پولیس والوں کے سپرد کر دیا جائے تو کوئی اعتراض نہیں۔“

”نہیں.... نہیں!“ ساجد مفتر بانہ انداز میں بولا اور تھوڑی دیر تک اسے غور سے دے کے بعد کہنے لگا۔

”تو تم مسٹر کیوں کے آدمیوں میں سے نہیں ہو۔“

”مسٹر کیوں؟“ حمید حیرت سے بولا۔ ”یہ کون بلاہے۔“

”مجھے بچاؤ۔“ ساجد بچوں کی طرح سکیاں لیتا ہوا بولا۔

”ڈرو نہیں!“ حمید زم لبجھ میں بولا۔ ”یہ مسٹر کیوں کون ہے۔“

بلد ببرہ

فہ ساجدنے کہا۔
”لیا وہ لڑکی بہت کم بخن تھی۔“
”بہت زیادہ۔“ ساجدنے کہا۔
”اس کی چال کیسی تھی؟“
”چال ہی تو سب کچھ تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی چال نہیں دیکھی اسی معلوم ہوتا ہے
یہ دزمٹن سے کچھ اوپر تیر رہی ہو۔“

”مسٹر کیوں اس کے ساتھیوں کے متعلق اور بھی کچھ جانتے ہو۔“
”کچھ بھی نہیں! بتایا کہ میں تقریباً چھ ماہ تک کرتل کے ساتھ رہا لیکن مجھے یہ نہ معلوم ہوسکا
بھی مسٹر کیوں ہی کے گردہ سے تعلق رکھتا ہے۔ شاید اسے بھی میرے متعلق علم نہ رہا ہو۔“
”لیکن تمہیں اس کے یہاں ملازمت کس طرح مل گئی۔“

”مسٹر کیوں کے خوف نے والائی تھی وہ ملازمت۔ ظاہر ہے کہ اگر میں وہ ملازمت حاصل نہ
رکھتا تو میرا بھائڑا پھوٹ جاتا۔ جس کی دھمکی مسٹر کیوں پہلے ہی دے چکا تھا۔ لہذا میں نے سر توڑ
لشکر کی اور کامیاب ہو گیا۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں مسٹر کیوں نے کوئی اور طریقہ اختیار کیا ہو۔“
”لیکن! تم کہہ چکے ہو کہ کرتل نے تم پر رائقل کاراز بھی نہ ظاہر ہونے دیا۔ اس کا تو یہ
طلب ہوا کہ وہ تمہاری حقیقت سے واقعیت تھا۔“

”مجھے یقین ہے کہ وہ قطعی واقعیت نہیں تھا۔“ ساجد بولا۔
”بہر حال اس رائقل نے ایک بہت بڑے آدمی کی جان لے لی۔ خراب تم کیا کہتے ہو۔
لہذا رہنا چاہتے ہو یا کوئی اور انتظام کیا جائے۔“

”نہیں میں یہیں بہتر ہوں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ حید دیر تک کھڑا
غمیرے میں گھورتا رہا۔

رنگ اور بھنگ

”دوسری صبح سرجنٹ حید بہت مضھل تھا۔ پالگلوں کے خوف سے اسے رات بھر ٹھیک سے

”نمبریا ہے؟“ حید نے کہا۔
”ہاں.... تحری زیریو۔“
”تحری زیریو!“ حید حیرت سے بولا۔ ”یہ تو میں فون ایکچھ کا نمبر ہے۔“
”میں جانتا ہوں.... لیکن نمبر یہی تھا۔“ ساجد بولا۔
”پھر....؟“

”پھر اس نے مجھے دوسرے خط کے ذریعہ کرتل فرید کے یہاں سیکریٹری کی گجر
کرنے کی کوشش کا حکم دیا۔“

”اسی رائقل کے لئے۔“ حید نے پوچھا۔
”ہاں.... لیکن کرتل فرید بہت چالاک آدمی تھا۔ اس نے مجھے اس کی ہوا بھی نہ لگنے دی اور
دوسری حیرت انگیز بات یہ کہ کرتل فرید بھی مسٹر کیوں کے گردہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قتل
سے تین چار دن قبل مجھے اس کا علم ہوا تھا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ دو تین ایسے خطوط لگ گئے جو
مسٹر کیوں نے اسے لکھے تھے۔ بہر حال مسٹر کیوں کو بھی اس پر اعتماد نہیں تھا اس نے مجھے اس کے پیچے
لگا دیا تھا۔ جس رات اس کا قتل ہونے والا تھا مجھے مسٹر کیوں کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس
میں کہا گیا تھا کہ میں رات کرتل فرید کے گھر پر نہ رہوں۔ مسٹر کیوں کا وجود مجھے عرصہ سے الجھن
میں ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے سوچا کہ کیون نہ میں اس کا سراغ لگاؤ۔ پچھاچ میں نے اس کے
حکم کی تعییں نہ کی اور یہ دیکھنے کے لئے کہ اس نے یہ حکم کیوں دیا ہے میں کرتل کے مکان ہی میں
چھپا رہا اور تقریباً بارہ بجے رات کو کسی نے پیچھے سے میرے سر پر کوئی دزدی چیز بازی اور میں بیوٹی
ہو گیا۔ دوسری صبح میں نے خود کو ایک کمرے میں مقفل پایا اور باہر پولیس والوں کے بھاری بھر کم
جو توں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ان میں سے کچھ قتل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ میں
نہیں طرح گھر اگیا۔ پولیس والوں سے زیادہ مسٹر کیوں کا خوف دامنکر تھا۔ لہذا فوری طور پر اس کے
علاوہ اور کچھ نہ سوچا کہ پاگل ہیں جاؤں۔“

ساجد خاموش ہو گیا۔ حید بھی کچھ سوچ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔
”آخر وہ لوگ اس کی نہیں کو کیوں لے گئے۔“
”وہ اس رائقل کے متعلق سب کچھ جانتی تھی۔ شاکن استعمال کا طریقہ بھی اسے معلوم
ہے۔“

نہیں آئی تھی اور دیے بھی سوتا ہی کہا۔ اس کیلئے خاص طور پر کوئی انظام نہیں لایا پورے پاگل خانے میں بد نظمی ہی بد نظر آتی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا یہاں کے علا ماغوں میں بھی فتوڑے ہے۔ اُسے رات ہر ایک درخت کے تنے سے یہاں لگائے بیٹھا رہا پڑا تو صبح ہوتے ہی وہ پاگل پھر بار کوں اور سائیانوں سے جانوروں کی طرح ہلک دیئے گئے انسانی مشینیں پھر چل پڑیں۔ ان کی آنکھیں ویران تھیں اور چہرے ہر قسم کے جذباتے عاری۔ صرف ان کے جسم حرکت کر رہے تھے۔ جب کبھی ان میں سے کسی کے ذہن کی رو؟ اس پر کوڑے برسنے لگتے اور جب وہ درد سے بے تاب ہو کر چیختا تھا بھی اس کے چہرے پر اس کے احساس کے آثار نہ ہوتے۔ آنکھیں بدستور ویران اور کھوئی کھوئی ہوتیں۔ میں یہ معلوم ہیے یہ آواز کسی مشین ہی سے نکلی ہو۔

حید پھر اپنے پچھلے ہی دن والے کام میں آگا۔ بھوک کے مارے براحال تھا۔ پچھلی بھی اُسے بھوکا ہی رہنا پڑا تھا۔ کیونکہ اب میں ہوئی تسلی اور بدبو دار دال باجے کی سخت روئیور ساتھ حلق سے نہ اتاری گئی تھی۔ بہر حال اب اُسے خوف تھا کہ کہیں اس بھوک کی حالتِ محافظوں کے کوڑے نہ کھانے پڑیں۔ آج اسے ان لوگوں میں ساجد بھی دکھائی دیا جاوے ایک نہ درخت کے نیچے چٹائی بن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر الجھن کے آثار تھے اور آنکھوں سے جھماںک رہا تھا۔ وہ تقریباً دو گھنٹے سے سر جھکائے بیٹھا پہنچایاں بن رہا تھا۔ وہ کبھی کبھی کسی خوفزدہ کی طرح سر اٹھا کر اپنی پشت کی طرف دیکھنے لگا اس کے فریب ہی کچھ اور بھی تھے۔ وہ بھی اس طرح خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف نظر آرہے تھے۔

دفتارِ حید نے ایک چیخ سنی اور اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ساجد اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک پر ٹوٹ پڑا۔ قلیں اس کے کہ محافظ اس کی طرف دوڑتے اس کا سر کئی بار نیم کے تنے سے ٹکر ساتھ ہی اس کے منڈ سے کسی بگڑے ہوئے کتے کی سی غراہٹ بھی نکل رہی تھی۔ دو محافظ بھی نہیں طرح ہبھوڑا۔ کئی محافظ اور آگے انہوں نے اسے رسیوں سے جکڑ کر ان بار کو طرف روانہ کر دیا جہاں خطرناک قسم کے پاگل رکھے جاتے تھے۔

حید سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اب چیخ پاگل ہو گیا ہے۔ یا پھر یہ مشر کو سے محفوظ رہنے لئے دوسری حکمت عملی تھی۔ ظاہر ہے کہ اب اسے ایک الگ کمرے میں بند کر دیا جائے گا اور

مک باہر نہ نکلا جائے گا جب تک ڈاکٹروں کو یقین نہ ہو جائے کہ وہ اب کسی پر حملہ نہیں گا۔

ہنگامہ فرو ہونے کے ایک گھنٹے بعد ایک محافظ حید کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ نیچے جھک کر رئے کی پشت پر پڑے ہوئے نمبر دیکھے اور حید سے اٹھنے کو کہا۔
”پپ... پیاؤں۔“ حید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”پل بے۔“ اُس نے حید کی گردن پکڑ کر دھکا دیا۔ حید چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ڈاکٹری کے سامان کے نیچے ایک آدمی کھڑا اداکڑ سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ حید کی طرف رکھرکا یا۔ حید سمجھ گیا کہ وہ فریدی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ سوچنے لگا کہ کمال کا ابدالا ہے نالم نے... مشر کو کیا مشر کیوں کا باپ بھی اسے نہیں پہچان سکتا۔ فریدی نے اس پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اسے پاگل خانے سے نکال لائے گا۔ حید نے دل ہی ن تھہبہ لگایا اور سوچنے لگا۔ آج پھنسنے ہو دوست۔ مری جان۔ فریدی صاحب۔ اب کم از کم نئے پریشان کئے بغیر نہ مانوں گا۔

”آپ دیکھی ہی رہے ہیں۔“ وہ ڈاکٹر صاحب سے دردناک آواز میں کہہ رہا تھا۔
”یہ میر اسگا بھائی ہے اور میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ بڑی مشکل سے ڈسٹرکٹ سٹ صاحب اس پر راضی ہوئے ہیں۔“ پھر وہ حید کی طرف ہڑکر بڑے پیارے بولا۔
”بُر میاں۔“

”بھائی جان۔“ بہومیاں سلمہ اچھپت کر اس سے لپٹ گئے اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔
حید نے دل میں سوچا کہ غصب کا ایکثر ہے۔ اس گھبراہٹ میں کتنا بے ساختہ پن تھا۔ یہ نہ کتنی تدرتی تھی۔ اگر اسگا بھائی بھی پاگل ہو جائے تو لوگ غیر شوری طور پر اس سے سزا رہتے ہیں۔

”ماتاہوں استاد۔“ حید نے دل میں کہا۔ ”مگر میں تمہیں تنگ ضرور کروں گا۔“
”وہ اپنے ساتھ کپڑے بھی لایا تھا۔ سفید کرتا اور پا جامد۔ پاگل خانے کے کپڑے اتروالے گئے پاگل خانے کے باہر ایک کار کھڑی ہوئی تھی۔ حید اچھل کر الگی سیٹ پر بیٹھ گیا اور کار چل لے۔ حید اس کی پیٹھ پر راتھ پھیر پھیر کر اسے چکار رہا تھا۔ راستہ خاموشی سے طے ہوتا رہا۔ حید

سوق رہا تھا کہ شاید فریدی اس کی افتاد طبع کی بناء پر خاموش ہے۔ سوچتا ہو گا کہ اگر میں نہ میں پہل کی تو حید نجائزے بغیر نہ چھوڑے گا۔ خیر صاحب دیکھنا ہے کہ یہ خاموشی کتنی رہتی ہے۔ حید سوچ رہا تھا کہ وہ ان تکالیف کا گن گن کر بدلتے گا جو اسے پاگل خانے میں پڑیں تھیں وہ اوگھتا اور سوچتا رہا۔... ذیلہ دن کی تھکن اور سچھلی رات کی بیداری کے اثر کے ذمہ ن پڑھاوی ہوتے گے اور وہ سیٹ کی پیش سے لگ کر خراۓ لینے لگا۔

پھر اسی وقت اس کی آنکھ کھلی جب اسے جھنجور کر جگایا گیا۔

کار ایک عالی شان عمارت کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ کار سے اُت کر ادھر ادھر دیکھنے کچھ بولنے والہا تھا کہ اپنی شرارت والی اسکیم کا خیال آگیا۔

”غورر.... غورر.... غرچ....!“ اس نے حلقت سے آواز نکالی اور اپنی دانت میں کے ساتھ گھٹنے لگا جو اس کا ہاتھ تھا میں اندر کھینچ لئے جا رہا تھا۔

متعدد راہداری کے چکر کاٹنے کے بعد وہ ایک بڑے کمرے میں پہنچے اور پھر حید کی جی فنا ہو گئی۔ کمرے کے وسط میں وہی جبھی طالوت کھڑا تھا۔ جسے اس نے اپنی الف لیلی والی ڈاکٹر نارنگ کے بیٹگے میں دیکھا تھا۔ اس کا سر پکرانے لگا۔ لیکن.... وہ سوچ رہا تھا کتنی زبر غلطی ہوئی اب اسے بچھ فریدی پر غصہ آنے لگا تھا۔ اگر اس نے یقینی طور پر کوئی ڈھنگ ایجادی ہوتی تو وہ مجرموں کے ہاتھ میں کیوں پڑتا.... مگر.... خیر.... اس نے شروع کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جس کی بناء پر اسے پاگل نہ سمجھا جاتا۔ اس نے مذاق ہی مذاق میں تک اپنایا گل پن برقرار رکھا تھا اور یہاں سے نکل بھاگنے کا لیں ایک یہی حرثہ رہ گیا تھا۔ جیسا دل و دماغ کو متوقع اور غیر متوقع ہر قسم کے جاد ثاثات کا مقابلہ کرنے کے لئے قوت ارادا تحت منظم کرنے لگا۔ حید کے ساتھی نے اسے طالوت کی طرف دھکیل دیا۔ طالوت اپنے پوڑے بازو پھیلائے آگے کی طرف جھکا ہوا تھا۔ حید نے اس کے جسم سے مکراتے ہی میں ہاتھ ڈال کر دو عدد بوسے اس کے رخساروں پر رسید کر دیے۔

طالوت کی گرفت ڈھنلی پڑ گئی اور وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گیا۔ حید چاروں خانے چت ز گر۔ طالوت جیرت سے آنکھیں پھلا لے حید کو گھوڑا رہا تھا۔ حید پھر اٹھ کر اس کی طرف جو طالوت نے اپنے دونوں ہاتھ آگے طرف تان دیے۔ جبھی براقد آور تھا۔ حید شاید اس

نے بھی نیچا رہا ہو۔ طالوت اسے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور حید اس نے بار بار اچھل رہا۔ شاید دوچار بوسے اور نصیب ہو جائیں۔ ویسے اسکے منہ کی بدبو سے اس کا دماغ بچھا جا رہا تھا۔ ”میں جو حید کو اپنے ساتھ لایا تھا بے تجاشہ قبیلے لگا رہا تھا۔ پھر اچاک وہ سبجدہ ہو کر یہی غریبا۔ یہ بنا ہو پاگل ہے۔ تمہیں اسے راو راست پر لانا ہے۔“

”نہیں.... نہیں....!“ جبھی غلط سلط انگریزی میں چھکا۔ یہ سچا پاگل ہے۔“

”کوئی نہیں اسے ٹھیک کرو۔“

”کیوں.... تم جھوٹے پاگل ہو۔“ جبھی نے کھیلانے انداز میں پوچھا۔

”بھوں.... بھوں۔“ حید کتے کی طرح بھوٹنکے لگا۔ جبھی کامنہ چوم لینے کی کوشش ابھی اری تھی۔

”ہتھیا کے بچ۔“ جبھی نے ہنس کر اس کی گردن دبوچی اور حید چوت کھائے ہوئے کتے کی ”چیاؤں چیاؤں“ کرنے لگا۔ طالوت پر بھی کا دورہ پڑ گیا۔ وہ حید کو چھوڑ چھاڑ کر الگ ہٹ گئی۔ پیٹ دباتا اور کبھی منہ۔

”ناموش خاموش۔“ دوسرا آدمی حلقت پھاڑ کر چھکا۔

طالوت کی بھی رکنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ حید اب دوسرے آدمی کی طرف چھٹا۔ پہلے تو کے چہرے پر سرا سیکی کے آثار نظر آئے۔ لیکن دوسرے لمحے میں سنبھل کر اس نے جو اتھ جھاڑا ہے تو میاں حید کو دن میں تارے نظر آگئے۔ وہ اس کے لئے تیار نہیں تھا لہذا نادر قرآنہ رکھ سکنے کی بناء پر ڈھیر ہو گیا۔ لیکن وہ بھی طے کر چکا تھا کہ چاہے جان چل جائے ت نہیں تسلیم کروں گا۔ وہ جھپٹ کر پھر اٹھا اور یہی حرکت دھرا دی۔

جبھی پیٹ دبائے پورے کمرے میں ناچتا پھر رہا تھا۔ حید کی اس حرکت نے تو اسے بے دم

”کیا ہل ہے۔“ دوسرے کمرے میں ایک تیر قسم کی نسوانی جیخ سنائی دی اور ایک لڑکی اندر آئی۔ لیکن اب حید اپنے چہرے پر تحریر کے آثار پیدا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ حید اسے

انداز کر کے طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہوا جبھی ہی کے پیچھے دوڑ تارا۔

”طالوت۔“ دوسرے آدمی نے اُن سے پھر لکارا؟ ”خاموش رہو! ورنہ گولی مار دوں گا۔“

”تم مشر کیو ہو۔“ لڑکی نے سمجھی گی سے کہا۔

مرد نے ایک ڈر اور اساقہ بہہ لگایا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے پھر اسی کرنے میں آگیا جہاں
کچور گیا تھا۔ بوتل جس میں کوئی سیال شے بھری ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

یہاں حید اور جبشی دونوں ہی تحک کر بیٹھ گئے تھے۔

”اے مضبوطی سے پکڑو۔“ اس نے جبشی سے کہا۔ حید اس کے ہاتھ میں بوتل دیکھ کر پہلے
راہا جبشی نے اسے اس طرح جکڑ لیا تھا کہ ہاتھ پیر بلانا بھی مشکل نظر آنے لگا۔

لڑکی کے ساتھی نے بوتل سے عرق نکال نکال کر اس کے منہ پر چھینتے مارنے شروع
ہیے۔ حید محوس کر رہا تھا کہ چہرے پر چکے ہوئے پلاسٹک کے نکلوں اپنی جگہ چھوڑ رہے
ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب جان بچنی محال ہے۔ بہر حال وہ تن پر تقدیر ہو بیٹھا۔

ایک ایک کر کے پلاسٹک کے سارے نکلوں نکال لئے گئے اور دفعہ دو لڑکی چیخ اٹھی۔
”ارے.... یہ تم ہو! امر دیجت۔“

جبشی اُسے چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ حید تن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”ہاں.... میں.... سرجنت حید؟.... اور اب واپس جا رہا ہوں۔“

حید دروازے کی طرف مڑا لیکن جبشی جھپٹ کر درمیان میں آگیا۔

”اس کا مطلب۔“ حید لڑکی کے ساتھی کی طرف مڑ کر بولا۔

”انپکٹ فریڈی کہاں ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا لیکن تمہیں پچھتا پڑے گا۔“ حید اپنا اوپری ہونٹ بھیجن کر بولا۔

”پاگل خانے کیوں گئے تھے؟“ اس نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”تم ہو کون؟“ حید گلکر بولا۔

مرد نے پھر جبشی کی طرف دیکھا اور اس نے حید کو پکڑ لیا۔ حید نے تعریض نہیں کیا تھا۔ وہ
نماقا کر ہاتھ پیر مارنے کا وہی انجام ہو گا جو کسی دلدل میں چھنسے ہوئے آدمی کا ہوتا ہے۔ وہ
ان طرح اندازہ لگا چکا تھا کہ وہ جبشی کی قوت کا عشر عشیر بھی نہیں رکھتا۔

”فریڈی کہاں ہے۔“ مرد نے آگے بڑھ کر حید کے منہ پر تھٹھا مارا۔

حید حتی الامکان پر سکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچاک وہ سہم کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دراصل اب اس میں ہٹنے کی سختی ہی اتنا رہا گئی تھی کہ
نے سوچا کہ اب تھوڑی سی خدمت اس لڑکی بھی کرنی چاہئے۔

اس نے ڈریائی انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور قدیم ہندوستانی رقص کا ایک پرو
ہوال لڑکی کے سامنے جھک گیا۔ پھر اس کے بعد تھک کے بول بولتا ہو جو ناچا ہے تو ایک ساتھ
کل، بھارتیہ نائیم اور منی پور کے وہ وہ پینتربے دکھائے ہیں کہ جبشی پر تو گویا ملک الموتی
ہو گیا۔ لڑکی بھی ہنس رہی تھی اور وہ دوسرا آدمی بھی ہستا تھا اور کبھی جھنچھلا کر پیر پیٹھے لگا۔
”یہ پاگل نہیں ہے.... ہرگز نہیں ہے۔“ وہ حلق کے بل چینا اور حید کا گریبان پکڑا
پاگل نہیں ہو۔ میں تمہاری کھال اڑا دوں گا۔“

حید نے دانت نکال کر قبیله لگایا جو تاندی یاں قسم کا تھا کہ لڑکی خوفزدہ آواز میں چین پڑی۔
دفعتاً قریب ہی کسی کرے میں فائز کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی شیشوں کے ٹوٹ کر گر
سے چھٹا کے بھی بیدا ہوئے۔ کرے میں سانا چھا گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں حید نے
قبیله لگایا۔ وہ سمجھا شاید پولیس آگئی۔

”اے دیکھو۔“ دوسرے آدمی نے جبشی سے کہا اور لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر کرے سے نکل
راہداری میں رک کر وہ دونوں شاید اندازہ لگانے لگے کہ آواز کس کرے سے آئی تھی۔ پہ
ایک کرے میں گھس گئے۔ سامنے والی کھڑکی کا ایک شیشہ ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا تھا اور کم
میں بارود کی بوچھلی ہوئی تھی۔ مرد کی نظر سامنے والی میز پر پڑی جس پر ایک بوتل رکھی تھی
جھپٹ کر اس کے قریب آیا۔ بوتل کے نیچے ایک کانڈا کا نکلا دبا ہوا تھا جس پر کچھ تحریر تھا
اٹھا کر پڑھنے لگا۔

”کیا ہے؟“ لڑکی اس کے قریب پہنچ کر بولی۔

”مسٹر کیو۔“ اس نے سرگوشی کی۔ لڑکی کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن اس نے
ہاتھ پکڑ لیا۔

”اس کی سزا موت ہے۔“ وہ سہی ہوئی آواز میں بولا۔ ”مسٹر کیو کو دیکھنے کی خواہش ہی جرم ہے۔

”ہوں! جیسے میں جانتی نہیں۔“ لڑکی بڑے ناز سے چک کر بولی۔

”نہیں.... تم نہیں.... جان سکتیں۔“ وہ مضطربانہ انداز میں بولا۔

دیکر دیا۔
”نہل! میں تمہیں اس جن کے.... قبضے سے نکال لے جاؤں گا...“ بیسم کمپنی کا اجنبی مل

“چھوڑو،” اُن نے طالوت سے کہا۔
”چھ، آپ...!“ کنوں نے اُسے ڈانٹا۔ پھر اپنے ساتھی سے کہتے گی۔ ”اس سے کیا فائدہ
میں حکم کی تعیل نہیں کر رہے ہو۔ مارڈانے کا حکم تو نہیں۔“
رفتا جایا معلوم ہوا جیسے ناگر ہوش میں آگیا ہو۔

اور حمید ایک صوفے پر جم گیا۔
ایک سگریٹ پلاو گے۔ ”اس نے بڑی لاپرواٹی سے ناگر کو مخاطب کیا۔
”میاہ پاگل نہیں ہے۔“ لڑکی حیرت سے بولی۔
”نہیں۔“ ناگر کے لجھ میں سختی تھی۔

حمدہ ہنسنے لگا۔ کنوں اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”یا تمہیں معلوم نہیں کہ تم قتل بھی کئے جاسکتے ہو۔“ اُس نے آہستہ سے پوچھا۔
 ”تمہارے لئے میں دس بار قتل ہوتا منظور کرلوں گا۔“ حمید نے انہیٰ سمجھی گی سے کہا۔
 ناگر کنوں کی طرف پلتا۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“ اس کا لبھ تکہانہ تھا۔ کنوں کی پیشانی پر
 مل پڑیں۔ حمید نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی بہلی سی جھلک دیکھی لیکن پھر وہ دوسرے
 لمحے میں مسکرانے لگی۔ اس نے ایک اچھتی سی نظر حمید پر ڈالی اور کمرے سے چلی گئی۔

"میں نے تم سے ایک سگریٹ مانگی تھی۔" حید نے ناگر کو مخاطب کیا۔ ناگر کے چہرے پر بیک قدم کی ابھسن کے آثار تھے۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر حید کے سامنے ڈالا۔ ایسا معلوم ہوا جسے اس سے یہ حرکت لے خلائی میں ہوئی ہو۔

”مگر نہیں ایسی حالت میں سکریٹ پینے سے ممکن ہے مجھے غش ہی آجائے؟“ حید نے بڑا کہا۔

”کیوں؟“ ناگر نے چوک کر لیا۔

"میں کل رات سے بھوکا ہوں۔" حمید نے آہتا۔ پاگل خانوں کی تندابوش مندوں کے لئے

”تم جانتے ہو کہ میں اتنی آسانی سے تمہارے ساتھ کیوں چلا آیا۔“ حمیدے اسے پہلہ وہ حیرت سے حمید کی طرف دیکھنے لگا۔ اسے شاید یہ موقع نہیں تھی کہ حمید اتنا پر سکون فرمائے۔

”میں جانتا تھا کہ تم ڈاکٹر ناگر ہو۔“

"*g*, *g*, *g*"

”میں سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے اس طرح کنوں سے ایک باز پھر ملاقات ہو جائے۔“ یہ مسکرا کر بولا۔

کنوں اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے خاموش کھڑی تھی۔ حمید کے اس جملے پر اس کے پھرے پر سرخی پھیل گئی۔

”سنوتاگر! یا جو کچھ بھی تھہار انام ہو۔ میں اس لڑکی کو تم سے چھین لے جاؤں گا۔“ میدران پھر کہا۔

”فریدی کہاں ہے۔“ ناگر گرج کر پولان

”کنو! میں وہ دلچسپ رات ابھی نکل نہیں سمجھو لا۔“ جمید نے تاگر کی سنی ان سنی کر کے ڈے پیدا بھرے لجھے میں کہا۔

اسی بار پھر ناگر نے ایک بھرپور باتھ حمید کے منہ پر مارا اور حمید تو حقیقتاً اس وقت کمل ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا رہا تھا سے توہین اور چوت کا کچھ احساس ہی نہ ہو۔

”میں پھر ہوں میرے دوست....!“ اُس نے قہقہہ لگایا۔ ”مجھے ڈر ہے کہ کہیں تمہیں اک تھک کی دریںگ نہ کرانی پڑے۔“

”میں تمہیں مارڈالوں گا۔“ ناگرِ حلق کے بل چنان۔

”کوئی نئی بات نہیں۔ ہزاروں بار یہ جملہ سن چکا ہوں اور ہزاروں ہی لاشیں میں نے اپنے
رمومیں دیکھی ہیں۔“

”چیز ڈالو اسے۔“ تاگر نے جبشی کو مخاطب کیا اور جبشی کی گرفت تک ہونے لگی۔ حمید کو اپنی بھیاں کڑکڑائی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وہ حتی الامکان کوشش کر رہا تھا کہ اس جسم ڈھیلانہ ہونے پائے۔ اپنے ذہن کو درز کے احساس سے بجانے کے لئے اس نے بڑھانا

قطیعی ناموزوں ہے اور پھر میں تو کھانے کی میز سے بعض اوقات محض اس لئے اٹھ جاتا ہوں کہ کسی طشتی سے کچے مсалے کی بونہ آتی ہو۔

”تم پاگل خانے کیوں گئے تھے۔“ تاگر نے میساختہ پوچھا۔

”ایک آدمی کی تلاش میں! جس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ بنا ہوا پاگل ہے۔“ حیدر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ چھپانا بے کار ہے۔ مجرم ان کی اسکیم سے واقف ہو گئے ہیں ورنہ وہ اس وقت یہاں نہ ہوتا۔

”لیکن یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی۔“ حیدر بتا رہا۔ ”کیونکہ آج ہی اس نے ایک دوسرا پاگل کو قریب قریب ختم ہی کر دیا ہے اور اب اسے خطرناک پاگلوں کی کوہڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔“

”تم اس سے ملتے تھے۔“

”نہیں.... اسے تو میں نے اس وقت پہچانا جب محافظ اسے زنجروں میں جکڑے ہوئے کوہڑی کی طرف لے جا رہے تھے۔“

”وہ کون ہے۔“ تاگر نے پوچھا۔

”تم آخر مجھے یہاں لائے کس لئے ہو۔“ حیدر نے بات ازادی۔ ”اس رات کو مجھے یہ تو فتنے کا کیا مطلب تھا۔“

”دیکھو دوست....!“ تاگر نے لبچے میں بولا۔ ”بہتر ہی ہے کہ تم فریدی کا پتہ بتا دو۔ ورنہ یہ بڑی خراب جگہ ہے۔“

”اس کا علم یہاں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا۔“ حیدر نے کہا۔ ”میں پوچھتا ہوں۔ تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہیں۔“

”ہم لوگ بہت نمرے ہیں اور فریدی کا پتہ چاہتے ہیں۔“ تاگر مسکرا کر بولا۔ ”اور یہ حقیقت ہے کہ مجھے نہیں معلوم، کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا۔“

”یہاں....!“ تاگر چاروں طرف دیکھتا ہوا بولا۔ ”ضد کا تیجہ موت ہی ہوا کرتی ہے۔“ ”میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آج بھی مذاق ہی کر رہے ہو۔“ حیدر نے ایسی سمجھی گی سے کہا جس میں لاپرواہی بھی شامل تھی۔

”اے....!“ تاگر جبھی کی طرف دیکھ کر چینا۔ ”ترکیب نمبر تیرہ۔“

چھلانگ لگانے والا

حیدر کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف انہیں اہمیت احتیاط۔ پورے جسم میں کچھ اس قسم کی دلش تھی جیسے اس کی کھال اتار کر کسی نے اسے نہ کے ڈھیر میں دبادیا ہو۔

پچاس کوڑے تک تو اس نے گئے تھے۔ لیکن اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہ گیا تھا۔ وہ سوچ ہاتھا کہ اچھا ہی ہوا کہ اسے فریدی کے پروگرام کا علم نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ اس اذیت سے پتے کے لئے سب کچھ بتا ہی دیتا۔ اپنی زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اتنی بے بھی محسوس کی تھی ان پھر بھی یہ یقین کر لینے کی کوئی وجہ نہیں سمجھ میں آرہی تھی کہ فریدی اس کی طرف سے فل ہو گا۔

اچانک ایک تیز قسم کی روشنی کا بڑا سادھہ اس کی پشت کی طرف انہیں میں رینگ آیا۔ یہ چوک پڑا۔ لیکن وہ اتنی ہی تیزی سے مڑنے سکا۔ کیونکہ جسم کو جبکش دینے کا خیال ہی اذیت لے گا۔

کسی کے قدموں کی آہٹ سائی دی اور سونچ آن کرنے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں دشی پھیل گئی۔

یہ کنوں تھی۔ لیکن وہ پہلے کی طرح تو تازہ نظر نہیں آرہی تھی۔ حیدر نے اسے دیکھ کر لکھیں بند کر لیں.... وہ تھوڑی دیر تک کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اس کے قریب ہی زمین پر دو اونچی گئی۔

حیدر نے پھر آنکھیں کھولیں اور تکلیف کی شدت سے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا۔ ”تم بتا کیوں نہیں دیتے۔“ کنوں نے سرگوشی کی۔

”میں نہیں جانتا۔“ حیدر نے نحیف آواز میں کہا۔ ”اور اگر جانتا بھی ہوتا....“ ”یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔“ کنوں کی آواز دردناک تھی۔

”کون؟“

”میں تمہارے لئے کیا کروں۔“ کنول کی آواز میں بے چینی اور بے بسی تھی۔
حمدی نے پلاکا ساتھ تھا اگر کنول متین انداز میں دیکھنے گی۔

”تم کیا کرو۔“ حمید بولا۔ ”وہی کوڑا اٹھا لاؤ... اور تم بھی شروع ہو جاؤ۔“

کنول نے اپنے دانت اتنی سخت سے بھیجنے لئے کہ جزوں کا گوشت ابھر آیا۔ شاید وہ آنسوؤں کے ایک بیسانہ قسم کے ابال کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ البتہ اس کی نگرانی میں حمید کے چہرے پر جمی ہوتی تھیں۔

”تم کل رات سے بھوکے ہو۔“ اس نے پھر سرگوشی کی۔

”ٹھیک یاد آیا۔“ حمید مسکرا کر بولا۔ ”میا تم آج مجھے وہی خواب آور دوا نہیں دے سکتیں۔“
مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میرے جسم پر دیکھتے انگاروں سے لیکریں کھینچ دی گئی ہوں۔“
وہ سچ مجھ روپڑی۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے آنسو پوچھ ڈالے اور خوفزدہ نظر وہیں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

کہیں دور بھاری قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی جو رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی اور پھر حمیث اپنے ہاتھوں پر ایک بڑا سایالہ اٹھائے ہوئے نظر آیا اسے دیکھتے ہی کنول حمید سے بلند آواز میں بولی۔ ”میں کہتی ہوں تمہیں بتانا چاہیے گا اور نہ سکا کر مار ڈالے جاؤ گے۔“

”میں نہیں جانتا۔“ حمید نجیف آواز میں بولا۔

جسی نے پیالہ کنول کے قریب رکھ دیا۔ چند لمحے خونخوار آنکھوں سے حمید کی طرف رفتہ رہا پھر چلا گیا۔

کنول نے چھپے سے حمید کے منہ میں دودھ پلاکا شروع کیا۔

”میں... تمہیں... اس جن... کے قبضے سے...“ حمید رک رک کر بولتا رہا۔ ”ضرور... رہائی دلاؤں گا۔“

کنول کچھ نہ بولی۔

”مجھے یقین ہے۔“ حمید اسے ہاتھ کے اشارے سے روک کر بولا۔ ”اس میں بھی کوئی چال ہو سکتی ہے۔“

”میں نہیں سمجھی۔“

”تم مجھ سے ہمدردی جاتا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنا چاہتی ہو۔“
کنول نے انکار میں سر ہلا دیا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں.... اور حمید کا دعویٰ تھا کہ مررتے دم تک عورتوں کی آنکھوں کی زبان سمجھتا ہے گا۔

”تم نے اس رات مجھے یہ وقوف کیوں بنایا تھا۔“ حمید نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔
”نہیں بتا سکتی.... لیکن.... تم کسی طرح یہاں سے نکل جاتے تو اچھا تھا۔“

”کیوں....؟“

”یو نہی۔“

”مسٹر کیوں کا خوف۔“ حمید نے کہا اور کنول بے ساختہ اچل پڑی اور اس کے بعد اس سے جو نسل سرزد ہوا وہ قطعی اضطراری تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کی طرف گئی اور ادھر ادھر جھانک کر پھر واپس آگئی۔ اس کے چہرے پر ہوانیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ ٹھوک ٹھکل کر آہستہ سے بولی۔

”خاموش رہو... تم....!“

”باہر کوئی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

اس نے نغمی میں سر ہلا دیا اور پھر بیٹھ کر اس کے حلق میں دودھ پکانے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ”یہاں کسی کے سامنے اس کا نام نہ لینا ورنہ اسی وقت ختم کر دیے جاؤ گے۔“

”تم نے اسے دیکھا ہے۔“

”کسی نے نہیں دیکھا۔“

”تم اس کے پہنچے میں کس طرح پھیسیں۔“

”یہ سب مت پوچھو۔“

”ناگر کون ہے!“

”یہاں سے نکلنے کے لئے کچھ سوچو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”تمہارا نام کنول ہے یا کچھ اور۔“

”یہاں ہے! یہی ہے۔“ وہ بے چینی سے بولی۔ ”تم اتنے مطمئن کیوں ہو۔“

گی۔ گوشہ گوشہ چھان لیا گیا لیکن حمید کے علاوہ اور کوئی نہ ملا۔ حمید گھری نیند سو رہا تھا۔ پولیس دلوں نے اسے اس کی کوٹھڑی نے نکال کر ڈرائیک روم کے ایک صوفے پر ڈال دیا۔ پھر وہ عمارت کی تلاشی لینے میں مشغول ہو گئے اور انہیں اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ وہ حمید کو تھا چھوڑ آئے ہیں۔ کو تو ای اپنے اپنے اپنے جگہ لیش کے ساتھ دو سب اپنے لیش تھے اور وہ تینوں اس کا میابی کے ذیل میں مگن تھے کہ ہر قسم کے خدشات سے گویا حفاظتی ہی ہو گئے تھے۔

جب وہ تلاشی لے کر پلے تو ان کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ ڈرائیک روم خالی اور حمید غائب تھا۔ وہ پھر دیوانوں کی طرح پوری عمارت میں پھیل گئے۔ لیکن لا حاصل حمید کا کہیں پتہ نہیں تھا۔

حمد کو یقین تھا کہ اس کی نیند خود بخود نہیں ٹوٹی کیونکہ آنکھیں کھلتے ہی اسے اپنے منہ میں کسی کڑوی یا کسیلی چیز کا مزہ محسوس ہوا اور ایک خاص قسم کی بو بھی اس کے ذہن میں گونج رہی تھی۔ وہ کراہ کر اٹھ بیٹھا۔ بستر بہت ہی نرم اور پر تکلف تھا اور ملامت تکیوں سے ویسی ہی خوبصورتی تھی جیسے وہ اپنے تکیوں کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کرہ بھی وہ نہیں تھا جس کے فرش پر چلتے ہیں اس نے کنول کو روک دیا۔ وہ تھوڑی دریتک بیٹھی اس کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفیہ اسکراہٹ کی جھکٹ دکھائی دی۔ حمید نے نیند کے دبادے سے جھکتی ہوئی پلکوں کو زبردستی اٹھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شکریہ! میرے لئے تھی بہتر ہے۔ آج کی خواب آور دوازیاہ فائدہ مند ثابت ہو گی۔“

اور پھر وہ سو گیا۔ کنول تھوڑی دریتک بیٹھی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر اٹھ کر باہل چل گئی۔ وہ راہداری کے موڑ پر بیچھی تھی کہ کسی سے نکرائی۔ بیالہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

یہ ناگر ہا اور بُری طرح بد حواس نظر آ رہا تھا۔

”پولیس...!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”طالبوت کہاں ہے۔“

”بادرپی خانے میں۔“

”چلو...!“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوڑتا ہوا بولا۔ ”پولیس نے گھیرا ڈال دیا ہے۔“

بادرپی خانے سے انہوں نے طالوت کو لیا اور ایک تاریک راہداری میں گھٹتے چلے گئے۔

تھوڑی ہی دری میں پوری عمارت پولیس والوں کے بھاری قدموں کی آوازوں سے گوٹھ

”میں ہر حال میں مطمئن رہتا ہوں۔“ حمید نے مسکرا کر کہا۔ ”تب تم بھی جن ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنول نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ چوٹوں کی تکلیف معمولی نہیں تھی لیکن حمید کسی طرح بھی یہ نہیں ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

خوفزدہ ہے یا اس نے کوٹوں کی اس بارش کو ذرہ برایر بھی ابھیت دی ہے۔

”تم بہت اچھی ہو۔“ حمید اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتا ہوا پیدا بھرے لبجھ میں بولا۔

”تم کچھ امر و بخت ہی معلوم ہوتے ہو۔“ کنول مسکرا پڑی۔ ”پکالو بن گیا ہے تمہارا مریخ رکتوں سے باز نہیں آتے۔“

”اگر اس وقت منہ میں دودھ نہ ہوتا تو پکالو کے نام پر پانی بھر آیا ہوتا۔“

کنول صرف مسکرا کر رہ گئی۔ حمید سوچ رہا تھا کہ ساجد کی بات ٹھیک ہی تکی کسی ”مسٹر کو“

وجود ضرور ہے اور یہ لوگ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کا دل چاہا کہ کرٹل کی بہن نادرہ کا

متعلق بھی پوچھھے لیکن فوڑا خیال آگیا کہ وہ اپنی پاگل خانے والی ناکامی کی داستان ناگر کو سنا پکا ہے۔

اس کا ذہن پھر بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ پیالے کا دودھ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے ہاتھا

کر کنول کو روک دیا۔ وہ تھوڑی دریتک بیٹھی اس کو دیکھتی رہی پھر اس کے ہونٹوں پر خفیہ اسکراہٹ کی جھکٹ دکھائی دی۔ حمید نے نیند کے دبادے سے جھکتی ہوئی پلکوں کو زبردستی اٹھا۔

بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شکریہ! میرے لئے تھی بہتر ہے۔ آج کی خواب آور دوازیاہ فائدہ مند ثابت ہو گی۔“

اور پھر وہ سو گیا۔ کنول تھوڑی دریتک بیٹھی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی اور پھر اٹھ کر باہل چل گئی۔ وہ راہداری کے موڑ پر بیچھی تھی کہ کسی سے نکرائی۔ بیالہ ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا۔

یہ ناگر ہا اور بُری طرح بد حواس نظر آ رہا تھا۔

”پولیس...!“ وہ ہانپتا ہوا بولا۔ ”طالبوت کہاں ہے۔“

”بادرپی خانے میں۔“

بلد ببر ۹
اور کون ہیں؟ اس کا پتہ نہیں۔ میں نے کبھی اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ ان کا پتہ چاہوں۔ وہ بھی یہر حال سرکاری ہی آدمی ہیں۔“
”اور ان کا ملی فون نمبر بھی تحریری زیرو ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”ہاں....!“
”اور یہی ملی فون نمبر ایکچھے کا بھی ہے۔“
”ہاں؟ اور شاید یہی چیز تمہیں الجھن میں ڈالے ہوئے ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔
”تفصیلی....!“

”مسٹر کیو کے لئے ملی فون ایکچھے میں خاص طور سے انتظام کیا گیا ہے۔ مسٹر کیو کے لئے کیا کام آتے ہی ملی فون آپریٹر اس کا سلسلہ ایک ٹرانسیمیٹر سے ملا دیتا ہے۔ اس طرح ایکچھے سے مسٹر کیو کے لئے ملی ووک ٹرانسیشن ہو جاتا ہے اور آپریٹر تک کو اس بات کا پتہ نہیں چلنے پاتا کہ یہ کام کہاں کے لئے آتی تھی۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ سیکرٹ سروس والے ہی....!“

”نہیں حمید صاحب۔“ فریدی مضطرب باند انداز میں بولا۔ ”اتنی جلدی کوئی فیصلہ صادر کر دینا نیک نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد ایسا کیس ملا ہے جس میں ڈھنی اور جسمانی دونوں طرح کی دوزشیں کرنا پڑیں گی۔“

”وہ خاموش ہو کر سگار سلگانے لگا اور حمید بولا۔

”حمدی صاحب! اگر انی کھال میں صحیح سلامت رہے تو؟“

”یاد مجھے حقیقتاً ساری زندگی اس کا افسوس رہے گا کہ تم اس حال کو پہنچ گئے۔“ فریدی نے کہا۔

”خیر آپ کا یہ افسوس میری بیٹھ کی سوزش نہیں کم کر سکتا۔“

”مگر یہ تو سوچو کہ کنول نے تمہیں دودھ پلائی ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”بھیس کا دودھ پلایا تھا۔“ حمید جلدی سے بولا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”بھجھ میں نہیں آتا کہ.... راجن.... ڈاکٹر نارنگ کی دبی جائیداد کا فیجر کہاں غائب ہو گیا؟“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”اوہ....!“ حمید متاسفانہ لمحے میں بولا۔ ”محجھے اس کے متعلق کنول سے پوچھنا چاہئے تھا۔....

”ہاں! کیوں؟“ فریدی کے لمحے میں حرمت تھی۔
”تھوڑی دیر کے لئے ادھار دے دیجئے۔“
”کیوں؟“

”میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کو گولی مار دوں۔“ حمید حلق پھاڑ کر چینا۔

فریدی اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور اس کا شانہ تھپکتا ہوا بولا۔

”اگر تم اس وقت مجھے توپ سے بھی اڑا د تو برانہ ماںوں گا! میرے اچھے بیٹے۔“
”ذرا اپنیچہ دیکھئے میری۔“

”میں دیکھے چکا ہوں.... اوڑاں کے لئے ان کا جسم کا ایک ایک ریشمہ ادھیرڑا لوں گا۔“

فریدی نے اسے پلٹگ پر لادیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر حمید داستان بیان کر چلا۔ حالانکہ اس نے سب سے پہلے اسی کے متعلق معلوم کرنا چاہا تھا کہ وہ تک کیسے پہنچا۔ لیکن فریدی نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ خود اپنی رووداد پہلے سنائے۔ جیسے عین حمید مسٹر کیو کا نام لیا فریدی تقریباً چھل پڑا۔ وہ تھیر خیز نظروں سے حمید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ حمید نے پوچھا۔

”کچھ نہیں.... کہتے چلو.... پھر بتاؤں گا۔“

حمید نے بیان جاری کر کھا اور جب وہ خاموش ہوا تو فریدی نے پوچھا۔

”وہ لڑکی.... یعنی نادربہ بھی کہیں نظر آئی تھی۔“

”نہیں.... لیکن مسٹر کیو کے نام پر جو نکے کیوں تھے۔ کیا آپ پہلے سے اس کی شخصیت واقف ہیں۔“

”ہاں.... لیکن اس کی اس حیثیت کے متعلق شاید خوب میں بھی نہ سوچ سکتا۔“ فریدی خیال انداز میں بولا۔

”یعنی....!“ حمید کے لمحے میں حرمت تھی۔

”اس نام کا تعلق سیکرٹ سروس والوں سے ہے۔“

”آپ انہیں جانتے ہیں۔“

”میں صرف ان کی تعداد جانتا ہوں۔ وہ پانچ ہیں اور یہی نام استعمال کرتے ہیں کہاں।“

بہاں..... کوئی ان کی گرد کو بھی نہ پاسک۔ البتہ ابھی اطلاع ملی ہے کہ پولیس نے دو ٹھنکے بھکارنے کے بعد ایک چور دروازے کا پتہ لگایا ہے جو ایک تپی سی گلی میں کھلتا ہے اور بدھ کسی نے دھیان سک سک نہیں دیا تھا یعنی اوھر پولیس نہیں تھی۔ اوز بھی کام کر رہا ہے یا نہیں۔ ” حمید نے پوچھا۔

” میں نے ابھی تک تو اسے بلایا نہیں۔ ” فریدی پر خیال انداز میں بولا۔ ” سب کو ایک ساتھ ہزار دنیا مناسب نہیں سمجھا۔ یہ کیس بڑا پیچیدہ ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کچھ تازہ دم لوگ بھی موجود ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حالات کوئی دوسرا رخ اختیار کر لیں۔ فی الحال..... میں نے یہ انتظام یا ہے کہ ملک بھر میں اس وقت تک مائیکروfon استعمال نہ کیا جائے جب تک ایک پرست یا طمینان کر لیں کہ اس میں کوئی دوسرا اسم بھی تو نہیں پیا جاتا۔ ”

” ملک بھر میں؟ ” حمید حیرت سے بولا۔

” جناب..... یہ کوئی ملک گیر تنظیم معلوم ہوتی ہے۔ ”

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فریدی بولا۔

” میرا خیال ہے کہ دانتوں پیسہ آجائے گا۔ کیونکہ اس سڑک کو نے بلاعجیب طریقہ اختیار کیا ہے۔ ” لیکن آپ تو سیکرٹ پرسوں! ”

” تھیک ہے۔ ” فریدی حمید کی بات کاٹ کر بولا۔ ” یہ نہیں سوچا جا سکتا کہ سیکرٹ سروس اس قسم کی کوئی حرکت کریں گے۔ اس کیس میں یہی تو ایک اہم نکتہ ہے میرا خیال ہے کہ وہ انہوں نیکرٹ سروس والے دوسرا دنیا میں پہنچ چکے ہیں۔ ”

” کیوں؟ ”

” ظاہر ہے کہ ان کی زندگی میں تو یہ ناممکن ہے کہ کوئی ان کا نام استعمال کر سکے۔ ”

” دو دنوں پھر خاموش ہو گئے۔ فریدی خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اور حمید کا ذہن نیند کے تانے میں ابھتا جا رہا تھا۔ فتحناوہ فریدی کی آواز سن کر چوک پڑا اور ساتھ ہی اسیا معلوم ہوا جیسے پچھلے دنیا میں کوئی وزنی چیز کافی اونچائی سے گری ہو۔ قبل اس کے کہ وہ کچھ سمجھتا فریدی کھڑکی لمبا پڑھ کر دنیا میں چھلانگ لگا پکا تھا۔ حمید پہلے تو اچل کر کھڑکی کے قریب گیا پھر دروازے کی لڑ بھاگا۔ آگے ایک چھوٹا سا صحن تھا۔ حمید دروازہ کھول کر مکان کے باہر آگیا۔ باہر سناتا تھا۔

خیر.... اب آپ بتائیے کہ یہ کم بخت شہزادہ امر دو بخت.... کچھ لا خصال بن لریہاں تک کیے پہنچ کر اطمینان سے پیٹھتا ہو ایک لالا۔ میں نے تمہارے پاگل خانے پہنچنے والے دانتے کو شہرت دی تھی، ” شہرت دی تھی۔ ” حمید حیرت اور غصے میں بولا۔

” جس نے شہرت دی تھی اس میں کامیابی بھی ہوئی لیکن ایک جگہ وہ کام کیا گیا..... خیر..... بہر حال میں نے اس نے اس معاملے کو شہرت دی تھی کہ مجرموں پر اس کا رد عمل دیکھ کر میں جانتا تھا کہ وہ تم پر قابو پانے کی کوشش ضرور کریں گے۔ چنانچہ ایک آدمی نے ڈنکر مجھ سریٹ کا جعلی اجازت نامہ بنایا اور اسے لے کر پاگل خانے پہنچ گیا۔ تم نے پاگل خانے کو ٹھوڑے فاصلے پر ایک دوسرا کار بھی دیکھی ہو گی جس کے پیچھے گرائیں اور کامیاب اشتہار گاہ ہو اتی۔ میں نے اس کمپنی سے اس مقصد کے لئے حاصل کی تھی..... بہر حال میں نے اس پر تم دنوں تھاکر کیا۔ ”

فریدی رک کر سکار سلاگا نے لگا۔

” اور اس کے باوجود آپ اپ اتنی دیر میں پہنچ۔ ” حمید بھٹا کر بولا۔

” سنتے تو جاؤ! اس عمارت کے سامنے پہنچ کر میں الجھن میں پڑ گیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں مغربی جرمنی کا سفیر رہتا ہے اور وہیں اس کا دفتر بھی ہے۔ تم جانئے ہی ہو کہ ایسے موقع جس قسم کی کارروائیاں ہوتی ہیں۔ میں نے گرفتی کیلئے رسیش اور حمید کو وہاں کر دیا اور خود ڈی آئی۔ کے پاس پہنچ۔ بہر حال وہاں کی جلاشی کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں دیر ہو گئی اور پھر جب وہاں گھیرا ذائقے کا انتظام کیا جا رہا تھا تو چاک یہ اطلاع ملی کہ عمارت دراصل خالی ہے۔ سفیر کا دفتر دن ہوئے کسی دوسرا عمارت میں منتقل ہو گیا ہے۔ وہ کار را صل اس نے کھا گیا کہ وہاں سفارت خانے کا بورڈ نہیں ہٹایا گیا تھا یا ممکن ہے کہ خود مجرموں ہی نے دوسرا گاہ دیا ہو۔ بہر حال باہر تو بورڈ لگا ہوا تھا اور اندر ایک جگہ ایک تھنگی پر لکھا ہوا ملا۔ گرائے کے لئے خالی ہے، خیر۔

” بے چارے جگدیش وغیرہ تو یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ تم پھر مجرموں کے ہاتھ میں پڑے گے۔ ” تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ” تو وہ لوگ گرفتار ہو گئے۔ ”

”تم کھرے کیوں ہو؟“
 ”میں غالباً نہ رہنا چاہتے۔“ حمید جلدی سے بولا۔ ”کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔“
 ”جو کچھ بھی ہے ابھی ظاہر ہو جائے گا۔“ فریدی پر سکون لبھے میں بولا۔ ”تم اس آرام کر سی
 پڑ جاؤ... مگر نہیں تمہاری پیٹھے اس قبل نہیں۔ بہتر تو یہی ہے کہ.... اچھا زار ادھر آؤ۔“
 پھر وہ اُسے برآمدے میں لا کر بولا۔ اُسے شاید دو تین منٹ بعد ہوش آجائے۔ جب تک
 نہ کہوں تم اس کے سامنے مت آتا۔ یہاں اس پنک پر لیٹ جاؤ۔ بلکہ سو جاؤ تو بہتر ہے۔“
 ”یا آپ نے اسے کوئی دیکھ لیا تھا۔“ حمید نے پوچھا۔
 ”اس نے بیل پر سے چھلانگ لگائی تھی۔“ فریدی بولا۔
 ”پتھر نہیں کیا بات ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ یہ مسٹر کیوں کا کسی قسم کا عتاب ہو۔“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ اس نے
 برآمدے میں پڑے ہوئے پنگ کی طرف اشارہ کیا اور کمزے میں چلا گیا۔
 ناگر کو ہوش آکیا تھا۔ وہ پنگ پر چلتا تھا میرانہ انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ فریدی
 پر نظر پڑتے ہی اچھل کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا ہا پھر اس طرح
 اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لئے جیسے دھلتا اس کی پیتاں ہی رخصت ہو گئی ہو۔ وہ بُری طرح کانپ رہا
 تھا۔ مجھے جنم میں جھوک دیں خود ہی کوڈ جاؤ گا.... مگر میرا قصور.... مجھے میرا قصور بھی
 تھا تو۔ یا پھر مجھے مری جانے دو.... اس طرح اوھیزو مت.... ایک چوہے کی طرح بے بس نہ کرو۔“
 ”خاموش ہو گیا پھر دفعٹا حلق چھاڑ کر چینا۔“ ساتم نے۔
 ”سن لیا....!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”میں ایسی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔“ ناگر نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاتے
 ہوئے کہا۔
 لیکن وہاب بھی فریدی کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔
 ”اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی اقدام خود کشی نہ کرو گے تو میں تمہیں پولیس کے حوالے نہ
 کرو۔“ فریدی نے کہا۔
 ناگر نے ایک بھلٹے کے لئے فریدی کی طرف دیکھا اور پھر نظریں ہٹالیں۔

غالباً رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ گھاٹ بھی بالکل سنسان تھا اور پل پر آمد و رفت ہی
 ہو چکی تھی۔ حمید کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ شاید ایک منٹ تک بے حس و حرکت کھڑا دریا کی سطح پر نظریں جھائے رہا۔ کچھ ”
 بڑی بڑی لہریں گرداب کی شکل میں اٹھ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی سیاہ کی چیز سطح پر ابھرتا تو
 ڈوب جاتی۔

حمد کا جسم اور دماغ دونوں ہی تقریباً بیکار تھے۔ یہاں تک وہ محض اضطراری فعل کے
 پہنچا تھا اور اب اسے ایک منٹ کھڑا ہوتا بھی دو بھر معلوم ہو رہا تھا۔ صرف ایک سوال اس
 ذہن میں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فریدی نے دریا میں چھلانگ کیوں لگائی؟
 وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ کوئی تیرتا ہوا اسی طرف آہماہے
 فریدی نے کنارے پہنچ کر کسی دوسرے آدمی کو پانی سے کھینچ کر باہر نکلا۔

خوفناک آنکھیں

فریدی اُسے کاندھے پر اٹھائے ہوئے گھر کے اندر چلا گیا۔ حمید اس کے پیچھے تھا۔
 میں پیچھے ہی حمید کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ فریدی نے اسے فرش پر ڈال کر اس
 پیٹ سے پانی نکالنے کی تدبیریں شروع کر دی تھیں۔

”ہیلو...!“ دھنعتاہ درک کر بولا۔ پھر مڑ کر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”میکایا وہی نہیں ہے جو تمہیں پاگل خانے سے لے گیا تھا۔“

”ناگر...!“ حمید آہستہ سے بولا۔

فریدی بدستور مشغول رہا۔ اُس نے اس کے گیلے کپڑے اتار کر اُسے ایک چادر میں لپیٹا۔
 حمید کھڑکی کے قریب کھڑا باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں یہ بھی کہیں
 تو نہیں۔ پھر وہ صحن کی طرف چھانا اور باہر کے دروازے میں کنڈی لگا کر واپس آگیا۔ فریدی کو
 پر بیٹھا بے ہوش آدمی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی دواں کا بکس فرش پر کھلا رکھا تھا اور اُس
 اپنے ہاتھ میں انجلشن والی سرنخ سنبھال رکھی تھی۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے خود کشی کی کوشش کیوں کی تھی۔“ فریدی پھر بولا
”میں کچھ نہیں جانتا۔“ تاگر نے سہی ہوئی آواز میں کہا۔
”یعنی تم ارادتا نہیں گرے تھے۔“ فریدی اسے پر خیال انداز میں دیکھ رہا تھا۔
”مجھے جانے دو۔“ تاگر اٹھتا ہوا بولا۔

”جاو....!“ فریدی کے ہوننوں پر ہلکی سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ وہ اسے شرات اور
نظرنوں سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا لیکن شاید اس بار کسی روپ اور کسی گولی کو تمہارے بیچھے کا راستہ غائب
کرنا پڑے۔
تاگر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ پھر پلٹک پر گر کر اپنا برہنہ جنم پلا
سے چھپا نے لگا۔

”ڈرو نہیں!“ فریدی نرم لمحے میں بولا۔ ”تم اب قطعی محفوظ ہو۔ یہاں میری موجودگی میں
کوئی تم پر باหٹ بھی نہیں اٹھا سکتا۔“ ویسے میں یہ ضرور جانا چاہوں گا کہ تم دریا میں خود کو دے سکتے
کی نے تمہیں پھینکا تھا۔

”میں نہیں جانتا۔“
”پھر وہی صد....!“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ میرے ذہن میں صرف یہی ایک خیال تھا کہ کوہ جاؤں میں کو دیکھا۔“
”اور وہ تمہارا اپنا خیال نہیں تھا۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”کیا....?“ تاگر پھر اٹھ کر پیٹھے گیا۔
”یہی کہ تم خود سے نہیں کو دے سکتے۔“
”تم کون ہو؟“ تاگر خوفزدہ آواز میں بولا۔

”ڈرو نہیں! میں ان میں سے نہیں جنہوں نے تمہیں چلا گاگنے پر مجبور کیا تھا۔“
”پھر آخر کون ہو۔“
”باتاتا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور میز پر رکھے ہوئے کپڑے اٹھا کر اُسے دیتا ہوا بولا۔ ”نہیں
پہن لو۔“

تاگر نے قمیں اور پتلون پہنی! لیکن اس کی تحریر آمیز نظریں بار بار فریدی کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

”آؤ میرے ساختھ۔“ فریدی نے برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
”میں ہی ناگر کی نظر حمید پر پڑی وہ لٹکھڑا گیا۔ اگر فریدی سہارے کے لئے اپنا بازو آگے نہ
رہ پائے تو اس کا سر دیوار سے نکلا گیا تھا۔
جید بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب بتا دیجئے ناگر صاحب۔“ وہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
”تاگر نے آنکھیں بند کر لیں۔

”غائب....! اب تم یہ سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔“ فریدی نے کہا۔
”پولیس....!“ تاگر کا نپتا ہوا بولا۔

”میں یہ بھی جانتا ہوں۔“ فریدی نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”کہ تم پر یہ ساری
صیحتیں اس کی وجہ سے نازل ہوئیں تھیں۔“

”کیا....؟ مم....! میں نہیں سمجھا۔“ تاگر ہٹکالیا۔

”تم نے اُسے پولیس والوں کیلئے چھوڑ دیا تھا اور خود فرار ہو گئے تھے۔ لہذا تمہارے مشرکو....!“
ناگر کی ایک بے ساختہ قسم کی چیخ نے فریدی کا جملہ نہ پورا ہونے دیا۔

”تم جھوٹے ہو۔“ تاگر نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا اور کمرے میں بھاگ گیا۔
پھر فریدی اور حمید نے بدحواسی کے عالم میں اسے پلٹک کے نیچے گھستے دیکھا۔

”بس....!“ حمید نے قہقہہ لگایا۔ ”چلو خیر! میں تمہیں سول پولیس کے رحم و کرم پر چھوڑتا
ہوں۔“ فریدی نے اسے بدقت تمام پلٹک کے نیچے سے نکالا۔

”تم.... تم.... مشرکو کے آدمی ہو۔“ تاگر ہندیانی انداز میں بک رہا تھا۔ ”میں کہیں نہیں فتح
لکھ۔ کسی طرح نہیں فتح سکتا۔“

”تو تمہیں اسی طرح یقین دلایا جاسکتا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“ فریدی
نے کہا۔

”جھوٹ.... بلف.... دھوکا.... مشرکو کا نام اسکے آدمیوں کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔“
”لیکن اس کا نام مشرکو تو نہیں ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ہو یانہ ہو۔ لیکن اس نام سے بھی کوئی واقف نہیں ہے۔“

”ایسا تو نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”اس کے ساتھوں کے علاوہ دو اور آدمی بھی مل جاؤ
بندگاڑی میں پیشہ گیا تھا۔... وہ لڑکی.... جسٹی.... اور کنول.... تینوں مجھے اس میں ملے تھے۔
اس نام سے واقف ہیں۔“

”کون؟“

”انپکٹر فریدی اور سرجنت حمید۔“

”ت..... تو..... آپ..... مسٹر فریدی..... ہیں۔“ تاگر کے لہجے میں حیرت تھی۔

فریدی مسکرا تارہ۔ تاگر تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد پھر بولا۔

”تو پھر..... خدا کے لئے..... مجھے کسی بندگاڑی میں جیل خانے بھجوادیجھے..... درجنہ ودیجھے
زندہ نہیں چھوڑے گا.... اور میں نے ابھی تک کوئی ایسا جرم نہیں کیا جس کی سزا موت ہو۔“

”تم یہاں ہر طرح محفوظ رہو گے۔“ فریدی نے کہا۔ ”بشرطیکہ جو کچھ پوچھوں اس کا یہ
جواب دو۔“

”میں سب کچھ کروں گا۔ مجھے بچائیے۔“

”تم جانتے ہو کہ مسٹر کیوں حقیقتاً کون ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“

”اے کبھی دیکھا ہے۔“

”نہیں۔“

”اس رات جب تم نے سرجنت حمید کو ڈاکٹر نارنگ کے یہاں بے وقوف بنایا تھا تمہارے
ساتھ کتنی لڑکیاں تھیں۔“

”وو....!“

”جو حمید سے پہلے میں تھی کون تھی؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم سے میں اسے وہاں لے گیا تھا۔“

”تمہارے پاس وہ کب سے تھی۔“

”اسی دن آئی تھی۔ جس دن میں وہاں گیا تھا۔“

”یہاں سے آئی تھی۔“

”میں یہ بھی نہیں جانتا۔ مسٹر کیوں حکم کے مطابق میں سڑک کے کنڈے کھڑی ہوئی؟“

”جب وہ ہم سے چھٹ کر بھاگ رہا تھا تو کسی نے سرکنڈوں کی جھاڑیوں سے اس پر فائر
کر دیا۔ لیکن لاش بھیں ہی جلانی پڑی تھی۔“

”دوسرਾ آدمی کون تھا۔“

”پتہ نہیں.... اس دن کے بعد سے اب تک نہیں دکھائی دیا۔“

”خیراب یہ بتاؤ کہ تم اس کے چکر میں کس طرح پڑے تھے۔“

ہم گئے تھے۔ فریدی نے پوچھا۔ لیکن ناگر نے فواہی جواب نہ دیا۔
میں میں یقین کرلوں کہ آپ میری حفاظت کریں گے۔ ناگر نے پوچھا۔
”تی الامکان...!“ فریدی کا مختصر ساجوب تھا۔

”ہم لوگ ابھی روڈ کی کوئی نمبر سترہ میں گئے تھے۔“
”سک کی کوئی ہے۔“

”اس کا علم مجھے نہیں۔ پہلی ہی بار وہاں گیا تھا۔“
”پھر...!“

اگر خاموش ہو گیا۔ اس پر پھر رعشہ طاری ہو گیا تھا۔
”اس کی یاد بھی میرے لئے پریشان کن ہے۔ وہ کانپتا ہوا بولتا۔

”سنودوست!“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک بات اور بھی واضح کرتا چلوں وہ یہ کہ مجھے
اور حقیقت میں فرق کرنے کا کافی سیقہ ہے۔“

”میں جو کچھ بھی کہنے جا رہا ہوں اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں۔“ ناگر بولا۔
”غیر... چلو...!“ فریدی سگار سکانا ہوا بولتا۔

وہاں اس عمارت کے ایک کمرے میں مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا
روانے کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے دو خوفاں آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ سرخ سرخ
انکھیں۔ میری ہمت نہیں تھی کہ میں کسی طرح نظریں چاہ سکتا۔ میں ان کی طرف دیکھتا رہا
، ایسا محosc ہوتا رہا جیسے میرے جنم کی ساری طاقت ان خوف تک آنکھوں میں کھنچی
ہو۔ پھر مجھے ایک تیز قسم کی سرگوشی سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ آوازان آنکھوں سے
ہی ہو۔ مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ میں ایک بند گاڑی میں پلٹک جاؤں اور وہاں سے دریا میں
لگاؤں۔ میں خاموشی سے مڑا اور باہر نکل آیا۔ اس وقت میرے ذہن میں صرف ایک ہی
تفاکر مجھے دریا میں چلا گئی تھی ہے.... اچھی طرح یاد نہیں کہ میں پیدل پلٹک آیا میں
نیتاکی بند گاڑی میں یہاں تک کا سفر کیا۔“

تمہوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ پھر فریدی تیز نظروں سے اس کے چہرے کو ٹوٹا ہوا
اُس آسمانی را تقل کے بارے میں کیا جانتے ہو۔“

ناگر تھوڑی دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”اس نے مجھے بلیک میل کیا تھا۔“

پھر اس نے اسی قسم کی ایک داستان دھرا دی جیسی حید کو پاگل خانے میں سا جدے نہ
تھی۔ ناگر دراصل منشیات کی ناجائز تجارت کرتا تھا۔ مسٹر کیونے اسے ایک خط کے ذریعہ دم
دی تھی کہ اگر اس نے اس کے احکامات کے آگے سرہ جھکا دیا تو وہ اس کاراز فاش کر دے گا
اُسے بھی یہی ہدایت ملی تھی کہ وہ اپنے فیضے سے فون کے ذریعے آگاہ کرے پر نمبر و نام
زیرہ ”تھا۔

”میں فون کرنے کے متعلق کوئی اور بھی ہدایت ملتی تھی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں... کہ گفتگو شخصی میں فون کی بجائے کسی پلک میں فون بو تھے سے کی جائے۔“

”اس کے بعد کسی قسم کی گفتگو یا مشورے کے لئے کون ساطریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“ فرید
نے پوچھا۔

”مسٹر کیوں کے خطوط یا توبزری یہ ذاک آئتے ہیں یا کسی دوسرے پر اسرار طریقے سے مجھ کا
پہنچتے ہیں۔“

”پر اسرار طریقے سے۔“ فریدی نے کہا۔

”جی ہاں... آج ہی! جب میں آپ کے ساتھی کی حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کر رہا
ہے۔ مسٹر کیونے مکان کے ایک حصے میں فائر کر کے ہمیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کمرے میں
گئے تو ہمیں اس کا خط ملا اور ساتھ ہی ایک بوتل بھی جس میں غالباً سیال ایکو نیا تھی۔ خط ہا
ہدایت تھی کہ میک اپ بگاڑنے کے لئے بوتل کا عرق استعمال کیا جائے۔“

”اوہ...!“ فریدی نے ہونٹ سکوڑ کر کہا تھوڑی دیر کے لئے پھر خاموشی چھا گئی۔

”وہ لڑکی کہاں ہے.... کنوں...!“ حید نے پوچھا۔

فریدی اسے گھورنے لگا اور حید نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔

”کنوں... میں نہیں جانتا کہ وہ اب کہاں ہے۔“ ناگر نے کہا۔

”لیکن تم تیوں ساتھ ہی تو بھاگے ہو گے۔“ فریدی بولا۔

”ہم وہاں ساتھ ہی پہنچتے ہجاء ہمیں خطرات کے وقت پناہ لینے کا حکم ملا تھا۔ اس کے بعد
میں یہاں چلا آیا۔“

تحوڑی دیر بعد حمید اور ناگر انہیں رسیوں سے جکڑ رہے تھے اور فریدی ریو الور لئے کھڑا تھا۔
جب یہاں شہرناٹھیک نہیں۔ فریدی نے حمید سے کہا۔ ”تم دونوں بیٹیں نہبڑوں میں ابھی آیا۔“
وہ باہر چلا گیا اور حمید قیدیوں کے چہروں سے تاب نوچنے لگا۔
”ان میں سے کسی کو پہچانتے ہو۔“ حمید نے ناگر سے پوچھا۔
ناگر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ تینوں سر جھکا کے ذمیں پر بیٹھے رہے۔

”تینیں کس نے پہچانتا تھا۔“ حمید نے انہیں مخاطب کیا۔

لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ان میں سے دو تو خائن نظر آتے تھے۔ لیکن ایک کے رے پر اب بھی خوفناک عزم کی جھلک تھی وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ فریدی اندر داخل ہوا۔
تینوں کو اٹھایا گیا۔ ان کے ہاتھ ان کی پشت پر بندھے ہوئے تھے۔
باہر کھڑی ہوئی کار میں انہیں وہ حکیم دیا گیا۔ اگلی نشست پر فریدی اور ناگر بیٹھے پچھلی پر حمید اور جرمروں میں سے دو نیچے تھے اور تیسرا ایسٹ پر۔

”تعاقب کا خیال رکھنا۔“ فریدی نے حمید سے کہا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

حمدید پچھلے شیشے سے سڑک کی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ پھر ان کی کار جگل کی طرف مڑ گئی۔
پل کے قریب والے کوارٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ان لوگوں نے جاتے وقت اسے بند کرنے والی بھی زحمت گوارانہیں کی تھیں۔ ان کے جانے کے تقریباً آدم گھنٹے بعد ایک دوسرا کار آکر ہال رکی اور اس پر سے ایک آدمی نیچے اتر۔ اس کے علاوہ اس کار میں اور کوئی نہیں تھا۔

اس نے بھی اپنا چہرہ سیاہ نقاب سے چھپا کر کھا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑا اور ہر دیکھتا رہا پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوارٹ کے دروازے کے قریب آکر رک گیا۔ شاید وہ آہست لے رہا تھا۔ اس نے جھانک کر اندر دیکھا۔ پھر ایک سنکری اٹھا کر کوارٹ کے اندر دنی سائبان پر چکنگی۔ میں کاسائبان نئی اٹھائیں اس کے علاوہ اور کوئی آہست سنائی دی۔

دوسرے لمحے میں وہ کوارٹ کے اندر تھا۔ صحن میں ایک کرسی الٹی ہوئی ملی جس کا ایک پا یہ لوٹا ہوا تھا۔ تینوں قیدیوں کے نقاب فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ اس نے انہیں اٹھا کر دیکھا اور ایک گلب طرح کی آواز اس کے منہ سے نکلی جو کسی بھیڑیے کی غراہبتوں سے بہت کچھ مشابہ تھی۔

”آسمانی را لکھل۔۔۔ میں اسکے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“ ناگر نے کہا۔ ”کیا وہ بھی مسٹر کیوں نہیں؟“
”غایباً۔۔۔!“ فریدی اٹھ کر ٹھلٹا ہوا بولا۔ تھوڑی دیر تک خاموشی رہی پھر فریدی اس طرف مڑ کر بولا۔

”میں نے تمہیں اس سے محفوظ رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ لیکن اگر تم نے مجھے دھوکا دیا تو
کوشش کی تو شاید میں تمہارے مسٹر کیوں سے بھی زیادہ خوفناک ثابت ہوں۔“

”میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں۔۔۔ میں۔۔۔!“

ناگر کی آواز حلق میں گھٹ کر بہ گئی۔ فریدی چونک کر پلٹا۔ دروازے میں تین آدمی کھڑے تھے۔
تینوں کے ہاتھوں میں ریو الور تھے اور ان کے چہرے سیاہ نقابوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔

بھول کی بارش

فریدی کے سکون میں کسی قسم کا فرق نہ آیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی سی مکڑا پھیل رہی تھی اور آنکھوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کسی ڈرائی کار یا سلی دیکھ رہا ہو۔

”مکان چھوٹا ہے۔“ اس نے بیدگی سے کہا۔ ”اوہ مہماںوں کا تانتا بندھ گیا ہے۔“

”اپنے ہاتھ اوپر اٹھاؤ۔“ آ، والوں میں سے ایک نے سر گوشی کی حمید اور ناگر نے ہاتھ اٹھادیے۔ لیکن فریدی بدستور کھڑا مسکرا اتا رہا۔ ناگر بیری طرح کانپ رہا تھا۔

”مارنا مت۔“ دفتار فریدی چینا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے ان تینوں آدمیوں کے کھڑے نوئے کسی آدمی کو مخاطب کیا ہو۔ تینوں چونک کر مڑے لیکن دوسرا ہی لمحے میں ان کے روپ الور زمین پر تھے اور فریدی اُن پر پلی پڑا تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ پیچھے کی طرف الٹ۔

حمدید نے بے تھاں چھلا گئ کلائی اور زمین پر پڑے ہوئے ریو الوروں پر قضا کر لیا۔

”ابے او گیدڑ کے پنج۔“ حمید نے ناگر کو لکھا۔ لیکن اس نے سر اٹھانے کی بھی بہت نہ وہ اسے اُسی حال میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ فریدی اُن تینوں سے گھاہو اتھا۔

”ہیڈز اپ۔“ حمید آہستہ سے بولا اور فریدی انہیں چھوڑ کر الگ ہٹ گیا اور ان تینوں اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے۔

جیدا پس اچھی طرح ہلا کر دیکھنے کے بعد بولا۔ ”سب ٹھیک ہے۔ اوہ وہ روشنی پھر....
بھی معلوم ہوتی ہے۔“

فریدی نے کار روک دی لیکن انجن بند نہیں کیا۔ پھر وہ ناگر کو بازو سے پکڑ کر اتر گیا۔ جید
کے پیچے تھا۔

وہ تینوں قریب کی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہیں بچھا ایک کار دکھائی دی جو ان کی کار سے تھوڑے فاصلے پر رک گئی
اور اس کی یہی لاٹش کی روشنی ان کی کار کے پیچھے حصے پر پڑی تھی۔ جید نے ریوالر بکال
ایک آدمی کار سے اتر کر نیچے کھڑا ہو گیا۔

”شش...!“ فریدی جید کا بازو پکڑ کر آہستہ سے بولا۔ ”اسے کار کے قریب آنے دو۔“

اس آدمی کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ فریدی کی کار کی طرف بڑھنے کا ارادہ
ہے۔ وہ پنڈ لمحے اسی طرح کھڑا رہا۔... پھر اپنی کار میں بیٹھ کر اسے پیچے کی طرف لے جانے لگا۔

”چلو بڑھو....!“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”کوئی خطرناک ارادہ۔ اس کے قریب ہی رہو۔“

وہ تینوں اس کی کار کے ساتھ ہی ساتھ پیچھے کی طرف چلتے رہے۔ کار کافی پرانے ماذل کی اور
اٹھی۔ اس نے اس کا انجن خاصا شور چمارہ تھا۔ بھی وجہ تھی کہ فریدی نے جھاڑیوں کی
کھڑاہٹ کی بھی پرواہ نہیں کی تھی۔ اسے یقین تھا کہ انجن کے شور میں جھاڑیوں کی آوازیں
جاںیں گی۔ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد کار رک گئی اور انجن بند ہو گیا۔
کی اور سنائے کا وہی عالم تھا۔

”آخریہ کیا کرنے جا رہا ہے۔“ جید نے سرگوشی کی۔

”وکھیتے جاؤ۔“ فریدی بولا۔

ناگر کا پر رہا تھا۔

”ماں تم آدمی ہو یا بدیم جھوٹوں۔“ فریدی نے اس کے کامنے پر رہا تو رکھ کر کہا۔ ”ریوالر کی
امان نہیں رکھتا، ورنہ کہیں اپنے ہی گولی نہ مار لو۔“

پھر وہ جید کی طرف مڑ کر بولا۔ ”ضرورت کے وقت فائز کرنے کی اجازت ہے۔“

وہ تینوں یعنی کے بل ریگتے ہوئے جھاڑیوں سے نکلے۔... لیکن کار بالکل خالی تھی۔

پھر وہ برآمدے میں آیا چند لمحے اوہر اور ہر دلکھارا۔ کمرے کا بلب روشن

کمرے میں اسے ناگر کے بھیکے ہوئے کپڑے ملے جنہیں اس نے بہت احتیاط سے اپنے
میں پکڑ لیا۔ تھوڑی دیر کمرے کی مختلف چیزیں اللئے پلتے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا۔ اگر
کپڑے کار میں ڈال دیے۔ اگلی سیٹ سے ایک چھوٹا سا صندوق اٹھایا جس سے ایک بڑا سامان
رہا تھا۔ زمین پر جھک کر اس نے فریدی کی کار کے نشانات دیکھے اور وہ صندوق ایک پیٹے کے
پر رکھ دیا۔ تار کا سلسلہ موڑ کی بیٹھی سے ملاتے ہی صندوق کی سطح روشن ہو گئی۔ صندوق کا وہ
حصہ دراصل شنیشے کا تھا۔ اس کے نیچے ایک بڑی سی سوئی تھی جو آہستہ آہستہ حرکت کر
تھی۔ سوئی کے گردو پیش بے شمار چھوٹی چھوٹی آڑی، ترچھی، اور سیدھی لکیریں تھیں۔
کہیں تو سیں، دائرے اور زاویے بھی نظر آ رہے تھے۔ سوئی اپنا چکر پورا کرنے سے قبل ہی
جلگہ رک گئی۔ اس نے جھک کر دیکھا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار بھی اوہر ہی جادہ تھی جدھر فریدی کی گئی تھی۔

رات ڈھل رہی تھی اور چاند افق کی طرف جھک رہا تھا۔ سنائے کی چادر کا نکات پر محیط
چھپوں کے جنگلوں میں گھستے ہی فریدی کو کار کی رفتار کم کر دینی پڑی تھی راستہ ہموارہ
بار بار جید سوچنے لگتا تھا کہ کہیں کارالٹ ہی سہ جائے۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندر ہمراپیل
دفعتاً جید کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

”لیکا بات ہے۔“ فریدی نے چونک کر پوچھا۔

”تعاقب...!“

”لیکا...؟“

”جی ہاں.... جھاڑیوں میں.... ابھی دوزہ یہی لاٹشیں چکیں تھیں.... غالباً کوئی کار نہیں۔
لیکے... کون؟“ ناگر ہکلا کر رہ گیا۔

تینوں قیدیوں نے اچھانا شروع کر دیا تھا۔

”ذرالٹ کی کنپی سہلاو۔“ فریدی نے جید سے کہا۔

جید کے تین ہی گھونسوں نے انہیں خاموش کر دیا۔ گھونسے کنپیوں پر مارے گئے تھے۔

”ان میں سے کوئی ہوش میں تو نہیں۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

بلد نمبر 9

”چلنے کا رکی خبر لیں۔“ تاگر بولا۔

”ہمار... شاید کار کے مکلوے بھی نہ ملیں۔ کیا تم روشنی نہیں دیکھ رہے ہو۔ آگ چاروں
لوف پھل رہی ہے۔ بس اب بیباں سے نکل چلو۔“

”مجھ میں اب چلنے کی بھی تاب نہیں۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”چلو تو آؤ میری پیٹھ پر۔“ فریدی نے کہا۔

فریدی نے اسے پیٹھ پر لاولیا۔ آگ پھیلتی جا رہی تھی... تاگر کویدیکے کر حیرت ہوئی کہ
زیدی اب بھی اتنی ہی آسانی سے دوڑ رہا تھا جتنی آسانی سے اب تک دوڑتا آیا تھا۔ تاگر کی سانس
بڑی طرح پھولوں رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سانس ہی درست کرنے کا موقع مل جاتا۔
سرک پر پہنچ کر فریدی نے حمید کو اتار دیا۔ تاگر گر کر زمین پر ہائپنے لگا۔

”میرا خیال ہے کہ مسٹر کیو کے گروہ میں تم سب سے کچھ تھے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”اگر.... میں.... میں.... آپ کے ساتھ.... نہ ہوتا.... تو.... میرا ہادث فیل
ہو جاتا۔“

”وہ کار کس کی تھی۔“ حمید نے پوچھا۔

”سر کاری۔“ فریدی بولا۔ ”بھئی جلدی کرو! کم از کم دس میل پیدل چلانا پڑے گا۔“

”کیا بے بھی ہے۔“ حمید مضمحلہ کی بھئی کے ساتھ بولا۔

”ہے تو۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”لیکن اگر ایسے میں تمہیں کوئی لڑکی مل جائے تو۔“

”جہنم میں گئی لڑکی۔“ حمید غار کر بولا۔

”کیوں بھئی تاگر۔“

”جی.... مجھے تو آپ مسٹر کیو سے بھی زیادہ عجیب معلوم ہوتے ہیں۔“

”وہ تینوں مفت میں مارے گئے۔“ حمید نے کہا۔

”بھئی چلتے رہو۔“ فریدی سکار سکاتا ہوا بولا۔

”مجھے تواب بھی یقین نہیں کہ میں زندہ ہوں۔“ تاگر خوف زدہ آواز میں بولا۔

”کیوں....؟“

”مسٹر کیو! ایسے آدمیوں کو زندہ نہیں چھوڑتا جنہیں سمجھتا ہے کہ وہ پولیس کے ہاتھ لگ

240

”وہیں مار لیتے تو بہتر تھا۔“ حمید بڑا بڑا۔

فریدی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سنائی دیا۔ پھر دوسرا اور ایسا معلوم ہوا
پورے جنگل میں آگ لگ گئی ہو۔

”بھاگو...!“ فریدی حمید کا ہاتھ کھینچتا ہوا بولا۔

وہ تینوں تیزی سے چیچے کی طرف دوڑ رہے تھے۔

”آخر... بب... بات کیا ہے۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔ ایک دھماکا اور ہوا۔

”شاید اے... نے کار پر بم مارا ہے۔“ فریدی نے کہا۔ ”اور اب ادھر ادھر چھینک رہا ہے۔“

”م... مسٹر کیو...!“ تاگر نے رونی آواز میں پوچھا۔

بھر دھماکہ ہوا۔ کار کے انجن کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

”جھاڑیوں میں... گھسیں؟“ حمید نے پوچھا۔

”بس بھاگتے رہو... ایسی حفاظت نہ کرتا۔ یہ بم غالباً ادھر ادھر کی جھاڑیوں ہتھ میں
جار ہے ہیں۔“

”تب تو مارے ہی گئے۔ میں پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ حمید ہانپتا ہوا بولا۔

”بینے! حمید خال! اس وقت اس سے الجھنا ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں اسکے پاس کتنے اور بم ہوا
کار کی بیڑا لائیں کا عکس سامنے کی جھاڑیوں کے اور پری حصے پر پڑ رہا تھا۔ کار شاید کسی
نشیب میں تھی۔ ایک دھماکہ کہیں قریب ہی ہوا اور تیز قسم کی روشنی کے ساتھ ہی انہوں
آئی بھی محسوس کی۔ دوسرے ہی لمحے میں کار سر پر تھی۔ تینوں نے وہی طرف کی جھاڑیوں
چھلانگ لگادی۔ فریدی نے پلٹ کر کار پر فائز کیا۔ دوری والوں اور چلے۔ لیکن کار تیزی سے گزنا
وہ بھی تک قاتر کے جا رہے تھے۔

”چلو بس بھی کرو۔“ فریدی جھلائی ہوئی آواز میں بولا۔

کار کے انجن کی آواز کہیں دور سنائی دے رہی تھی۔ رفتہ رفتہ بھی سنائی میں گھنی میں

”بڑی چوٹ ہوئی۔“ حمید بولا۔

”اس کے علاوہ نہیں کہ اب پیدل چلتے کچور نکل جائے گا۔“ فریدی نے کہا۔

بموں کا اتنا کھتم ہو گیا تھا۔“

جانیں گے۔

”مگر! تم کہتے ہو کہ کسی نے اُسے آج تک دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”جی ہاں!“

”پھر اسے کس بات کا خوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس کے ساتھیوں کو پولیس پکڑ لے جائے تو اس پر ہاتھ پڑنا محال ہے۔“

وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی کو اس کا نام ہی معلوم ہو سکے۔

”اوہ....!“ فریدی نے کہا اور پکچہ سوچنے لگا۔ ”ٹھیک ہی تو ہے۔ اگر پولیس کو یہ معلوم ہوئے کہ کوئی مجرم سیکرٹ سروس والوں کی میلی وونک ٹرانسٹشن سروس استعمال کر رہا ہے تو اسے ہر کروڑے گی اور مسٹر کیواں بہت بڑی آسانی سے محروم ہو جائے گا۔“

”تب تیار ناگر۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تمہیں مر ہی جانا چاہئے۔“

”جج....جی....!“ ناگر چلتے چلتے رک گیا۔

”ہاں! تمہیں مر جانا چاہئے۔“

”لیکن....!“ وہ تھوک نگل کر بولا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں مسٹر کیو سے مجاہد گا۔ لہذا میں اسی وقت تمہیں دوبار بچاچ کا ہوں۔ لیکن میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ تمہیں زندہ رہنے دوں گا۔“

ناگر کے منہ سے ایسی آوازیں نکلے لگیں جیسے اُسے فرج بک ہو گئی ہو۔

”چپ رہو گھاگس....!“ حمید اس کی بیچھے پر گھونسہ جماڑ کر بولا۔

”میں مر جاؤں گا۔“ ناگر نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔

”اچھا! تو لڑ و باشنے کی بات ہو رہی تھی۔“ حمید نے بڑے بڑے دردی سے قہقہہ لگایا۔ ”ٹھاکرے کے مارے جاؤ گے تو ضرور مر جاؤ گے۔“

”مجھے معاف کر دیجئے۔“ ناگر گھٹکھیا کر بولا۔

”ابھی نہیں! مر جاؤ گے تب۔“ حمید نے جلا کر کہا اور فریدی ہنسنے لگا۔

”واقعی تم بڑے ڈرپاک ہو۔“ فریدی اس کا شانہ ٹھککتا ہوا بولا۔ ”مجھے حیرت ہے کہ مسٹر جیسے مختار آدمی نے تمہیں کس طرح اپنے گروہ میں شامل کر لیا تھا اور مجھے تواب اس میں بھی۔“

”کہ تم نیاں کی ناجائز تجارت کرتے رہے ہو۔ ایسے لوگ بھی تھوڑے کیا کافی دلیر ہوتے ہیں۔“
”ناگر پکچہ نہ بولا۔“

”خیر میں تمہیں خود نہیں ماروں گا۔“ فریدی نے تھوڑی در بعد کہا۔ ”تمہیں خود کشی کرنی گی۔“
”خود کشی۔“

”ہاں.... ظاہر ہے کہ مسٹر کیو نے تمہیں پہنچائیز کر کے خود کشی ہی کے لئے بھیجا تھا اور اُس تھہارے پچھے کسی کو لگا بھی دیا تھا جس نے اسے اطلاع دی کہ تم مرنے سے بچا لئے گے ہو۔“
”پھر....؟“
”پھر یہی کہ تمہیں خود کشی کر ہی لیئی چاہئے ورنہ مسٹر کیو کو بڑا دکھ ہو گا اور میں نہیں چاہتا اس بے سہارا تیکم کا دل دکھے۔“

”آپ مذاق کر رہے ہیں۔“ ناگر خوفزدہ آواز میں بسا۔

”ویسے! تم رہتے کہاں ہو۔“ فریدی نے پوچھا۔

”بھیں جانا کہاں ہے۔“ حمید نے جلا کر پوچھا۔

”بکومت.... ہاں.... تم نے نہیں بتایا۔“

”پرنس لین میں۔“

”مالدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ فریدی نے کہا۔ پھر قدرتے توقف سے پوچھا ”اور کون نا ہے تمہارے ساتھ۔“

”کوئی نہیں.... میں تمہارہ تھا ہوں۔“

”تب خود کشی کے لئے گھر ہی مناسب رہے گا۔“

”نہیں! نہیں۔“ ناگر کا نیپتا ہوا بولا۔ ”میں بالکل ویسا ہی محسوس کر رہا ہوں دریا میں لوٹنے سے قبل.... نہیں.... میں خود کشی نہیں کروں گا۔“

”کیا محسوس کر رہے ہو۔“ حمید نے پوچھا۔

”بالکل یہی کہ مجھے خود کشی کر لئیں چاہئے۔ دریا میں کوئنے سے قبل بھی یہی ایک خیال مرے ذہن میں تھا کہ مجھے دریا میں کو د جانا چاہئے.... نہیں نہیں میں مرتا نہیں چاہتا۔“

”تم اپنے گھر میں خود کشی کرو گے۔“ فریدی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔
تاجر کے منہ سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ لٹکی اور بیہوش ہو کر گر پڑا۔

خفیہ پیغام

تیرے دن پر نس لین کی کوئی نمبر گیراہ میں تاجر کی لاش پائی گئی۔ وہنی کپٹی پر گول
تھی۔ پولیس کو اس نتیجے پر پہنچا پڑا کہ وہ خود کشی کا کیس تھا۔ کیونکہ قریب پڑے ہوئے ریوالو
دستے پر مرنے والے ہی کے انگلیوں کے نشانات ملے تھے۔ کوئی کی علاشی لینے پر کافی مقدار
کو کین برآمد ہوئی اور پھر کچھ کافیات بھی ملے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مرنے والا بڑے پیار
پر مشیات کا ناجائز لین دین کرتا تھا۔

کوئی کے باہر کافی بھیڑ تھی جس میں اخبازوں کے روپورٹ بھی تھے۔ پولیس نے کسی کو
اندر نہیں جانے دیا۔ سرجنت حمید تھوڑی دیر تک کھڑا لوگوں کی چہ میکوئیاں سنتا رہا پھر وہاں
چل پڑا۔ اس کے چہرے پر گھنی موچھیں تھیں اور آنکھوں پر تاریک شیشوں کا چشم۔... بلا
شکاریوں جیسا پین رکھتا تھا۔ اس نے ایک ٹیکسی کی اور پھر روز نامہ نیواشار کے دفتر کے قریب اڑا
دفتر کے سامنے والے ریستوران میں داخل ہو کر اس نے اور اُدھر اُدھر دیکھا۔ دوسرے
کنارے پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے سکرا کر اسے آنکھ ماری جیسے اس لفافے میں کوئی عشقی خط ہوا
کے قریب چھپنے لگا۔

”کیا رہا؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”تمہاری خود کشی خاصی کامیاب رہی۔“ حمید بیٹھتا ہوا بولا۔

تاجر ہنسنے لگا۔ اس کے چہرے پر بھی فریدی نے اپنی استادی دکھائی تھی۔ اتنا شامدار میکا
تھا کہ خود تاجر ہی پہلے اچنچھے میں پڑ گیا تھا۔

”کافی بھیڑ ہو گی۔“ تاجر نے پوچھا۔

”کچھ مت پوچھو تمہاری شادی پر بھی اتنے آدمی اکٹھانے ہوتے۔“

”لیکن لاش کہاں ملی تھی۔“

”اوہ! بھی کوئی بڑی بات ہے۔“ حمید اپنی نقلی موچھوں کو اینٹھتا ہوا بولا۔ ”سول ہسپتال
کے لوارٹ مردہ لے کر اس پر تمہارا میک اپ کر دیا گیا۔“
”لیکن.... مردے میں خون کہاں سے آیا ہو گا۔“

”یاد تم ڈیوٹ ہو! اسے بکرے کا خون۔ دیے تم بھی کسی بکرے سے کم نہیں ہو۔“ حمید نے
”اب تم خود کشی کی وجہ بھی پوچھو گے۔“

”یقیناً....!“

”تمہارے مشر کو کو مطمئن کرنے کے لئے۔ ورنہ وہ تمہیں پاتال میں بھی نہ چھوڑتا۔“
”کوئی اور دوچھا۔“ تاجر نے پوچھا۔ ”ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو مجھ سے ہمدردی نہیں ہو سکتی۔“
”جید تھوڑی دیر تک اُسے غوریے دیکھتا رہا پھر بولا۔“
”مجھے اب بھی تم پر شبہ ہے۔“

”کس بات کا۔“ تاجر چوک کر بولا۔

”یہی کہ کہیں تمہاری کھوپڑی میں بھیں کے بجائے عقل تو نہیں بھری ہوئی ہے۔“ حمید
ماوراء الشارع سے ایک دیش کو بلکہ اس سے بولا۔

”ایک کام کرو گے.... اوہ اچھا.... ٹھیک! یہ سامنے اخبار کا دفتر ہے نا! یہاں ایک مس
ہیں.... جانتے ہو گذ.... تو یہ لفافہ انہیں دے آؤ۔ کیا سمجھے؟“

حمید نے اس طرح اسے آنکھ ماری جیسے اس لفافے میں کوئی عشقی خط ہو۔

”اور یہ لو اپنا انعام۔“ اس نے ایک روپیہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ویر سلام کر کے چلا گیا۔
”کیوں اُستاد۔“ تاجر اپنی ایک آنکھ دبا کر مسکرا یا۔

”تاجر!...!“ حمید نے سجدگی سے اُسے مخاطب کیا۔

”فرمانیے۔“

”تم نے کبھی عشق کیا ہے۔“

”کس سے۔“

”کسی سے۔“

”کسی سے۔“

”ہاں!...!“ تاجر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مجھے زندگی کے ہر حصے میں دولت سے عشق رہا ہے۔“

”دھت....!“ حید نے برا سامنہ بنا کر کہا۔ ”تم فلسفی معلوم ہوتے ہو... تمہیں کنوں نہیں پسند آئی تھی۔“

”دولت کسی ایک کنوں کی پابند نہیں ہوتی۔“ ناگر مسکرا کر بولا۔ ”مگر وہ دوسرا میں اُسے کبھی نہ بھلا سکوں گا۔“

”اوہ! بر سینیل تذکرہ... یہ تو بتاؤ کہ اس رات کیا مجھے پہچان کر بے وقف بنایا گیا تھا“ ”قطیعی....!“ ناگر سر ہلا کر بولا۔ ”کنوں تمہیں بیچاتی تھی۔ اُس نے تو یہاں تک تباہی کیا تو کیڈیلاک مسٹر فریدی کی تھی۔ حید صاحب امیر اخیال ہے کہ کنوں اس گروہ کے ہمراوں میں سے ہے اور اس جبھی کی تو اس سے روح فار ہتی ہے۔“

”ہے زوردار....!“ حید نے اپنے پاپ میں تمباکو بھرتے ہوئے کہا۔

”دنیا کی مکار ترین لڑکی کہہ لو۔“ ناگر بولا۔

”تو ہوڑی دیر خاموشی رہی پھر ناگر ہی بولا۔“

”اب ہمیں کیا کرتا ہے۔“

”ہدایات کا منتظر۔“

”مسٹر فریدی کہاں ہوں گے۔“

”غداہی جانے! تمہارے مسٹر کیوں کو بھی دانتوں پیسنے آجائے گا۔“

”میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ ناگر کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”کیا یہ کم جیت انگیز کہ میں نے خود کشی بھی کر لی ہے اور زندہ بھی ہوں۔ میری جگہ دراصل جیل خانہ میں ہوں چاہی۔ لیکن محکم سراغ رسانی کے ایک آفیسر کے ساتھ بیٹھا غصیں مار رہا ہوں۔“

”شش....!“ حید نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس کی نظریں دروازے کی رفتار پر ہوئی تھیں جہاں کرامہ رپورٹ اور محکم سراغ رسانی کا بوڑھا انپیکٹر آصف داخل ہو رہے تھے۔ اُنور ایک جواں سال خوبصورت، ذہین گر لا پواہ آدمی تھا۔ بظاہر تو ایک معقول کرامہ رپورٹ کا تھا۔ لیکن شہر میں ہونے والے جرام سے اس کا تھوڑا بہت تعلق ضرور ہوا کرتا تھا۔ لیکن ہوشیار تھا کہ قانون کی گرفت میں آنے سے قبل ہی کوئی نیا قتنہ کھڑا کر کے الگ ہو جاتا۔ کے آفیسروں میں فریدی کے علاوہ اور کسی سے نہیں دیتا تھا۔ فخریہ کہتا تھا کہ میں فریدی کا ثانیاً لے اور اور رشیدہ کے کارناموں کے لئے جلد نمبر 4 اور جلد نمبر 5 ملاحظہ فرمائیے۔

ولی رشیدہ اس کی دوست تھی۔ دونوں ایک ہی دفتر میں کام کرتے تھے اور ایک ہی فلیٹ میں ہے تھے۔ رشیدہ کافی حسین مگر مضبوط اعضاء کی لڑکی تھی۔ چال ڈھال میں نسوانیت کی بجائے اُنھیں قسم کی مردانگی رکھتی تھی۔

انپیکٹر آصف محکمہ سراغ رسانی کے ان آفیسروں میں سے تھا جو عموماً دوسرے کے کام نہ ہے۔ پر کہ کر بیندوق چلانے کے قائل تھے۔ اس پر جب بھی کوئی آفت آتی وہ انور کے پیچھے لگ جاتا۔ سے مدد کا طالب ہوتا، کبھی خوشامد میں کرتا اور کبھی دھونس دھڑلے سے کام نکالنے کی کوشش رہتا۔ انور اُسے عموماً ”بوزہ ہے بیٹے“ کہہ کر مخاطب کرتا۔ وہ تینوں حمید اور ناگر کے قریب ہی ایک میز پر آبیٹھے۔

انور آصف سے کہہ رہا تھا۔ ”چلو جلدی سے آرڈر چلیں کرو۔“

”تم بیشہ گردن ہی کائنے کی فکر میں رہتے ہو۔“ آصف نہ کر بولا۔ ”خیر... بواۓ۔“

اس نے ویٹ کو بلکر تین آدمیوں کے لئے لٹھ کا آرڈر دیا۔

”ہوں.... اب کہہ چلو۔“ انور رشیدہ کی طرف دیکھ کر مسکرا گیا۔

”ظاہر ہے کہ تم اس موقع پر نکلنے نہ بیٹھو گے۔“ آصف نے کہا۔ ”میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ رجمھ سے مل کر کام کرو تو کیا حرج ہے؟“

”چلو منظور ہے۔ میں مرتبہ دم تک تم سے مل کر کام کرتا رہوں گا۔ کام بھی تو بتاؤ۔“

”اُنے لگے آخر! میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔“

”خیر یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔“ انور مسکرا کر بولا۔

”آخر وہ رائفل.... کس کی ہو سکتی ہے۔“ آصف نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری ہی ہے۔“ انور نے سمجھی گئی اور لا پرواہی سے کہا۔

”پھر وہی۔“ آصف بگز کر بولا اور رشیدہ ہنسنے لگی۔

حید اور ناگر آس کریم کھانے میں مشغول تھے۔

”تمہارے استاد۔“ آصف تھوڑی دیر کے بعد بولا۔ ”تونہ جانے کس چوہے کی بل میں باگھے ہیں۔“

”اور آخر میں یقیناً کسی ہاتھی کی سوٹھ پکڑے ہوئے برآمد ہوں گے۔“ انور بولا۔

"ہونہم....! "آصف نے بُر اسامنہ بنایا۔

ویٹر نے کھانا میز پر لگادیا تھا۔

"بہر حال تم اطلاعات چاہتے ہو۔" انور نے کہا۔ "لہذا سب سے بڑی اطلاع یہ ہے کہ تم میں تو خود ہی اندر ہی رہے میں ہوں۔"

"میں اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"تم تو شائد اسے بھی تسلیم نہ کرو کہ بعض اوقات تم بڑے حسین معلوم ہوتے ہو دیا۔ بر سبیل تذکرہ میرے پاس سگریٹ بھی نہیں ہیں۔"

"تم ڈاکو ہو۔" آصف بگڑ کر بولا۔ "میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں۔"

"کیوں! کیا اب اس فیشن اسپیل بوجہ ہی عورت سے کچھ نہیں ملتا جس نے مارٹن روڈ پر خانہ کھول رکھا ہے۔"

آصف تھیج آمیر نظروں سے انور کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر کچھ بڑی ذات ہوئے اس نے جب سے پرس نکالا۔

انور نے ویٹر کو آنکھ کے اشارے سے بلا کر آہستہ سے کہا۔ "ائیٹ ایک پرنس کے دومن۔" "دونہیں ایک۔" آصف جلا کر بولا۔

"اس عورت کے پاس ایک لڑکی بھی ہے....!" آصف نے انور کو جملہ نہ پورا کرنے دیا۔ دس کا ایک نوٹ نکال کر ویٹر کے ہاتھ میں تو ہوا جلدی سے بولا۔ "چلو بھاگ کر جاؤ ہی! لانا۔"

پھر وہ قہر آکد نظروں سے انور کو گھورنے لگا۔ رشیدہ دوسرا یہ طرف منہ پھیر کر مسکراہی تھی۔ "آج کل میں بڑی پریشانیوں میں بتلا ہوں۔" انور سر جھکائے ہوئے بڑی ذات لگا۔ "فیکٹیں ماہ کا کرایہ چڑھ گیا ہے۔ لانڈری والے نے تقاضوں کی بھرمار کر رکھی ہے۔ رشیدہ کا اُ قرض دار ہوں۔"

"یار تم کیوں میرے پیچے پڑ گئے ہو۔" آصف بے بُسی سے بولا۔

"صرف دوسرو پیٹے مجھے بطور قرض دے دو۔" انور اسی طرح سر جھکائے ہوئے بولا۔ "پائی او اکروں گا۔"

"میں کوئی قارون ہوں۔" آصف نے جلا کر کہا۔

"خیر نہ دو۔" انور نے مخصوصیت سے کہا۔ "ویسے میں دوسرا طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہوں۔"

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔" آصف بھڑک اٹھا۔

"یہ تو تم بچ کہہ رہے ہو۔" انور نے ٹھنڈے پانی کا گاس چڑھا کر پیٹ پر با تھ بھیرتے ہوئے کہا۔

سگریٹ آگئے اور ویٹر میز صاف کر کے چلا گیا۔ آصف انور کو بد ستور گھورتا رہا۔

"تم خود کونہ جانے کیا سمجھنے لگے ہو۔" اُس نے کہا۔

"ایک ایسا تیم جو قطعی بے سہارا ہو۔" انور مسمی صورت بتا کر بولا۔

آصف کی جلا بہت اور بڑھ گئی اور وہ رشیدہ کی طرف مڑ کر بولا۔

"تم بھی نہیں سمجھاتیں اسے! مجھے یقین ہے کہ کسی دن بڑی مصیبت میں بچن جائے گا۔"

"کبھی کبھی سمجھا دیا کر دیجئی۔" انور نے سنجیدگی سے کہا اور رشیدہ نہ پڑی۔

آصف مل ادا کر کے اٹھنے لگا۔

"تو تم میری مدد نہیں کرو گے۔" انور نے کہا۔

"نہیں.... نہیں.... نہیں۔"

"خبر اب اس عورت کی خیر نہیں.... اور جو کچھ بھی بیان وہ عدالت میں ذائقے گی ظاہر ہے۔"

"تم مجھے بلیک میل کرنا چاہتے ہو۔"

"جتنی بھی طرح دیتا ہوں اتنا ہی تم سر پر چڑھتے ہو۔"

"خبر اگر میں سر پر چڑھا ہوتا تو تمٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور لو ٹھزوں کا ڈھیر ہوتے۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو۔" آصف ایک جھٹکے کے ساتھ بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم میری مدد کرو! میں تمہاری مدد کروں گا اور ساتھ ہی دعا کروں گا کہ خدا میرا اور تمہارا

بیل پلار کرو۔"

"تم مجھ سے ایک جب بھی نہیں لے سکتے۔"

"تمہاری مرضی! میں زبردستی کا قاتل نہیں۔" انور نے آہستہ سے کہا اور اس کے چہرے پر

فرشتوں کی سی مخصوصیت نظر آنے لگی۔

"اچھا چھپلے ہی میئنے میں مجھ سے ڈھانی سو لے چکے ہو۔"

”اور کیا....؟“
”میرے لئے کچھ نہیں لکھا۔“
”نہیں.... بہت ممکن ہے کہ آگے چل کر تم بھی جھوکے باو۔“
”شاید یہ میرے لئے پہلا اتفاق ہے کہ شہر میں ہونے والے کسی جرم کے متعلق لا علم ہوں۔“
رشیدہ کی نظر میں اس کے چہرے پر جگہ ہوئی تھیں۔
”اوہ....!“ انور پر خیال انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ یہ وہی را کفہ والا چکر ہے۔“
کہاں۔ یہ سب کچھ نہیں لکھا۔“
”خط کس سے طلب۔“
”میں کے ایک دشیر سے۔“
”ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فریدی صاحب کے ہاتھ کوئی کڑی آگئی ہے۔ اسی لئے ان پر حملہ ہاوا تھا۔“
”ہو سکتا ہے.... وہ ماٹکروں و فون والا معاملہ بھی معمولی نہیں تھا۔“
”اور شاید وہی جملے کا باعث بھی تھا۔ فریدی صاحب کے اس اکشاف نے اس عجیب و
یہ اسلئے کو قریب بیکاری کر دیا۔“
”مر جنت حمید کا بھی کہیں پتہ نہیں۔“ رشیدہ بولی۔
”ساتھ ہی ہو گا۔“
”اچھا تو اب وقت ہو رہا ہے.... میں چلی۔“ رشیدہ کلائی کی گھری دیکھ کر اٹھتی ہوئی بولی۔
”کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس۔“ انور نے کہا۔ ”تخواہ پر لے لینا۔“
”ایک پاپی بھی نہیں.... میں نہیں دے سکتی۔“
”نہ جانے کیوں آج بہت حسین لگ رہی ہو۔“
”نہیں میں جشن ہوں۔“ رشیدہ نے منہ بنا کر کہا اور باہر نکل گئی۔
انور انتہائی تنگی سے ہونٹ سکوڑے ہوئے سیٹی بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”یہ بھی تو سوچو کہ تم نے پچھلے مہینے میں لو ہے کی چور بازاری کے سلے میں ڈیڑھا
کمانے تھے۔“
”اہستہ بولو۔“ آصف اور ہر اور ہر دیکھ کر بولا۔ ”عجیب لغو آدمی ہو۔“
”بہر حال، اگر تم نے ڈیڑھ ہزار میں سے ڈھائی سو نکال دیئے تو کون سا بڑا اکمال کیا۔“
”میں ایک پاپی بھی نہ دوں گا۔“
”ماں گا کون ہے تم سے۔“ انور بھی گزر کر بولا۔ ”میں براہ راست اسی سے معاملہ طے کر لوں گا۔“
”لیا....!“ آصف اچھل کر بولا۔ ”تم اس سے بات بھی نہیں کر سکتے۔“
”بات!“ انور سنجیدگی سے بولا۔ ”میں اسے فامی گیت تک سناؤں گا۔“
”خیر دیکھ لوں گا۔“
”تمہاری آنکھیں کمزور معلوم ہوتی ہیں۔ چشمہ لگا کر دیکھنا۔“
”اچھا....!“ آصف دانت پیٹتا ہوا بولا۔ ”نیکجا جائے گا۔“
وہ تیزی سے ریسٹوران سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد ہی ناگر اور حمید بھی اٹھ گئے۔
رشیدہ انور کو مسکراتی ہوئی نظر وہیں سے دیکھ رہی تھی۔
”تم کسی دن ضرور چھنسو۔“ اس نے کہا۔
”شکار نکل گیا۔“ انور ہاتھ تماہی ہوا بولا۔
”ہر میں تو لوٹتے ہو! غریب کو۔“
”غریب کہتی ہو۔ اس لکھ پتی کو۔ اس سے بڑا راشی شاید پورے مجھے میں کوئی نہ ہو۔“
”حالت تو چھاروں جیسی بجائے رکھتا ہے۔“
”تو نبی کر کے گردن تھوڑا ہی کٹوائے گا۔“ انور بولا۔
”ابھی ابھی فریدی صاحب کا خط ملا۔“ رشیدہ نے تھوڑی دیر بعد کہا۔
”کیا لکھا ہے؟“
”جیس اینڈ جعفری کی فرم کے لئے ایک لیڈی اسٹیوناپسٹ کی جگہ نکلی ہے! آج ہی انڑو!
فریدی صاحب نے لکھا ہے کہ میں انڑو یوں میں جاؤں۔“
”تو گویا.... وہ چاہتے ہیں کہ تم اس فرم میں ملازمت کرلو۔“

ڈراونا آدمی

جیس اینڈ جعفری کا دفتر حسن لاج کے تین چار فلیٹوں پر مشتمل تھا۔ شہر کی بڑی فرمول میں جیس اینڈ جعفری کا بھی شمار ہوتا تھا۔ فرم کا ایک پارٹنر جعفری ہی اس کا جزل نیجر بھی تھا دوسرے حصے دار غیر ملکی تھے۔ جیس سب سے بڑا حصہ دار اور بالینڈ کا باشندہ تھا لیکن وہ یہاں نہیں رہتا تھا۔ اس کی یہاں کی تجارت کی دلکشی بھال اس کا مختار مسٹر ہر شفیلڈ کرتا تھا۔ وہ بھی ہر ماہ کے اختتام ہی پر دفتر میں آتا تھا۔ مختصر یہ کہ فرم حقیقتاً جعفری ہی کی کار کردگی کی بناء پر جل رہی تھی۔ جعفری کے کمرے کے سامنے ایک بڑا کمرہ تھا جس میں اس کی سیکریٹری راحیلہ بیٹھی تھی اور شاید یہی کمرہ ملاقاتیوں کے لئے بھی تھا۔ حالانکہ اسٹر ویو کا وقت دو بجے تھا لیکن نو ہی بجے سے امیدوار آنے لگی تھیں۔ دو بجتے بجتے تو غاصی بھیڑ ہو گئی۔ ان میں بھی نوجوان اور قبول صورت تھیں۔ جو نہیں بھی تھیں انہوں نے بننے کی کوشش کی تھی۔ انہیں میں رشیدہ بھی نظر آ رہی تھی۔ ابھی تک اس کا نمبر نہیں آیا تھا۔ اسٹر ویو کے لئے اندر جانے سے پہلے ہر لڑکی اپنے پر سے چھوٹا سا آئینہ نکال کر اپنے بالوں اور چہرے پر تقدیمی نظریں ضرور ذاتی تھی۔ بعض اُنہوں پر لپ اسٹک کی نئی تہہ چڑھانے لگتیں۔ رشیدہ نے اپنا پرس مٹھلا لیکن اس میں کیا تھا۔ انواع اسے ایک لکھاٹک تو رکھنے نہیں دیتا تھا۔ لپ اسٹک تو خیر اس نے برسوں سے نہیں استعمال کر تھی۔ انور کا قول تھا کہ لپ اسٹک لگانے سے حسن کی عصمت دری ہو جاتی ہے اور چہرے سے فاٹھہ پن مٹکنے لگتا ہے۔ البتہ ہلکے سے پاؤڑ اور اتنے ہلکے سے روچ پر کہ سرفی قدرتی معلوم ہے اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔

ابھی کئی لاکیاں باقی تھیں کہ سیکریٹری نے آکر رشیدہ کا نام لیا۔

رشیدہ لاپرواہی سے انھی اور اس کے ساتھ ہوئی۔ سیکریٹری نے دروازہ کھولا اور رشید جزل نیجر مسٹر جعفری کے کمرے میں داخل ہوئی۔ دوسرا خ اور خوفناک آنکھیں اس کی طرف انھیں اور رشیدہ کا نیپ گئی۔ بھاری جبڑوں اور سیکھے خدوخال کا ایک ڈرائونا آدمی اُسے گھور رہا تھا۔ اس کے شانے کافی چوڑے اور بھرے ہوئے تھے۔ پیشانی اونچی اور بال گھوٹکھریا لے تھے لیکن نہ جانے کیوں ان میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔

”آہم....!“ اس نے غرماں سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ بیٹھ گئی۔ لیکن نہ جانے کیوں اس کا حق خشک ہونے لگا تھا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جسم رشیدہ کا نپ رہا ہو۔

”آہم....نام....!“ وہ غرایا۔

”رشیدہ....!“ وہ سر جھکائے ہونے بولی۔

”تعلیم....!“

”بیکل آف آرنس۔“

”اُنہوں، گریجویٹ کہو... لڑکی بھی بیکل... ایسرو۔“

”گریجویٹ....!“ رشیدہ گھبرا کر بولی۔

”لپ اسٹک کبھی نہیں استعمال کرتیں یا آج ہی نہیں کی۔“

”کبھی نہیں۔“

”گلڈ....!“

پھر اس نے اپنی سیکریٹری کی طرف مڑ کر پوچھا۔ ”کوئی اور بھی ایسی ہے جس نے لپ اسٹک گار کی ہو۔“

”جی نہیں۔“ سیکریٹری کی کلکپانی ہوئی ہی آواز سنائی دی۔

”سب کو رخصت کر دو۔“ وہ غرایا۔ ”اور اگر تم نے بھی اس کا استعمال ترک نہ کیا تو تمہیں مار رخصت کر دیا جائے گا۔.... سمجھیں۔“

”جی ہاں۔“ وہ مری ہوئی آواز میں بولی اور باہر چل گئی۔

”ڈکشن....!“ اس نے رشیدہ کی طرف کاغذ اور پشنل سر کاتے ہوئے کہا۔

رشیدہ کا ہاتھ کا نپ رہا تھا لیکن وہ پشنل پکڑ کر بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ بول رہا تھا اور رشیدہ کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی سر اکار اس کی طرف دیکھنے کی بہت نہیں کی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک بار بھی اس سے نظریں چار

لگائی تو وہ جسمانی اور ذہنی دونوں حیثیتوں سے بیکار ہو جائے گی۔

”لب....!“ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”جاوے سے ٹاپ کرو۔“

”ہذا“ اس نے گھٹی کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک کر کہا۔ ”ایک بات اور... تم اپنے کام سے کام رکھو گی۔ وہ بات جس سے تمہیں کوئی سر دکارنا ہو اپنی دلچسپیوں کی لست پر نہیں آؤ گی۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھتی۔“

”آہم.... کچھ نہیں.... بس۔“ اس نے گھٹی بجائی اور سیکر شری پھر اندر آگئی۔

”انہیں کام تباو۔“ اس نے ایک کاغذ پر نظریں جائے ہوئے کہا۔

سیکر شری رشیدہ کو لے کر بڑے کرے میں چلی آئی۔ اس کی آنکھیں سو بھی ہوئی تھیں اور اک کے نتھیں سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے ایک فائل نکال کر رشیدہ کے سامنے ڈال دیا۔

”ہماری خوار ناپ کرتی جاؤ۔ ایک ایک نقل بھی ہو گی۔“ اس نے بھراہی ہوئی آزاد میں کہا۔ رشیدہ صرف اس کی طرف دیکھ کر رہا گئی۔ ویسے وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ انہیں سے کاغذات نکال کر ناپ کرنے پڑھ گئی۔

توہڑی دیر بعد جعفری اپنے کرے سے نکل کر ان کی طرف دھیاں دیئے بغیر باہر چلا گیا۔ لے کے جو توں کی چڑچڑاہٹ کافی دیر تک سنائی دیتی رہی۔

رشیدہ ناپ کر رہی تھی لیکن اس کا ذہن اسی عجیب و غریب آدمی میں الجھا ہوا تھا اور اس کی سیکر شری راحیلہ تو اس سے بھی عجیب تر معلوم ہو رہی تھی۔ یہ ایک دلی پتلی ہی کافی خوبصورت نلی تھی۔ آنکھیں بڑی اور پلکیں گھیری تھیں اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ہر وقت کسی انجانے نے سے بو جمل رہتی ہوں۔ رشیدہ نے اسے آفس میں روٹے دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ اگر پس مالک کا روایہ اپنے لئے تو یہ آمیز سمجھتی ہے تو یہاں کیوں پڑی ہوئی ہے جعفری جیسا وحشی گل آج تک اس کی نظروں سے نہیں گزر ا تھا۔ اس نے اس غریب لڑکی سے کتنی بے دردی سے اپنی کی تھیں۔ شاید وہ عورت کا احترام کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔

رشیدہ سوچتی رہی اور اس کی انگلیاں تیزی سے Key Board پر چلتی رہیں۔ اس نے یہ کہنے محسوس کیا کہ راحیلہ اس کے قریب ہی آکر پڑھ گئی ہے۔

”میا تمہیں کہیں اور ملازمت نہ ملتی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا اور رشیدہ چوک پڑی۔

”ملازمت کہاں ملتی ہے آج کل۔“ رشیدہ منہ بنا کر بولی۔

رشیدہ کرے سے چلی آئی۔ بڑے کرنے میں سیکر شری کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ ”اپنے میز پر سر اونڈھائے بیٹھی تھی اور اس کے جسم کی متواتر جنبشوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سک سک کر رہی ہے۔ رشیدہ چپ چاپ بیٹھ کر ناپ کرنے لگی۔ دل ہی دل میں سوچ جو تھی کہ فریدی نے کہاں پھنسا دیا۔

توہڑی دیر بعد گھٹی بھی اور سیکر شری اچھل کر سیدھی ہو گئی۔ اس نے جلدی بلدی ای آنکھیں خٹک کیں لباس درست کیا اور اندر چل گئی۔ رشیدہ نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے ہوئے صاف کر ڈالے ہیں۔

رشیدہ ناپ کرچکنے کے بعد انتظار کرتی رہی۔ سیکر شری اندر تھی۔ اس نے گھڑی کی طرز دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اتنی دیر تک ٹول ٹول کر ناپ کرتی رہی۔ لیکن اس کی بھی بہت نہیں تھی کہ جعفری کے کرے کا دروازہ کھلکھلاتی۔

جیسے ہی سیکر شری کرے سے نکلی وہ کھڑی ہو گئی۔ ”ہو گیا۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔ سیکر شری نے سر کو خفیف سی جنبش سے دروازے طرف اشارہ کیا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔

رشیدہ اندر چل گئی۔ ”آہم.... سٹ ڈاؤن۔“ جعفری غریا۔

رشیدہ نے بیٹھتے ہوئے شیٹ اس کی طرف بڑھا دی۔

”ٹھیک! پہلے کہاں کام کیا ہے۔“

”نیواسار کے دفتر میں۔“

”وہاں سے کیوں چھوڑا۔“

”زاں دساف میں تھی۔“

”آہم! کتنی تنخواہ تھی۔“

”ڈھائی سو۔“

”لیکن یہاں صرف دو سو میں گے۔“

”مجھے منتظر ہے۔“ رشیدہ آہستہ سے بولی۔

”دوہی تین ہفتوں میں تمہارے گاؤں کی بہیاں اُبھر آئیں گی۔“

”کیوں....!“

”اوہ! کیا تم نے کچھ نہیں محسوس کیا۔“ وہ بہیانی انداز میں بولی۔ ”میادہ آدمی ہے درجنو وحشی....!“

”لیکن.... یہی میں بھی سوچ رہی تھی کہ آخر تم...!“

”میں....!“ وہ رشیدہ کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں مجبور ہوں۔ میری ایک اندھی بیوہ ہے چھ بھائی بہن ہیں۔ وہ سب چھوٹے ہیں۔ اگر میں یہاں ملازمت ترک کر دوں تو ان کا کیا مجھے یہاں تین سورو پے ملتے ہیں۔ زہر کی تین سو بوندیں، تین سو فخر، جو جا ہو سمجھ لو۔“

”یہ بہیش ایسا ہی رہتا ہے۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”بہیش.... تم ہر وقت یہی محسوس کرو گی کہ تم پر ایک سانپ پھن اٹھائے مسلط ہے۔ نہیں کب ڈس لے۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”ڈیڑھ سال سے.... اور یہ ڈیڑھ سال ایسے معلوم ہوئے ہیں جیسے ڈیڑھ ہزار بر س گز ہوں۔“

”اس فرم کی خاص تجارت کیا ہے۔“

”لو ہے کامسالان، سمندر پار کی ادویات، چجزہ اور بھی کچھ ایسی چیزیں جن کیلئے خاص اشافت۔“

”جزل شجر کا قیام کہاں ہے۔“

”خدا ہی جانے۔“

”کیوں؟“ رشیدہ کے لمحے میں حیرت تھی۔

”وہ ایک قطعی غیر سو شل آدمی ہے۔ کم از کم میں تو قطعی نہیں جانتی کہ وہ کہاں رہتا۔ اس کی کیا مشغولیات ہیں۔“

”بیوی پچے ہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”بیوی پچے۔“ راحیلہ زہر خند کے ساتھ بولی۔ ”جازوں کے بیوی پچے نہیں ہوا کر دور کہیں جو توں کی چڑپتہ سانی دی اور راحیلہ اچھل کر اپنی میز پر جا بیٹھی۔“

Key Board پر دوڑنے لگیں راحیلہ گھبر اہست میں ایک فائل الٹ رہی تھی۔ جو توں کی ایک قریب ہوتی جا رہی تھی اور پھر کرہ گو بخجے لگا۔ جعفری دوڑوں کی میزوں کے درمیان چڑپتہ سانی دی اس طرح کام میں مشغول نظر آ رہی تھیں جیسے انہیں اس کے آنے کی ربرک ہے۔ دونوں اس طرح کام میں مشغول نظر آ رہی تھیں جیسے انہیں اس کے آنے کی اعتمان ہو۔ البتہ راحیلہ کا ناپ رہی تھی۔

”آہم....!“ جعفری غرایا۔ ”غیبی لڑ رہی تھیں.... لڑکی۔“ اس نے رشیدہ کو مخاطب کیا۔

”لیکن.... آفس نائم میں.... صرف کام ہونا چاہئے۔“

”میں ہو.... لیکن.... آفس نائم میں.... صرف کام ہونا چاہئے۔“

وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رشیدہ بدحواسی سے تاپ کرتی رہی۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس نے سر نہیں اٹھایا۔ اس کی آوازاب تک اس کے سر میں دھمک پیدا کر رہی تھی اور راحیلہ بالکل پہلی پڑ گئی تھی۔

چار بجے پوری عمارت گھنٹیوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ رشیدہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ راحیلہ لمی اٹھا اٹھا کر الماری بند کر رہی تھی۔ شاید یہ کام ختم ہونے کی گھنٹی تھی۔ رشیدہ بدستور تاپ لر رہی۔

”مشین بند کرو۔“ راحیلہ نے اس کے قریب آ کر کہا۔

”یہ شیٹ تو نکال لوں۔“ رشیدہ بولی۔

”نہیں گھنٹی بخنے کے بعد کوئی کام نہیں کر سکتا۔“

”خیر اگر تم کچھ اور بھی سننا چاہتی ہو تو مجھے اعتراض نہیں۔“ راحیلہ نے منہ بنا کر کہا اور اپنا بنیگ اٹھانے لگی۔

”ٹھہرو۔“ رشیدہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے جلدی جلدی شیٹ تاپ رائٹر سے نکلا اور اس سے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھ دیئے۔

پھر وہ دونوں آفس سے نکل آئیں۔

”تو ہم گھرے دوست ہیں۔“ رشیدہ مسکرا کر بولی۔ ”آؤ چائے بیٹیں۔“

”چائے۔“ راحیلہ کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔ ”مجھے فوراً ہی گھر پہنچنا ہوتا ہے.... ماں تو گی کاہے نا۔ دوسری بہنیں بھی چھوٹی ہیں۔ اگر میں تھوڑا بہت وقت تفریقات کے لئے وقف کر دیں تو.... مجھے دراصل یہاں سے جا کر کھانا تیار کرنا ہو گا۔“

ڈر کو گریان سے پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ اس نے ان دونوں کی طرف دھیان تک نہ دیا تھا۔
ڈر ایور کو دو تین ہاتھ جھائٹنے کے بعد وہ نہایت سکون سے اپنی کار میں جا کر بیٹھ گیا اور کار
چل پڑی۔

ڈر ایور کئی منٹ تک گالیاں بکار رہا۔ تیکسی کے گرد اچھی خاصی بھیڑ اکٹھا ہو گئی تھی۔
”کیوں صاحب میری غلطی تھی۔“ وہ تیکسی میں بیٹھتا ہوا ان دونوں کی طرف مڑ کر بولا۔
”نہیں...!“ رشیدہ نے آہستہ سے کہا۔

”خیر سالے کو پھر بھی دیکھ لوں گا۔ اُسے بھی بیٹھنے رہنا ہے اور مجھے بھی۔“
تیکسی روانہ ہو گئی مگر ڈر ایور بدستور بڑی راستے جا رہا تھا وہ کچھ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے
شہر میں جتنے بھی قتل ہوتے ہیں اسی کے دم سے اور جتنی بھی بد معاشیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب
کاروں روں وہی ہے۔ دنیا میں اب تک جتنے بھی سرکش گذرے ہیں انہیں اسی نے نیچا دکھایا تھا۔
رشیدہ اور راحیلہ اپنے ششک ہونٹوں پر زبانیں پھیر رہی تھیں۔

حمسید کی شرارت

تقریباً آٹھ بجے رشیدہ راحیلہ کے گھر سے واپس آئی۔ راحیلہ کے متعلق اس نے اندازہ لگایا تھا
کہ وہ ایک سعادت مند بیٹی اور محنت کرنے والی بہن ہے۔ اگر کوئی اور موقع ہوتا تو وہ اس کی گھریلو
زندگی کے متعلق سوچ سوچ کر کافی دیر تک لطف اندازو ہوتی مگر اس کا ذہن تو اپنی فرم کے جzel
نبھر جعفری میں الٹھ کر رہا گیا تھا۔ اگر ان پکڑ فریدی نے اسے نہ بھیجا ہوتا تب بھی اور کسی موقع پر
اس کی خفیت رشیدہ کے ذہن پر ایک بہت بڑا سالیہ نشان ضرور پیدا کرتی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ آخر اس نے یہ کیوں کہا تھا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھے گی کیا وہاں کوئی
ایسا کام بھی ہوتا تھا جو کسی دوسرے کی کوئی طبیعت میں بے چینی پیدا کر سکتا ہے۔

وہ فٹ پاٹھ پر پیدل چل رہی تھی۔ دھنٹا اس کے قریب سے گذرتے ہوئے دو آدمیوں نے
اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ وہ دلبی زبان سے اسی عجیب و غریب رائکل کا تذکرہ کر رہے
تھے جس نے پہ اسرا ر طریقے پر وزیر خزانہ کو موت کے گھاث اتار دیا تھا۔ انداز گفتگو ایسا تھا جیسے

”تو پھر مجھے اپنا گھر ہی دکھادو۔“

”اوہ بڑی خوشی سے۔“ راحیلہ کی آنکھیں چکنے لگیں۔ ”ضرور چلو، ماں بہت خوش ہو گئی
کوئی دوست نہیں، مجھے جیسی مردہ دل سے کون دوستی کرے گا۔ آج کل دوستیاں تو عموماً گل
باروں اور ریٹائرمنوں تک محدود ہوتی ہیں۔ اوہ.....ابھی تک بس نہیں آئی۔“

”تیکسی سے چلیں گے۔“ رشیدہ نے لاپرواٹی سے کہا۔

”ہاں...!“ راحیلہ نے اس طرح دہر لایا جسے رشیدہ نے ہوائی چہاز کہا ہو۔

”تم اکیلی ہو۔“ راحیلہ اسے اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔
رشیدہ نے ایک تیکسی رکوائی اور دونوں اس میں بیٹھ گئیں۔ پھر اس نے راحیلہ سے پہاڑ
کر شو فر کو بتایا اور تیکسی چل پڑی۔ راحیلہ اب جتنا تک رشیدہ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”تمہارا کوئی مرد دوست نہیں۔“ رشیدہ نے پوچھا۔

”نہیں کوئی نہیں۔“ راحیلہ مضطربانہ انداز میں بولی۔ ”میں نے آج تک اس کی بہت ہی نہیں کر
”کیوں؟“

”میں اپنی ہی ذات سے بڑی خائن رہتی ہوں کہ میرے ہی جذبات مجھے تنکے کی طرف
جانے کدھر بھالے جائیں گے پھر میری اندر ہی ماں کا کیا بنے گا۔ میرے نئے نئے بھائی بھائیں۔
راحیلہ کی آنکھوں میں آنسو چکل آئے تھے جنہیں وہ دوسری طرف منہ پھیر کر پڑے
کو شش کر رہی تھی۔

رشیدہ کچھ نہ بولی اور اس لڑکی کی بیچارگی پر غور کر رہی تھی۔ دونوں خاموش تھیں۔
وھفتہ راحیلہ چیخ پڑی.... وہ سامنے ہی دیکھ رہی تھی۔

تیکسی کے ڈر ایور کی لاپرواٹی تھی یا سامنے سے آنے والی کار میں بیٹھے ہوئے آدمی کی
کہ دونوں کاریں بس ایک فٹ کے فاصلے پر رک گئیں۔ برکوں کی آواز سنائی دی اور وہ دونوں
سیٹ کی پشت سے ٹکرا گئیں۔

دوسرے لمحے میں انہوں نے غراہٹ قسم کی آواز سنی جو جzel نبھر جعفری کی آواز
علاوہ اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اپنی کار سے اتر کر سیدھا تیکسی کی طرف آیا کھڑکی کو کولا

وہ اس کے متعلق کچھ جانتے ہوں اور ان آدمیوں سے بھی واقف ہوں جنہوں نے اسے استمل کیا تھا۔

رشیدہ چپ چاپ ان کا تعاقب کرنے لگی کیونکہ وہ ان کی حقیقت سے نادافع تھی۔ ان میں ایک سرجنت حمید تھا اور دوسرا ناگر، حمید نے جان بوجھ کر کے حرکت کی تھی۔ وہ ابھی تک فکاری ہی والے بھیں میں تھا اور اس کے چہرے پر کھنی موچھیں تھیں۔ رشیدہ کو دیکھ کر اس کا مرگ شرات پھر ٹک اٹھی تھی اور اس نے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے رانفل کا تزکہ چھیڑا۔ دن بھر کی کوفت کے بعد وہ تھوڑی سی تفریح بھی کرنا چاہتا تھا۔ آج وہ اور ناگر میلی فون اسکی پیغام کے گرد منڈلاتے رہے تھے۔ میلی فون اسکی پیغام میں اُنی دن ملکہ سراج رسانی کے دو قسم آدمی بخشیت میلی فون آپریٹر زداخی ہوئے تھے۔ انہیں فریدی کی طرف سے پدایت ملی تھی کہ مسٹر کیو کے پیغامات پر نظر رکھیں اور انہیں نوٹ کر کے اس تک پہنچائیں۔ حمید دن بھر کی روپورٹ لے کر جاہی رہا تھا کہ رشیدہ نظر آگئی۔

حمید اور ناگر نے ایک ریستوران کا رخ کیا۔ رشیدہ پہنچے گئی وہ ان کے قریب ہی کی ایک خالی میز پر جا بیٹھی۔ حمید اور ناگر سرگوشیوں میں گفتگو کرتے رہے۔ ظاہر ہو رشیدہ کی طرف سے لاعلم نظر آرہے تھے۔

رشیدہ نے کافی منگوائی لیکن اسے پہنچنے کے کب ختم ہو گئی۔ وہ دراصل ان کی گفتگو شنس کی کوشش کر رہی تھی۔

اپنی چائے ختم کرنے کے بعد حمید اور ناگر اٹھ گئے۔ رشیدہ کا شہر یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے جلدی سے بل ادا کیا اور باہر نکل آئی۔ دونوں فٹ پاتھو پر آہستہ چل رہے تھے۔ سڑک سے گزر کر وہ ایک گلی میں مڑ گئے۔ رشیدہ کافی فاصلے پر ان کا تعاقب کر رہی تھی۔ نہ جائے کتنی بیچ دریچ گلیوں سے اسے گزرنا پڑا۔ وہ دونوں کہیں رکنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

وہ پھر ایک تاریک گلی میں مڑے اور رشیدہ جیسے ہی اس گلی میں داخل ہوئی اس نے محروس کیا کہ دونوں کے قدموں کی آوازیں آئی بند ہو گئی ہیں۔ وہ آکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں میں گھوڑ رہی تھی۔ دفتار کوئی ٹھنڈی سی چیزیں کی کپٹی سے آگئی۔

”خبردار۔“ ایک سرگوشی سنائی دی۔ ”آواز نکلی اور کھوپڑی صاف۔ بغیر آواز کا ریو اور

”آگے چلو.... چلو....!“

اب ریوالور کی نال اس کی پیٹھ پر تھی اور وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آہستہ قدم اخبار ہی تھی۔

”واہنے مڑو.... چلتی رہو.... ٹھیک.... اب رک جاؤ۔“

نالے میں کنجی گھمانے کی آواز سنائی دی اور کوئی دروازہ چڑھا ہٹ کے ساتھ کھلا۔ گلی میں عجیب طرح کی سیلی سی بدبو گونج رہی تھی۔

”چلو اندر چلو.... شابش۔“ سرگوشی پھر سنائی دی۔ حمید حتی الامکان اپنی آواز بدلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ رشیدہ پر لے سرے کی چالاک اور ذہین ہے اگر پہچان گئی تو ساری تفریح کر کری ہو جائے گی۔ ان کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ پھر سوچ ادن کرنے کی آواز آئی اور رہداری روشن ہو گئی۔ رشیدہ نے خود کو انہیں دونوں کے درمیان میں پایا۔ کھنی موچھ دالے شہزادی کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

”آگے بڑھئے.... محترمہ۔“ سرجنت حمید نے نہایت ادب سے کہا۔ ”اس کا مطلب....!“ رشیدہ بگڑ کر بولی۔

”اندر لخت موجود ہے۔ مجھے مطلب زبانی نہیں یاد رہا کرتے۔“

”مجھے جانے دو.... ورنہ شور چھاؤں گی۔“

”اوپنی سے اوپنی عورت سے بھی میں یہی موقع رکھتا ہوں۔“ حمید لاپرواں سے بولا۔ ”چلتے۔“ رشیدہ بے بی سے چلتے گئی۔ وہ ایک کمرے میں آئے جہاں کنجی پرانی اور زنگ خورده کر سیاں پڑی ہوئی تھیں۔

”تشریف رکھئے۔“ حمید نے ایک کری کی طرف اشارہ کیا۔ رشیدہ بیٹھ گئی۔

”مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں۔“ حمید نے ذہن پر زور دینے کی ایکنک کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا ہیودگی ہے۔“ رشیدہ بگڑ کر کھڑی ہو گئی۔

”جاوہ ایک چھڑاٹلاش کرو۔“ حمید نے ناگر کو متعاطب کر کے کہا۔ ناگر مکراتا ہو چلا گیا۔ ”بیٹھے بیٹھے۔“ حمید رشیدہ کی طرف دیکھ کر خشک لہجہ میں بولا۔ ”مجھے جو لڑکی پسند آتی ہے

چیزیں کر دیکھ لو کوئی جو مدد کو آئے۔ چلو تمہیں ان لڑکوں کی بیٹیاں اور کھوپڑیاں دکھاؤں
بی پہلے کھاچکا ہوں۔ ارے اب تو رال بھی نہیں گئی۔ کہاں مر گیا۔ بھائی، اے کیا ابھی تک
ای بیٹیں تیز ہوں۔

”دکا کے لئے مجھے جانے دو۔“

”بیاتم نہیں چاہتیں کہ میں تمہیں کھا جاؤں۔“

”نہیں....!“ رشیدہ بو کھلا کر بولی۔

”اگر میں تمہیں چھوڑ دوں تو مجھے یاد رکھو گی۔“

”ہاں....!“ رشیدہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے اور کیا سن رہی ہے۔

”تمہارا نام کیا ہے۔“

”رشیدہ....!“

”تب تو میں تمہیں ہر گز نہ چھوڑوں گا۔“

”کیوں....؟“

”رشیدہ جو نام ہے تمہارا۔ ہر دنام مجھے بہت پیدا لگتا ہے جس میں شین ہو رشیدہ.... ہائے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر ہاں لگائی۔ ”ابے تیز ہو گیا چھرا۔“

”تیز کر رہا ہوں۔“ کسی دوسرے کمرے سے آواز آئی۔

”جلدی کرو۔“

”نہیں.... نہیں....!“ رشیدہ گھس گئی۔

”ارے.... واد.... یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ سب سے پہلے تمہارے ہونٹ کاٹوں گا پھر

لوں کا گوشت اتاروں گا.... ہائے ہائے۔“

وہ کسی ندیدے آدمی کی طرح منہ چلانے لگا۔

”بچاؤ... بچاؤ۔“ رشیدہ زور سے چیخی۔

رشیدہ ہنسنے لگا۔ دور کہیں بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی

بلدی جلدی ازینے طے کر رہا ہو۔

”چپ رہو.... چپ رہو۔“ حیدر دھیرے سے بولا۔ ”میرا باپ آرہا ہے۔“

اے میں اپنی پہلی فرصت میں ذبح کر ڈالتا ہوں۔“

رشیدہ اپنے خشک ہوتلوں پر زبان پھیرنے لگی۔

”اس لئے ذبح کر ڈالتا ہوں کہ وہ کسی اور کوئہ پسند آجائے۔“ حیدر نے پھر کہا۔

”بکو نہیں! مجھے جانے دو۔“ رشیدہ جی کڑا کر کے بولی۔

”فوس!“ حیدر معموم آواز میں بولا۔ ”میں سمجھا تھا کہ تم پہلی ہی نظر میں مجھ پر عائز ہو گئی ہو گی۔“

رشیدہ کی آنکھیں حرمت سے بچیں گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ کسی پاگل کے ہمراں نہیں چڑھے گئی۔ اتنے میں ناگر ایک بڑا سا چھرا لے کر آگیا۔ حیدر نے ہاتھ میں لے کر اس کی دعا دیکھی پھر بگز کر بولا۔

”اس سے تو موم کی عورت بھی نہ ذبح ہو گی۔ جا کر تیز کرو۔“

ناگر چھرا لے کر پھر چلا گیا۔

”جب سے تمہیں دیکھا ہے۔“ حیدر میں پر ہاتھ رکھ کر ٹھیٹھی عشقیہ انداز میں بولا۔ ”ول کبھی اور.... تمہارا خون کتنا لذیذ ہو گا۔ اور تمہاری بیٹیاں.... ہائے.... ہائے.... بڑے.... بڑے ریشے کا گوشت.... ہو لے ہو لے احتیاط سے چباوں گا۔ بیٹیاں دانتوں کے نیچے چھسلیں گی.... ہائے.... ہائے۔“

وہ اچھل اچھل کر زور زور سے سینہ پیٹنے لگا۔

رشیدہ کا پینے گی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انہیں الہانے لگا۔

”ستی ہو۔“ حیدر نے پھر ہاں لگائی۔ ”تمہاری انگلیوں کی بیٹیاں.... رسیلی بیٹیاں.... گر گر چباوں گا۔“

رشیدہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے پاگل ہے تو اس کا ساتھی تو پاگل نہیں ہو سکتا۔ کس دبال میں پھنس گئی۔

”ڈرو نہیں بھئی۔“ حیدر بچوں کی طرح نہنک کر بولا۔ ”ڈر کر تم سارا مزہ کر کر اکر دو گی۔“

”مجھے جانے دو۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخی۔

”اس مکان کی دیواریں خاص طور سے بنائی گئی ہیں۔“ وہ نہ سکون لجھ میں بولا۔ ”تم اچھے

"بچاؤ...!" رشیدہ پھر چھپی۔

"عجیب احمد لڑکی ہو۔ خدا غارت کرے تھیں۔ سار امزہ کر کر کر دیا۔"

قد مولی کی آوازیں نزدیک ہوتی جا رہی تھیں۔ پھر ایک دروازہ کھلا اور رشیدہ کو ان پر فرو دکھائی دیا۔ وہ چھپ کر اس کی طرف چھپی اور قریب قریب اس پر گردی۔

"بچائیے! بچائیے مجھے اس پاگل سے۔"

"پاگل....!" فریدی کے لنجے میں حیرت تھی۔

"بی ہاں.... پپ پاگل.... مجھے ذنکر نہ کرنا چاہتا تھا۔.... چھرا.... چھرا.... تیز ہو رہا ہے۔"

"سمجھا! نہہر و کہاں چلے۔" فریدی نے حمید کو لکارا۔

حمید رک گیا۔

"یہ کیا حرکت تھی۔" فریدی اُسے گھورتا ہوا بولا۔ رشیدہ سید ہی کھڑی ہو گئی تھی جو سے کبھی حمید کی طرف دیکھتی تھی اور کبھی فریدی کی طرف۔

"حمدی! میں تم سے کچھ سمجھ آگیا ہوں۔"

"حمدی....!" رشیدہ نے آہستہ سے دہرا دیا اور اس نے ہونٹ سمجھ لئے۔ وہ آہستہ آہستہ کی طرف بڑھی اور پھر اچھل کر اس کے بال مٹھی میں جکڑ لئے دوسرا لمحے میں وہ اسے صوف پر گرائے اس پر چڑھی پیٹھی گھونسوں اور تھپڑوں کی بارش کر رہی تھی۔ فریدی بے توہن رہا تھا اور حمید ہنس توہن بھی رہا تھا لیکن رشیدہ کی چلتکیوں اور بکوٹوں کی وجہ سے اس کی بُکی کرایں اور چینیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔ بدقت تمام فریدی نے انہیں الگ کیا۔ اس دوران بھی آگیا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک چھرا دبا ہوا تھا۔

"ابھی تک میرا دل نہیں بھرل۔" رشیدہ ہماپتی ہوئی بولی۔

"اور ابھی میری تھکن بھی دور نہیں ہوئی۔ انور واقعی براخوش قسمت ہے۔"

"بے حیا۔" رشیدہ نے بھنا کر کہا۔

"کسی عورت کے ہاتھ سے پٹنے میں بڑی لذت پائی جاتی ہے۔"

"اچھا تو نہہر و۔" رشیدہ پھر بڑھی لیکن فریدی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر حمید سے کہا۔ "اب پیٹوں گا تھیں۔"

"خدا کی قسم بڑی کوفت ہو گی مجھے۔" حمید ڈھنائی سے بولا اور ہستا ہوا کرے سے چلا گیا۔

"تم کیسے پھنس گئیں اس کے چکر میں۔" فریدی نے پوچھا۔

رشیدہ نے سارے واقعات دہرا دیئے۔

"عاجز ہوں اس سورے۔" فریدی نے کہا۔

"خیر میں بھی کسی موقعے سے وہ مزہ چکھاؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔"

"بھی ابھی نہیں.... بہت کام کرتا ہے۔"

"میں نے یہیں اینڈ جعفری میں طالعت کر لی ہے۔"

"بہت خوب۔ جعفری کا اعتداد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور ادھر ادھر بھی نظر رکھنا۔"

"میں اس کا تعلق اسی را نکل...!"

"ہاں.... ہاں.... لیکن کسی کام میں جلدی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ براخوناک اور پر لے سرے کا وحشی ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" فریدی پر خیال انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "تمہیں میری طرف سے برابر

ہدایات لمنگریں گی۔ جب ضرورت سمجھوں گا تو انور کو بھی شریک کرلوں گا ویسے اس کا خیال کیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں! وہ کہتا ہے کہ ابھی تک میں کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔"

"معاملہ ہی ایسا ہے۔" فریدی نے سگار سلاکتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنا صحیح نام ہی بتایا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے! میں سوچ رہا تھا کہ کہیں تم غلط نام نہ بتاؤ۔ اس طرح اسے شبہ ہو جاتا۔"

"تو کیا اس طرح شبہ نہ ہو گا۔" رشیدہ نے کہا۔ "شہر کے سارے جرام پیشہ قریب قریب

میرے اور انور کے نام سے تواقف ہی ہیں۔"

"نگرمت کرو۔ تم وہاں اکلی نہیں ہو۔" فریدی بولا۔ پھر اس نے حمید کو آواز دی۔

حمدید و انتوں میں پاپ دبائے ہوئے اس شان سے داخل ہوا جیسے کچھ دری قبل اس نے کوئی

بہت بڑا مرکہ سر ناجام دیا ہو۔ رشیدہ کو بھی بھی آئی گئی۔

"رشیدہ کو گلی کے موڑ تک پہنچا آؤ۔" فریدی نے کہا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" رشیدہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

"ایسا بھی کیا۔" حمید اس کے پیچے چل پڑا۔ ناگر بھی اس کے ساتھ تھا۔ رشیدہ کو پہنچا کر دونوں لوٹے۔

فریدی کرے میں ان کا انتقال کر رہا تھا۔ حمید کو دیکھتے ہی برس پڑا۔ "نه موقع دیکھتے ہونہ محل! آخر سے یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی۔ گدھے کہیں کہا شرم نہیں آئی پڑتے ہوئے۔"

"آپ کو آگئی..... یہی کافی ہے۔ میں اور آپ الگ ٹھوڑا ہی ہیں۔" حمید جیب سے دین بھر کی روپرٹ نکالتا ہوا بولا۔ "مسٹر کیو کے نام کی پیغامات تھے۔ نمبر انہیں ملا۔ نمبر ۲..... نہیں ملا۔..... بہر حال دن میں تقریباً جیساں آدمیوں نے "نہیں ملا" کی ہاٹ لگائی۔ سہوں نے پیک ٹیک فون بو تھے استعمال کئے تھے۔ پیغام نمبر ۵۳..... سب ٹھیک ہے..... نمبر ۵۲..... دیکھ لیا جائے گا۔ نمبر ۵۵ انتظار ہو گیا۔..... نمبر ۶..... آج رات کو... نمبر ۷۵..... بلکہ خالی ہے! کوئی یا نجی بھی تک نہیں رکھا گیا۔"

"آخری پیغام...!" فریدی نہ خیال انداز میں بولا۔ " غالباً ڈاکٹر نارنگ کے متعلق ہے۔" "اوہ ٹھیک یاد آیا۔ یہ تو بھول ہی گیا تھا۔" حمید نے کہا۔ "آج تین بجے شام کو کسی نے ڈاکٹر نارنگ پر بھی حملہ کیا تھا۔ حملہ آور پکڑا نہیں گیا۔"

"یہاں.... کس طرح۔" فریدی چوک کر بولا۔

"تھی بازار میں.... میں روڑ پڑے۔ وہ کار میں جا رہا تھا کہ کسی نے گولی چلائی تھیں۔ لیکن وہ تھی گیل۔ شیشے کے کچھ نکلنے اس کے جسم پر لگے ہیں۔"

"اوہ....!" فریدی کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

"رمیش! جیون اور اندر!" حمید بولا۔ "جیس ایڈ جعفری کے دفتر کی گمراہی کر رہے ہیں۔ آخو انہیں وہاں کیوں لگایا گیا ہے۔ کیا وہی مسٹر کیو ہو سکتا ہے۔ جعفری ہے تو خوفناک۔ رشیدہ وہاں کا کرے گی۔"

"دیکھتے جاؤ۔" فریدی نے کہا اور پھر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

ڈکٹا فون

مسٹر کیو کا مسئلہ ابھی تک فریدی اور حمید ہی تک مدد و تھایا پھر خود اسی کے گروہ والے اسے واقع تھے۔ رشیدہ تک کو فریدی نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کا حکم تو خیر ہرے میں تھا ہی۔ اس بار بھی اس نے حسب عادت مجھے کو اپنی مشغولیات کی باقاعدہ روپورٹ ہرے تھی۔ ذی۔ آئی۔ جی تک کو اس کا علم نہیں تھا کہ فریدی کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ فریدی نے اپنے ماتحتوں میں سے پانچ چھ خاص قسم کے آدمیوں کو مختلف کاموں پر لگار کھانا تھا لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ انہیں ہدایات کہاں سے مل رہی ہیں۔

بہر حال مسٹر کیو کا نام تاریکی ہی میں رہتا اگر واقعات نے دوسرا رخ اختیار نہ کر لیا ہوتا اور پر اس واقعے کا ذمہ دار بھی فریدی ہی تھا کہ مسٹر کیو کو خود ہی اپنا نام ظاہر کر دینا پڑا۔ فریدی کو سے علم تھا کہ اس نام کو سیکرٹ سروس کے بعض ممبر استعمال کرتے رہے ہیں۔ لہذا حمید اور کے تجربات سامنے رکھ کر اس نے اس کے متعلق تفہیش شروع کر دی۔ ہو سکتا ہے کہ مجرم اسے واقع ہو گیا ہو اور اس نے اب کسی قسم کی پرداہ واری مناسبت نہ بھیجی ہو۔

ناگر کی مصنوعی خود کشی والے دن کے بعد سے ٹیلی فون ایکچھ میں مسٹر کیو کے نام کے مات موصول ہوتے بند ہو گئے تھے۔

جس دن ناگر کی مصنوعی خود کشی منظر عام پر آئی اسی دن ڈاکٹر نارنگ ایم۔ پی پر حملہ کیا گیا نہ دہ بال بال بچ گیا۔ اسی رات کو ایک دوسرا حادثہ ہوا۔ وہ بھی اپنی نویعت کے اعتبار سے معمولی تھا۔ ڈاکٹر نارنگ ہی کے گروپ کے دوپار نیشنری ممبر اپنی قیام گاہوں پر قتل کر دیئے گئے۔ مری صبح کو ان کے سر جسموں سے الگ پائے گئے اور انہائی کوششوں کے باوجود بھی اس قسم مائن شنات نہ مل سکے جن سے قاتلوں پر روشنی پڑتی۔

عوام میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی اور خواص کو توہر لختہ ملک الموت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ملی۔ پہلے وزیر خزانہ انتہائی نہ اسرار طریقے پر قتل ہوئے پھر ڈاکٹر نارنگ پر شہر کی سب سے رائیہ میں سڑک پر اعلانیہ حملہ کیا گیا اور اسی رات کو پارلیمنٹ کے دو اور ممبر قتل کر دیئے گئے لہذا اس کی سر اسی مگری لازمی تھی۔

”اور اب.... ایک ایسی بات ہوئی ہے۔“ ڈاکٹر نے خوف زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے کہا۔ پھر مضطربانہ اٹھا اور دروازے تک گیا۔ ایک لمحہ اور ہر دیکھتا رہا اور لوٹ کر آہستہ لاد۔ آج منجھے ایک دھمکی آمیز خط ملا ہے کسی نامعلوم آدمی کی طرف سے۔“

اس نے اپنے کوٹ کی اندر ونی جیب سے ایک لفافہ نکال کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف بڑھا دیا۔ ذی۔ آئی۔ جی اسے خوف زدہ نکال کر پڑھنے لگا۔ معمولی کا تندر پڑاپ کیا ہوا تھا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایمپی.... خوش قسمت تھے کہ کل نج گئے۔ بہر حال تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ اپنا دیکھ بھلے ایک ماہ کے لئے بالکل خالی کر دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہارا بھی وہی انجام ہو گا جو وزیر خزانہ اور تمہارے دوسرا تھیوں کا ہو چکا ہے۔ اگر تم اسے محض دھمکی سمجھو تو یہ تمہاری بھول ہو گی۔ اس سلسلے میں پولیس سے مدد لینا وقت کی بربادی کے علاوہ اور کچھ نہ ہو گا۔ وزیر خزانہ کی موت ہزاروں کے مجمع میں ہوئی تھی تمہارے دونوں ساتھی ہر بے پرے گھروں میں مار ڈالے گئے لیکن کسی کو کافی کان خرنہ ہوئی۔ کافی عقل مند آدمی ہو۔ اس لئے تو قعہ ہے کہ حکم کے خلاف نہ کرو گے۔ فقط

”مسٹر کیو۔“

”مسٹر کیو!“ ذی۔ آئی۔ جی آہستہ سے بڑھا اور جواب طلب نظر وں سے ڈاکٹر نارنگ کی دیکھنے لگا۔

”اب بتائیے میں کیا کروں۔“

”آپ کی حفاظت کا انعام کیا جائے گا مگر یہ مسٹر کیو۔“

”میں نہیں جانتا یہ کون ہے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن کیا آپ کے ماقولamat مجھے بچا سکیں گے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کے چہرے پر گھرے تکلر کے آثار تھے۔ وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔

”لیاں ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہو۔“

”مذاق! مجھ سے کون.... مذاق کرے گا۔ شاید آپ بھول رہے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ

محکم سراج رسانی کی عمارت میں تو گواز لارڈ آگیا تھا۔ آئی۔ جی سے لے کر معموا لباس والے تک بوکھا ہٹوں کا شکار نظر آرہے تھے۔ سارا عملہ آج پھر بڑے کمرے میں اکابریہ فریدی اور حمید موجود تھے اور وہ پاچ مخصوص سادہ لباس والے بھی نہیں تھے جنہیں نے خود رینگ دی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اور آئی۔ جی میں کسی خاص مسئلے پر بحث ہو رہی تھی کہ ایک کلکر ذی۔ آئی۔ جی کو مطلع کیا کہ اس کی فون کال ہے۔

ڈی۔ آئی۔ جی اٹھ کر چلا گیا تقریباً دین منٹ تک خاموشی رہی پھر ذی۔ آئی۔ جی کو پر ایک انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا۔

”ڈاکٹر نارنگ ایمپی کا فون تھا۔“ اس نے آئی۔ جی سے کہا۔ ”کوئی خاص بات معلوم ہے۔ مجھے بلایا ہے۔ آواز سے خوفزدہ معلوم ہوتے تھے۔“

”میرا خیال تو یہ ہے کہ اب یہ سب اپنی حفاظت کیلئے آدمی بھی مانگیں گے۔“ آئی۔ جی ذی۔ آئی۔ جی چند لمحے بیٹھا کچھ سوچتا رہا پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر نارنگ اپنی شہری قیام؟ کے کمرے میں بے چینی سے ٹھیل رہا تھا جیسے ہی ایک تو ذی۔ آئی۔ جی کا ملا قاتی کارڈ لارک دھ خود ہی صدر دروازے تک بھوکھا گیا۔

”اوہ.... آپ آگے شکریہ۔“ وہ ذی۔ آئی۔ جی سے مصافی کرتے ہوئے مضطربانہ ان بولا۔ ”چلے.... اندر چلے.... اوہ! میں اس تکلیف دہی کے لئے شرمند ہوں۔ میں خود بھا آپ تک پہنچ سکتا تھا گر....؟“

وہ اُسے نشست کے کمرے میں لے آیا۔

”بیٹھے! بیٹھے۔ آپ جانتے ہیں کہ پرسوں مجھ پر حملہ ہو چکا ہے اور رات کو میر ساتھی!...!“ ڈاکٹر نارنگ تھوک نگل کر رہا گیا۔ پھر ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔ وہ بھی میرے گہرے دوستوں میں سے تھے۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکتا۔ میری.... ہم لوگوں کی سے تو پورا ملک داقف ہے....!“

”جی ہاں۔“ ذی۔ آئی۔ جی سر ہلا کر بولا۔ ”یہی تو باعث جیرت ہے سارے کے۔“

”خالص اور بے ضرر محبت وطن تھے۔“

آئی۔ جی پھر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اردو نے چن ہٹا کر آپریشن روم کے انچارج کی آمد کی اطلاع دی۔
”بلالو....!“ آئی۔ جی بولا۔

آنے والے نے ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے ڈی۔ آئی۔ جی سے کہا۔ ”آپ کے نام ٹرانسیمیٹر پر پیغام موصول ہوا ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے کاغذ لے لیا۔ یہ پیغام مخفی اشاراتی الفاظ (Code Words) میں تھا۔ دھنٹاڑی۔ آئی۔ جی کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا ہوئی اور وہ دبے ہوئے جوش کے ساتھ بولا۔

”دیکھا آپ نے! ہمیں مسٹر کیو کے متعلق آج ہی معلوم ہوا ہے لیکن فریدی پلے سے جانتا تھا۔“
”یعنی....؟“

”سنے!“ ڈی۔ آئی۔ جی کاغذ پر نظریں جمائے ہوئے بولا۔ ”جناب والا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ مسٹر کیو نے خود ہی اپنے کو ظاہر کر دیا اور یہ بات بھی آپ سے پوچھیدہ نہ ہو گی کہ یہ نام سیکرٹ سروس کے پانچ ممبر ان استعمال کرتے تھے۔ جب مجھے پہلی بار مجرم مسٹر کیو کے نام سے آگاہی ہوئی تو میں نے سیکرٹ سروس والوں کی تلاش شروع کر دی میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ لگالیا ہے۔ لیکن وہ خود نہیں ملے اور نہ ان کے ٹرانسیمیٹر ہی کا سراغ مل سکا۔ میں فون ایکچھی میں بھی چھوٹے ہوں رات سے اب تک مسٹر کیو کے نام کوئی پیغام نہیں موصول ہوا۔ حالانکہ چھلاڑی کارڈ بتاتا ہے کہ ہر گھنٹے میں آٹھ دس پینیات اس کے نام ضرور ہوتے تھے۔ آپ اس سلسلے میں سیکرٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر سے لگفت و شنید کہنے۔ دیسے میں تو یہی کہنے پر مجبور ہوں کہ وہ پانچوں افراد ہو اٹھکانے لگا دیئے گئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی خاموش ہو کر فخریہ انداز میں آئی۔ جی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”ہوں....!“ آئی۔ جی نے اپنے ہونٹ کھینچ لئے اور اس طرح اپنے جو توں کی طرف دیکھنے لگا۔

”تو کوئی سیکرٹ سروس والوں کی آڑ میں یہ سب کچھ کر رہا ہے۔“ آئی۔ جی تھوڑی دیر بعد بولا۔

بھی ہو چکا ہے۔“

”تو سنئے! میں آپ کو ہمیشہ دوں گا کہ چپ چاپ بگلے خالی کر دیجئے۔ کیا وہاں آپ رہا ملازمن میں ہیں؟“

”جی ہاں!“

”تو انہیں وہاں سے ہٹا دیجئے۔ بقیہ ہم دیکھ لیں گے اور آپ زیادہ تر گھر ہی رہیں تو بہتر ہے ڈی۔ آئی۔ جی تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دیتا رہا پھر وہ خط اس سے لے کر واپس آگئی۔ آئی۔ جی اس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں اپنے مخصوص ریلائنس روم میں چلے آئے۔ ان دونوں کے درمیان مسٹر کیو کی شخصیت زیر بحث تھی۔

”جہاں تک میرے علم میں ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی کہہ رہا تھا۔ ”یہ نام سیکرٹ سروس والے استعمال کرتے ہیں اور اس کا علم میرے محلے میں فریدی کو ہو تو ہو اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ یہ وہی ایک ایسا ہے جو متعلق اور غیر متعلق ہر بات پر نظر رکھتا ہے۔“

”لیکن سیکرٹ سروس والے....!“ آئی۔ جی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
”اسی الجھن میں بڑی دیر سے بتلا ہوں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔

”آخر یہ فریدی رپورٹ کیوں نہیں دے رہا ہے۔“ آئی۔ جی کے لیج میں جلاہٹ تھی۔ ”کبھی نہیں دیتا اور میرے خیال سے اچھا ہی کرتا ہے۔“ آئی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خصوصی معاملہ تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس میں انہماںی رازداری سے کام لیا جائے۔“

”میں اسے درست نہیں سمجھتا۔ رپورٹ تو اسے دیتی ہی چاہئے۔“
”کون سمجھائے اُسے ایزادہ کہنے تو استحقی تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مخفی فطری میلان کی، اس محلے میں آیا ہے۔ درجنہ خاندانی دولت اتنی کثیر رکھتا ہے جو کئی پتوں کے لئے کافی ہو سکتی ہے“

”کچھ بھی ہواتی خود سری نہیں برداشت کی جاسکتی۔“ آئی۔ جی کی آواز غصے میں کاپ رہی ڈی۔ آئی۔ آئی۔ جی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”وہ جب بھی اس طرح غائب ہوا ہے کچھ کر کے ہی واپس آیا ہے۔ گارس سایہ والے کیس کو لیجئے۔“

”آپ خواہ خواہ اُس کی طرف داری کر رہے ہیں۔“ آئی۔ جی گزر کر بولا۔
ڈی۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا لیکن اس کا چہرہ بھی غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

لاشوں کا آبشار

273

نمبر 9

”چوہا دیکھئے اتنے یہ آواز پچھے ایسی ہی ہے جیسی مانگر و فون میں ہاتھ لگنے یا کسی دوسرا چیز رُزوے پیدا ہوتی ہے۔“

آئی۔ جی غور سے سننے لگا پھر سر ہلا کر ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف ممی خیز نظروں سے دیکھتا ہوا ا۔ ہے تو۔“

ڈی۔ آئی۔ جی نے الماری کھول کر دیکھا۔ وہاں کتابوں کے علاوہ اور پچھے نہیں تھا لیکن آواز ٹھوڑے وقتنے کے بعد برابر سنائی دیتی رہی۔ دفتار اس نے الماری کے پیچے جھاک کر دیکھا اس کے منہ سے ایک تحریر آمیز سی آواز نکل گئی۔

”ڈکھاون لے....!“ وہ آئی۔ جی کی طرف مز کربولا۔ ”یہاں ڈکھاون کا کیا کام۔“

دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آئی۔ جی نے آپریشن روم کے درن کو پھر بلوایا۔ لیکن اس نے بتایا کہ مجھے کے سارے ڈکھاون آپریشن روم ہی میں موجود ہیں اس کرے میں تو بھی کوئی ڈکھاون لایا ہی نہیں گیا۔

”تو اس کا یہ مطلب ہے کہ کوئی ہماری گفتگو ستارہ ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا۔

اس اکٹھاف پر مجھے کی عمارت کو ایک دوسرے زلزلے سے دوچار ہونا پڑا۔ سارے کمرے ان بارے گئے اور نتیجے کے طور پر پانچ عدد سو اور بھی برآمد ہوئے۔

لیکن ان کا سلسلہ کہاں سے تھا۔ ٹھوڑی دیر بعد ایک اسکپڑ نے اس کا بھی پتہ لگایا۔ ٹیلی فون، تاروں پر لپٹے ہوئے باریک تار دکھائی دیئے جن کا سلسلہ دوسرے کھبے تک جا کر ختم گیا تھا اور وہیں سے تار نیچے کی طرف لائے گئے تھے۔ دوسرا کھبہ دراصل مہندی کی ایک بے تیب باڑھ کے درمیان میں تھا اور اس کی بے مرمت شاخیں کافی اوپھائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مالکے ان تاروں کا آسانی سے دیکھ لیا جانا تقریباً ممکن ہی ساختا۔

پھر مہندی کی باڑھ سے ملی ہوئی مالتی کی جھاڑیوں میں ڈکھاون کاریسیوگ سیٹ بھی مل گیا۔ ملکی تلاش کے سلسلے میں کافی ہنگامہ برپا ہو گیا تھا اور ڈی۔ آئی۔ جی سوچ رہا تھا کہ ان سے ایک ایسا غلطی سرزد ہو گئی ہے۔

”ہم سے غلطی ہوئی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”اب اس آدمی کا پتہ چلناد شوار ہے جو انہیں تھوال کرتا ہے۔“

اکیل آکر ساعت بجود سروں کی لا علمی میں ان کی پوشیدہ گفتگو نئے کے لئے استعمال کیا ہے۔

”اس کے علاوہ اور کیا سوچا جا سکتا ہے۔“

”پھر کیا کیا جائے۔“

”میرے خیال سے سیکٹ سروس والوں کے ہیڈ کوارٹر سے تحقیق ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ آئی۔ جی نے کہا اور میز پر رکھی ہوئی گھٹنی بجائی۔ جپر اسی اندر داخل ہوئے۔

”آپریشن روم کے انچارج کو سلام دو۔“ آئی۔ جی نے کہا۔

”ٹھوڑی دیر بعد انچارج آگیا۔

”یہ پیغام....!“ آئی۔ جی کا نغمہ اس کی طرف بڑھاتا ہوا ”سیکٹ سروس کے ہیڈ کوارٹر کے لئے.... جواب فوراً آچا ہے۔“

آپریشن روم کے انچارج کے جانے کے فوراً بعد کئی منٹ تک خاموشی رہی پھر ڈی۔ آئی جی بولاد۔

”میرا خیال ہے کہ فریدی کسی سیدھے ہی راستے پر لگ گیا ہے۔“

”لیکن مجھے اس کا یہ روایہ قطعی پسند نہیں۔“ آئی۔ جی نے تین لمحے میں کہا۔ ”ضروری نہیں کہ وہ ہر معاملے میں داشمند ہی ثابت ہو۔ اسے دوسروں سے بھی مشورہ کرنا چاہئے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی شاید بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے چند لمحے خاموش رہ کر بولاد۔

”بات تو ٹھیک ہی ہے! اگر ہماری لا علی میں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو ہمیں اطلاع نہ کرے ہو گی۔ خیر اگر مل گیا تو میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔“

”سمجاو نہیں بلکہ مجبور کرو۔“

”خوب ہر ہے۔“

وہ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ دونوں کے چہرے گھرے تفکر کا پتہ دے رہے تھے۔ وہ

ڈی۔ آئی۔ جی چوک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

”یہ آواز کیسی تھی۔“ وہ آہستہ آہستہ بڑھوایا۔

”آواز کہاں....!“

”پچھے کھر رکھر ری تھی۔“

آئی۔ جی ہنسنے لگا۔ پھر سمجھہ ہو کر بولاد۔ ”اتھی ہم لوگوں کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں رہی۔

غالباً اس الماری میں کوئی چوہا ہے۔“

”غلطی تو چیج ہوئی۔“ آئی۔ جی مصلح آواز میں بولا۔
”اگر فریدی ہوتا...!“

آئی۔ جی کے طبق سے نکلنے والی عصیلی آواز نے ذی۔ آئی۔ جی کو جلد مکمل نہ کرنے پڑا
”کیا ہوتا۔“ آئی۔ جی جھنجلا کر کہہ رہا تھا۔ ”تم لوگوں نے اسے فوق البشر کا درجہ دے رہا
ہے اور اسی لئے اس کا دماغ عرش پر رہتا ہے۔“

ذی۔ آئی۔ جی خون کے گھونٹ پی کر رہا گیا۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اب بچھے بولے گا ہی نہیں
پچھدیں بعد وہ پھر اسی کمرے میں آپسی چھٹے جہاں ڈکٹافون کا پہلا سیٹ ملا تھا۔ وہ دونوں خامروں
ہی تھے اور ان کے چہروں پر ناگواری کے اثرات پائے جا رہے تھے۔

آپریشن روم کے اپارچ کے قدموں کی آہٹ نے خاموشی کا طسم توڑ دیا۔ وہ آئی۔ سی۔
سامنے ایک کاغذر کھکڑا اپس چلا گیا۔

یہ سکرت سروس کے ہیڈ کوارٹر والوں کی رپورٹ تھی جوڑا نسیم پر موصول ہوئی تھی
آئی۔ جی پڑھنے لگا۔

”پانچوں آدمی کام کر رہے ہیں۔ تین دن قبل ان کی تجویزیں ادا کی گئی ہیں۔ ان کی جاد
رہائش کے متعلق کسی کو کوئی علم نہیں۔ جب ضرورت محسوس ہوگی ان سے معلوم کر لی جاد
گی۔ لیکن اس کے لئے بھی اوپر سے آئے ہوئے احکامات ہی کا در آمد ثابت ہو سکیں گے۔“
آئی۔ جی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر سر ہلا کر بولا۔

”عجیب بات ہے۔“

”ہے تو عجیب ہی۔“ ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ اب وہ
موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتا لیکن وہ حقیقت فریدی کے اس خیال سے متفق تھا کہ سکرت سروس وال
بھی مارڈا لے گئے اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بیگنے کی خفیہ گرفتاری شروع کرلو۔

سعی لا حاصل

ایک دن رشیدہ بہت سویرے آفس پہنچ گئی۔ لیکن یہ محسن اتفاق نہیں تھا بلکہ اس نے دب

ڈایا کیا تھا۔ تین چار دنوں کے دوران اس نے جیس ایڈ جعفری فرم کے متعلق بہت کچھ
ہم کر لیا تھا اور جعفری کے سلسلے میں یہ بات خاص طور سے نوٹ کی تھی کہ وہ اکثر اپنے کمرے
بیٹھنے ہی بیٹھنے حرمت اگنیز طور پر غائب ہو جاتا کرتا تھا۔ جعفری کے کمرے کا دروازہ اسی بڑے
میں کھلتا تھا جس میں رشیدہ اور راحلہ بیٹھا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ دوسری طرف صرف
کیاں تھیں اور ان میں بھی لوہے کی سلاخیں گی ہوئی تھیں۔ درستہ یہ خیال ہوتا کہ وہ باہر
نے کے لئے ان کھڑکیوں ہی کو استعمال کرتا ہو گا۔ لہذا رشیدہ کا خیال تھا کہ اس کے کمرے میں
دروازہ ہے اور وہ اسے ڈھونڈنے کا لانا چاہتی تھی۔ اسے اطمینان تھا کہ جعفری دس بجے سے
آفس میں نہیں آئے گا ورنہ شاید وہ اس کی بہت بھی نہ کرتی۔ کیونکہ محسن اس کی آنکھوں ہی
آن کی روح فنا ہونے لگتی تھی۔ آٹھنگ رہے تھے سازھے نوبجے قبل قل راحلہ کے آنے
بھی امکانات نہیں تھے۔

صفائی کرنے والا کمرے کی صفائی کر کے جا پکتا تھا اور چپر اسی بڑے کمرے کے باہر اسٹول پر
ماڑے مڑے سے سکریٹ پی رہا تھا۔ رشیدہ کو خلاف معمول اتنے سویرے دیکھ کر اسے حرمت
لئی لیکن رشیدہ نے پچھلے دن کے بقیہ کام کو پیشانے کا بہانہ کر کے اس کی حرمت زیادہ نہ بڑھنے
بدھا لائکہ یہ چیز جیس ایڈ جعفری کی فرم کے قاعدے کے خلاف تھی۔ لیکن چپر اسی شایدی یہ
قیصر چپ ہو رہا کہ مس صاحبہ ابھی نئی پھنسی ہیں۔ جس دن مجرم صاحب نے کان کھول دیئے
بٹھیک ہو جائے گا۔

رشیدہ فائیل نکال کر ناپ کرنے پیش گئی لیکن چپر اسی کا مسئلہ؟ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کس
رج نالا جائے۔ دفتاؤ سے اس نے آواز دی۔

”دیکھو....!“ اس نے کہا۔ ”مجھے دو درجن لفافوں اور اتنے ہی پوست کا درڈوں کی ضرورت
ہے اگر لادو تو بڑا کام کرو۔ ابھی کافی وقت ہے۔“

”لادوں گا! مس صاحب۔“ وہ دانت نکال کر بولا۔ ”یہ بھی کوئی کام میں کام ہے۔“

رشیدہ پانچ کا نوٹ نکال کر اسے دیتی ہوئی بولی۔ ”بقیہ تمہارے ناشتے کے لئے۔“

”ارے.... ہی.... ہی.... ہی۔“ چپر اسی نے ایک بار پھر دانت نکال دیئے۔

رشیدہ نے اطمینان کا سنس لیا۔ ڈاکخانہ اتنی دور تھا کہ آدھ گھنٹے سے قبل اس کی واپسی ناممکن

”اچھا تو تم یہیں بیٹھو۔“ حمید اٹھتا ہوا بولا۔ ”ابھی آفس میں واپس نہ جانا۔ اس چپر اسی کو بھت رہو اور اس سے جو کچھ بھی ملکوایا ہے باہر ہی لے لو تو بہتر ہے پھر تم نہیں آسانی سے اسے بھجا سکتی ہو کہ تم ابھی آفس واپس نہ جاؤ گی۔ کیونکہ تمہیں ایک دوسرا ضروری کام یاد آگیا ہے۔ بھج گئیں۔“

”اچھا پھر....!“

”اپنے وقت سے آفس جاؤ گی۔“

”ٹھیک! لیکن اگر چپر اسی نے اس کا تند کرہ کسی سے کر دیا تو۔“

”دیکھا جائے گا...۔۔۔ تم نے ضرور خاتما لازم کی نہیں ہے۔“

حمید ریستوران سے چلا گیا اور رشیدہ باہر آئی۔ اس نے یہرے کو بلا کرنا شے کا آرڈر دیا اور دیباخ پر نظریں جمادیں۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں چپر اسی نکل نہ جائے۔

چپر اسی خلاف موقع جلد ہی نظر آگیا۔ لیکن ساتھ ہی رشیدہ کو ایک دوسرا خیال بھی آگیا۔ وہ ری میں اپنا فائل میز پر ہی چھوڑ آئی تھی اور اس کی عدم موجودگی میں اس کا وہاں پایا جانا قطعی ناسب تھا لہذا اس نے چپر اسی کو باہر ہی روکنے کا خیال ترک کر دیا۔ ابھی ساڑھے آٹھ ہی بجے تھے۔

اس نے جلدی جلدی الشاہید حاصل کیا اور باہر نکل آئی۔ آفس پہنچنے تو چپر اسی لہک کر اٹھا۔ ”میں ذرا ناشتہ کرنے چلی گئی تھی۔“ رشیدہ نے اس سے لفافے اور پوست کا رذلیتے ہوئے لے چپر اسی نے بقیہ پیسے بھی واپس کرنے چاہے لیکن رشیدہ نے لینے سے انکار کر دیا۔ چپر اسی امام کر کے بڑا نہ لگا۔ ”خدا آپ کا بھلا کرے۔ پچے کے لئے چپل ہو جائے گی۔“ مس صاحب رے آٹھ پچے ہیں۔ بہت غریب آدمی ہوں۔ یہاں کل ساتھ روپے ملتے ہیں نہ انعام نہ ٹھی۔ ”خدا آپ کا بھلا کرے۔“

”قچیچی...!“ رشیدہ غناک انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں کسی دن تمہارے پچوں سے ملنے کا لئے آؤں گی۔“

”اے... آپ مس صاحب... ہم غریب آدمی ہیں۔“

”غریب سے کیا ہوتا ہے ہمارے بھائی ہو۔“

”خدا آپ کا بھلا کرے۔“ چپر اسی پیشانی کی طرف ہاتھ لے جاتا ہوا بولا۔ ”مگر... مس

تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جعفری کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں کوئی نہیں تھا۔ سامنے ایک بڑی سی میز تھی اور اس کے پیچے ایک چکر کھانے والی کرسی اور ایک تجویری، دونوں بازوؤں میں دو بڑی بڑی الماریاں تھیں جن کی چوڑائی نے دونوں طرف کی دیواروں کو تقریباً ڈھک لیا تھا۔ رشیدہ نے سب سے پہلے دونوں الماریوں کے پیچے جھاک کر دیکھا۔ دیواریں سپاٹ تھیں۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھی۔ کرسی کے پیچے لکڑی کا ایک بڑا صندلہ نظر آیا جو مغلی نہیں تھا۔ رشیدہ نے یونہی بے خیالی میں اس کا ڈھکن اٹھا دیا۔ اور پھر اوس سے لمحے میں اس کی سانس بڑی طرح پھول رہی تھی۔ پورا صندوق ریو اور ز سے بھرا ہوا تھا اور سب بالکل نئے تھے۔

رشیدہ نے یہیں اینڈ جعفری کی تجارت کے متعلق اچھی طرح چھان بیں کی تھی اور اسے یقین تھا کہ اسلحہ جات کی تجارت اس فرم میں نہیں ہوتی تھی۔ اس نئی دریافت سے پیدا ہو جاتا والے جوش نے فی الحال چور دروازے کا خیال تو اس کے ذہن سے نکال ہی دیا۔ صندوق کا ڈھکر بند کر کے وہ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں واپس آگئی۔

وہ کچھ دیر تک اپنی میز پر بیٹھی ہانپتی اور چہرے سے پیسہ پوچھتی رہی پھر یکبارگی انھی اور بہ نکل آئی۔ اسے ملکہ سراغ رسانی کے ان آدمیوں میں سے کسی کی تلاش تھی جنہیں فریدی۔ چیس اینڈ جعفری کے دفتر کے قرب و جوار میں رہنے کی تائید کی کر دی تھی۔

سامنے والے ریستوران میں اسے ایک جانے پہنچانے چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ سرجنت حمید تھا اور اب تک اسی شکاری ہی والے بھیں میں تھا۔ رشیدہ نے تیزی سے مڑکا کی اور ریستوران میں داخل ہو گئی۔

”ہلو...!“ حمید نے مکر اکر اسے آنکھ ماری۔

”میں نے ایک نئی دریافت کی ہے۔“ رشیدہ اور حمید کیم کر بولی۔ ”اس کیم میں اٹھ چل۔ وہ دونوں کیمین میں آکر بیٹھ گئے اور رشیدہ نے پردہ کھینچ دیا۔ پھر اس نے جلدی جلدی کار نامہ دہرا لیا۔

”تمہیں یقین ہے کہ اسلحہ کی تجارت ہوتی ہے۔“ حمید نے پوچھا۔

”سو فصدی یقین ہے۔“

صاحب ایک بات کھوں.... آپ نہیں۔

”کیا.... کھو کھو۔“

”صاحب براہ را آدمی ہے۔ کسی کی عزت کو عزت نہیں سمجھتا اس کا حکم ہے کہ نہ وقت پہلے آؤ اور نہ وقت کے بعد رکو۔ ولایت ہو آیا ہے تا۔ پانچ برس وہاں رہا ہے۔ کہتا ہے سب ما قاعدے سے ہونا چاہئے۔ اگر اسے کبھی معلوم ہو گیا کہ آپ وقت سے پہلے آئی تھیں... تو“

”اوہ....!“ رشیدہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”تو میں چلی جاؤں۔“

”ہاں مس صاحب وہ بہت برا آدمی ہے۔“

”تو تم کسی سے کھو گئے نہیں۔“

”ارے نہیں صاحب۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سانس لیا۔ ایک بہت برا مسئلہ خود بخود حل ہو گیا تھا اس نے جلدی فائل کو الماری میں ڈالا اور اپنا ہینڈ بیک سنجاتی ہوئی باہر نکل آئی۔

باقیہ وقت اس نے دوسری سڑک کے ایک ریستوران میں گزارا اور ٹھیک سوانح بجے دہل سے آفس چل پڑی۔ آفس پہنچتے سائز ہے نون گئے۔ بڑے کمرے میں دو پولیس انپکٹر کا نشیلوں کے ساتھ موجود تھے اور راحیلہ کھڑی انہیں گھور رہی تھی۔ شاید وہ بھی ابھی آئی تھی۔ اس نے رشیدہ کی طرف معنی خیز نظر وہی سے دیکھا اور اپنی میز پر بیٹھ گئی۔ رشیدہ نے جو چہرے پر حیرت کے آثار پیدا کئے اور راحیلہ سے سر کے اشارے سے ان کی موجودگی کا مطلب لمن انہوں نے مجھے اندر نہیں جانے دیا۔ پوچھا راحیلہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔

رشیدہ نے اپنا فائل نکالا اور ناپ رائٹر سنجال بیٹھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر ایک

سب انپکٹر کو مخاطب کیا۔ ”کس کا انتظار ہے آپ کو۔“

”جعفری صاحب کا۔“ اس نے جواب دیا۔

اتھے میں راحیلہ شاید کسی کاغذ کے لئے جعفری کے کمرے میں جانے لگی لیکن سب ایسا یہ دوں تلے سے زمین نکل گئی۔ اچھا ہی ہوا کہ جعفری پولیس والوں کی طرف متوجہ تھا ورنہ نے اُسے روک دیا۔

”کیوں؟“ راحیلہ گھبرا کر بولی۔

”یونہی! تشریف رکھئے۔“

راہیلہ بیٹھ گئی۔ اُس کے چہرے پر الجھن کے آثار نظر آرہے تھے۔

”آخر برات کیا ہے؟“ رشیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ سب انپکٹر نے کہا اور سگریٹ سلاگا نے لگا۔

ٹھیک دس بجے جعفری دفتر میں داخل ہوا۔ پولیس والوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لئے ٹھنکا انہیں گھورتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

”آہم....!“ غراہٹ سنائی دی۔ ”کیا بات ہے۔“

”اس کمرے کی حلاشی لینی ہے۔“ سب انپکٹر بولا۔

”کیوں؟“

”اور پس حکم ملا ہے اور یہ رہا حلاشی کا وارث۔“

”آہم....!“ جعفری کی غراہٹ بڑھ گئی۔ ”اس حماقت کا مقصد۔“

”ہم ہیاں فضول باتیں سننے کے لئے نہیں آئے۔“ ایک سب انپکٹر بگڑ کر بولا پھر اس نے پس ساتھی کو اشارہ کیا اور وہ درازانہ جعفری کے کمرے میں گھستے چلے گئے۔ رشیدہ کا ذل شدت سے ڈکر رہا تھا اور وہ بار بار اپنے ہو متلوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

”شاید ان لوگوں کا داماغ خراب ہو گیا ہے۔“ جعفری نے رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں جیس بار ملے کافائل لینے اندر جا رہی تھی۔“ راحیلہ نے شکایت آمیز لمحے میں کہا۔

”ان کی شامت آئی ہے۔“ جعفری بلند آواز میں بولا اور رشیدہ متیر رہ گئی۔ کیونکہ اس نے

بلدر اصل پولیس والوں کو سنانے ہی کے لئے کہا تھا۔

جعفری اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ اسکے بعد راحیلہ بھی اٹھی اور رشیدہ نے اس کی تقلید کی۔

سب انپکٹر بکس کا ڈھکن اٹھائے اپنے ساتھیوں کو گھور رہا تھا اور بکس بالکل خالی تھا۔ رشیدہ

اٹھنے میں راحیلہ شاید کسی کاغذ کے لئے جعفری کے کمرے میں جانے لگی لیکن سب ایسا

لہو کے چہرے کی بدلتی ہوئی حالتوں سے کم از کم ٹھنک ضرور جاتا۔

”آخر مطلب کیا ہے؟“ جعفری گرج کر بولا۔

”کوئی بات یہ ہے۔“ سب انپکٹر گھبرائے ہوئے لجھے میں بولا۔ ”ہمیں اطلاع ملی ہے کہ

یہاں.... اس کمرے میں کوئی چور دروازہ ہے۔“
جلد ختم ہونے سے پہلے ہی دوسرے سب انپکٹر نے کمرے کی دیواروں کو لکھتا ہوا
کر دیا تھا۔

”گٹ آؤٹ۔“ جعفری حق کے مل چینا۔ اس کی خوفناک آنکھیں اُنہل پڑی تھیں اور
چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔
”لیکن توچ پلیز....!“

”آئی تے سے گٹ آؤٹ۔“ جعفری ایک قدم آگے بڑھتا ہوا بولا۔

”مجھے مجبور نہ کیجئے کہ میں آپ کو حرast میں لے لوں۔ آپ اس طرح براور اور
حکومتی الہمکاروں کی توجیہ کر رہے ہیں۔“
”آہم.... آدمی کو پہچان کر برداشت کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہارے لئے پر ہر جانے اور
الہمیت عرفی کا دعویٰ کروں گا.... مذاق ہے۔“
”توہڑی دیر بعد انپکٹر واپس آگئا اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اپنے ساتھی کی
لرف دیکھ کر بولا۔ ”شراب کی پیشیاں ہیں.... اور غالباً....!“

”جناب....!“ جعفری نے اُس کی بات کاٹ کر مضمون انداز میں کہا۔ ”اور فرم کے پاس
لایتی شراب درآمد کرنے کا لائسنس بھی ہے۔“

”پیشیاں کھلی ہیں یا بند۔“ انپکٹر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔
”بند ہیں۔“
”تو وہ کھوئی جائیں گی۔“

”کھولو....!“ جعفری لاپرواں سے بولا۔
”تقریباً دو گھنٹے تک کام جاری رہا لیکن پیشیوں میں شراب کی بوتکیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ
ٹکل۔ تہہ خانے میں کسی دوسرا سے دروازے کی بھی تلاش کی جا رہی تھی لیکن بے سود.... پولیس
مالے ہائپتے ہوئے تہہ خانے سے نکل آئے۔

”میں پورے آفس کی تلاشی لوں گا۔“ ایک بولا۔
”ضرور لو....!“ جعفری غریا۔ ”کم از کم دو لاکھ ہر جانے کا دعویٰ کروں گا۔“
رشیدہ کی حالت ابتر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فریدی کو کیا جواب دے گی۔ آفس کے
پولیس والے کبھی حیرت سے اسے دیکھتے تھے اور کبھی تہہ خانے کے تاریک دہانے کو۔
”جاوہ دیکھو.... کیا ہے اس میں۔“ جعفری پھر غریا۔ ”شاید وہ غیر قانونی اشیاء اسی کی
رہی ہوں.... جاؤتا.... وہاں بھیڑیے نہیں ہیں۔“

ایک سب انپکٹر تہہ خانے کی طرف بڑھا لیکن پھر رک کر جعفری کی طرف دیکھنے لگا جو
ری پر پیٹھ کر اپنا پاپ سلاکنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بھنوئیں تاک کہ سب انپکٹر کی طرف دیکھا اور
پر کو دانتوں میں دبائے ہی دبائے کہنے لگا۔ ”جاوہا.... لیکن میں تمہارا ساتھ نہ دے سکوں گا۔
ہرے پاپ بر باد کرنے کے لئے وقت نہیں۔“

وہ سب انپکٹر تین کاشیبلوں کے ساتھ نیچے آت گیا۔ دوسراؤ پر ہی رہا۔
”لیکو! پیٹھ جاؤ۔“ جعفری رشیدہ اور راحیلہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”اُبھی یہ لوگ نہ کا
ہاشد دکھائیں گے۔“

”میں کہتا ہوں۔“ سب انپکٹر نے جھلا کر کہا۔ ”آپ اتنے بد تہذیب کیوں ہیں۔“

”آہم.... آدمی کو پہچان کر برداشت کرنے کا عادی ہوں۔ میں تمہارے لئے پر ہر جانے اور
الہمیت عرفی کا دعویٰ کروں گا.... مذاق ہے۔“

”توہڑی دیر بعد انپکٹر واپس آگئا اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہو رہی تھی اپنے ساتھی کی
لرف دیکھ کر بولا۔ ”شراب کی پیشیاں ہیں.... اور غالباً....!“

”جناب....!“ جعفری نے اُس کی بات کاٹ کر مضمون انداز میں کہا۔ ”اور فرم کے پاس
لایتی شراب درآمد کرنے کا لائسنس بھی ہے۔“

”پیشیاں کھلی ہیں یا بند۔“ انپکٹر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔
”بند ہیں۔“

”تو وہ کھوئی جائیں گی۔“

”کھولو....!“ جعفری لاپرواں سے بولا۔
”تقریباً دو گھنٹے تک کام جاری رہا لیکن پیشیوں میں شراب کی بوتکیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ
ٹکل۔ تہہ خانے میں کسی دوسرا سے دروازے کی بھی تلاش کی جا رہی تھی لیکن بے سود.... پولیس
مالے ہائپتے ہوئے تہہ خانے سے نکل آئے۔

”میں پورے آفس کی تلاشی لوں گا۔“ ایک بولا۔

”ضرور لو....!“ جعفری غریا۔ ”کم از کم دو لاکھ ہر جانے کا دعویٰ کروں گا۔“
رشیدہ کی حالت ابتر تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فریدی کو کیا جواب دے گی۔ آفس کے

سر جنگ حید اور ناگر بیٹھے بڑی دیر سے رقص میں شرکت کرنے والوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ یہاں وہ کسی خاص مقصد کے تحت نہیں آئے تھے۔ دن بھر کی دوڑ دھوپ اور جھکن تھے۔ میں بھی وہ کافی دیر تک بیٹھا کی غصیلے بلڈاگ کی طرح غراہ تھا۔ حید اس وقت شکاری یا بس میں نہیں تھا۔ البتہ میک اپ وہی پرانا تھا۔ اس نے عمدہ قسم کا ذنسروٹ پہن رکھا تھا اور دل میں ہیرے ڈال لئے تھے۔ بہر حال وہ اس وقت راجپوتوں کی کسی شاہی نسل کا ایک متول معلوم ہوا تھا۔ چڑھی ہوئی گھنی سیاہ موچھیں ظاہری وجہت میں خاص اضافہ تھیں۔

”ابے اوڑا انگر۔“ حید ناگر کی بوتل پر کاگ رکھتا ہوا بولا۔ ”اب بس کرو۔“

”باس! بھی سے باس۔“ ناگر انگلی نچا کر بولا۔

”ارے تمہیں بیڑے بھی نشہ ہو جاتا ہے۔“

”چوتھی بوتل ہے.... ہی ہی میں کیا نہ۔“

”ابے جل بھی سکو گے اب تم! مینڈک کہیں کے۔“

”مینڈک ہی ہی.... مینڈک.... مینڈک کا اچار کھایا ہے تم نے کبھی۔“

”مت بور کرو۔“ حید بھنا کر بولا۔

”آج میں بہت اوس ہوں۔“ ناگر رک رک کر بولا۔

”نہیں دیو داس ہو.... مت دماغ چانو۔“

”دیو داس بھی پیتے پیتے مر گیا تھا.... اور میں بھی کسی دن پیتے پیتے مر جاؤں گا.... م.....“

..... کونو صاحب.... میں حید صاحب کہنے جا رہا تھا.... کیا تام بتایا تھا آپ نے۔“

”کونو رنجیت سنگھ۔ اگر تم ذرا بھی بیکے تو الٹا ہاتھ رسید کروں گا۔“

”میں تم سے کمزور نہیں ہوں.... ہاں۔“ ناگر بھنو میں چڑھا کر بولا۔

”نہیں نہیں تم رستم ہو۔“ حید نے جلدی سے کہا۔ وہ ذر رہا تھا کہ کہیں ناگر نہ میں ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ دفعہ اس کی نظریں جعفری پر جم گئیں جو کا ذنسروٹ پر بار میں سے باقیں کر رہا تھا۔

”ناگر ڈیر۔“ حید بولا۔ ”کیا تم اسے جانتے ہو۔“

ناگر نے مز کر دیکھا۔ اس وقت جعفری مجھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یک بیک حید نے محسوس کیا چیز ناگر کا نہ سی ہر ہن ہو گیا ہو۔ وہ پلٹ کر خوفزدہ نظر وہ میں سے حید کی طرف دیکھنے لگا۔ ساتھ

دوسرے کروں کی بھی تلاشی لی گئی لیکن نتیجہ وہی صفر۔ بیوی اور توکیار بیوی اور کی تصویر بھی نہیں تھی۔ تلاشی ختم ہونے کے بعد جعفری نے چنگھاڑ چنگھاڑ کر سارا دفتر سر پر اٹھا لیا۔ پولیس والوں کے چلے پر بھی وہ کافی دیر تک بیٹھا کی غصیلے بلڈاگ کی طرح غراہ تھا۔

آفس نائم کے بعد رسیدہ باہر نکلی تو بُری طرح گھبرائی ہوئی تھی۔ بُس سینیڈ پر حید سے ملاقات ہو گئی۔ شاید وہاں اسی کا انتظار کر رہا تھا۔

”کیوں؟ کیا یہ اسی رات کا بدلتا تھا۔“ حید نے منہ بنا کر کہا۔

”خدا کی قسم مجھے خود حیرت ہے۔“ رسیدہ جلدی سے بولی۔ ”میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم یہی سمجھو گے۔“

”بہر حال مجھے کافی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔“ حید نے کہا۔ ”اس وجہ سے اور پریشانی ہے کہ میں نے فریدی صاحب سے مشورہ لئے بغیر تلاشی کاوارٹ نکلوالا تھا۔“

”پھر اب بتاؤ میں کیا کروں۔“ رسیدہ بے لمسی سے بولی۔

”اس لڑکی سے میرا تعارف کراو جو تمہارے کمرے میں بیٹھی ہے۔“ حید مسکرا کر بولا۔

”مت فضول بکو۔“ رسیدہ نے یک بے جان سے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ بہت شریف لڑکی ہے۔“

”لڑکی تو ہے.... اگر وہ کیمنڈ ٹی ہوتی تو میں اسے برداشت کر لیتا۔“

”کسی وقت تو سمجھیدہ ہو جایا کرو۔“

”بکھی نہیں۔ آج صبح تمہاری ہی بدولت سمجھیدہ ہو گیا تھا۔ نتیجے میں یہ ذلت نصیب ہوئی خرچا پھر سکی!“

وہ فٹ پا تھ پر رینگنے والی بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

دو مرکار

آر لکھو میں بڑا شاندار پروگرام تھا۔ سر دیوں کی خوشنگوار رات تھی اور اس لئے اور بھی خوشنگوار تھی کہ دوسرے دن اتوار تھا۔

ہی وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان بھی پھیرتا جا رہا تھا۔

”کیوں...!“ حمید اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”اس کی آنکھیں...!“ تاگر آہستہ سے بڑا لیا۔

”تمہیں پسند نہیں آئیں۔“ حمید نے پس کر کہا۔

”میں جا رہا ہوں۔“ تاگر اٹھنے لگا۔

”بیٹھو...!“ حمید اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آنکھیں...!“ مجھے نہ روکے۔“

”بیٹھو...!“ حمید نے زبردستی اُسے بخادیا۔ تاگر نبڑی طرح کانپ رہا تھا۔

”بیسر اور منگوں۔“ حمید نے پوچھا۔

”نہیں....!“ تاگر نے آہستہ سے کہا۔ وہاب بھی مژہ کر جعفری کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔

”آخر بات کیا ہے۔“

”وہ آنکھیں۔“

”ارے تو بولو نابا! یہ شعر ہے یا مصروف۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جنہوں نے مجھے دریا میں چھلانگ لگانے پر مجبور کیا تھا۔

”اوہ.... تمہیں یقین ہے۔“

”بالکل دیکھی ہیں۔“

”تو خیر بھائے کی ضرورت نہیں۔“

”میری جان نہ بیجھے۔“

”چپ بے... ڈیوٹ۔“

تاگر ایک طرف گردن ڈال کر بیٹھ گیا۔

”وہ تمہیں اس میک اپ میں پہچان نہ سکے گا۔“ حمید نے اسے تسلی دی۔

”کون؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ.... ارے۔“

”چپ رہو پھر مڈی۔“

”خیر جان تو جانی ہی ہے کیوں نہ میں ہی....!“ تاگر کا کامپتا ہوا ہاتھ اُس کی جیب کی طرف

”کس کی؟“

ہذا تھا۔

”خبردار... پاگل ہوئے ہو۔“ حمید نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہی مسٹر کیوں ہے۔“ تاگر کی پاپتی ہوئی آواز میں بولا۔

”مکون نہیں.... محض آنکھوں کی بناء پر.... اور پھر تم یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہو

”آنکھیں تمہارے مسٹر کیوں ہی کی ہیں۔“

”پھر یہ ہے کون...!“ تاگر نے پوچھا۔

”جیس ایزد جعفری کی فرم کا جزل نیجرا مسٹر جعفری۔“

”اوہ تب تو۔“ تاگر کی آواز میں پھر کی پاپتی تھی۔ ”تب تو.... پھر آخر فریدی صاحب نے

ل کے پچھے آدمی کیوں لگائے ہیں۔“

”پتہ نہیں! چلو چھوڑو۔“ میں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرتا ہے۔ جیسا کہا جائے گا کریں

لے۔ ہائے کیا کیا یلا لیاں نظر آ رہی ہیں۔“

”یلا لیاں کیا؟“ تاگر نے پوچھا۔ لیکن وہاب بھی خوفزدہ نظر وہ سے جعفری ہی کی طرف

کیجئے جا رہا تھا۔

”ابے تم یلا لیاں نہیں سمجھے۔“

”نہیں۔“

”یلا لیلی خوبصورت لڑکی کو کہتے ہیں لفظ ”لڑکی“ میں ”ز“ مجھے بہت گراں گز رتا ہے اور پھر

دب صورت لڑکی اُسے تو چکیلا ہی ساتھ دینا چاہئے۔ یلا لیلی بہت مناسب ہے۔“

”زبردستی خواہ خواہ۔“ تاگر نے منہ بنایا۔ وہ دراصل کسی طرح جعفری کے خیال سے پچھا

ہلانا چاہتا تھا۔ جواب ہاں میں نہیں تھا۔

”زبردستی کیوں؟ ذرا اس یلا لیلی کی آنکھیں تو دیکھو۔“ دفتار حمید چوک کر بولا۔

حمدید ایک لڑکی کو بڑی توجہ اور دل چھمی سے دیکھ رہا تھا۔

”واقعی لا جواب آنکھیں ہیں۔“ تاگر بڑا لیا۔

”لیکن تم کو کسی اور کی آنکھیں بھی یاد آ رہی ہوں گی۔“

”کس کی؟“

”یہ کیا بلا ہے۔“
 ”میری لفٹ میں انتہائی حسین لڑکی کو کہتے ہیں۔“
 ”تم مکار ہو.... ہر جائی کہیں کے ! میں تمہیں کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔“
 ”پھر بھی تمہارے مالک نے مجھے گولی کا فناہ نہیں بنایا۔“ حمید کے لمحے میں حیرت تھی۔
 ”بھلا تم جیسے البا کو۔“
 ”میں البا ہوں۔“ حمید نے بُر امان کر کہا۔
 ”بگزو نہیں میری لفٹ میں البا انتہائی شریر لڑکے کو کہتے ہیں۔“
 ”کنول ڈار لگ مجھے حیرت ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔ بے چارے ناگر کا توہہت براہتر ہوں“
 ”اس سخنے کا خستر۔“ کنول پس کر کبوٹی۔ ”واقعی بہت بُرا ہوا ہے۔ بیکر کی چار چار بوتلیں
 پسی نشست میں صاف کر دیتا ہے۔“
 ”ارے تم اسے بھی پہچان گئی ہو۔“
 ”کیوں نہیں! مجھے عرصہ سے تم لوگوں کی تلاش تھی۔“
 ”کیوں....!“
 ”مالک کا حکم! اور جس دن میں نے اطلاع دے وی تم لوگ ٹھکانے لگادیے جاؤ گے۔“
 ”اُبھی تک کیوں نہیں دی۔“
 ”میری مرضی۔“
 ”کل کہاں ملوگی۔“
 ”کہیں نہیں.... لیکن تمہارے گروہنال کا پتہ آج تک نہ چل سکا۔“
 ”اور تو یہ کہو! اس طرح پتہ لگانا چاہتی ہو۔“
 ”یہ تم کہہ رہے ہو جسے میں نے تکلیف سے بچانے کے لئے خواب آور دوادی تھی۔“
 ”اس بھروسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔“ حمید پس کر کبوٹا۔
 ”بھرم بھی آدمی ہی ہوتے ہیں اور ہر ایک کے لئے ان کے سینے میں پھر کا لکڑا نہیں ہوتا۔“
 ”تھوڑی دری تک خاموشی رہی پھر حمید بولا۔ ”تو.... تم آج تک اپنے مالک کی شخصیت کے
 غلط کچھ نہیں معلوم کر سکیں۔“

”خدا کی قسم یہ کنول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ ”حید سید حاہو کر کبوٹا۔
 ”کنول....!“ ناگر ہنسنے لگا۔ ”شاید آپ اس کی شکل بھول رہے ہیں۔“
 ”اور شاید وہ بھی تمہاری موجودہ شکل بھول جائے۔“
 ”تو کیا میک اپ ہے۔“ ناگر نے پوچھا۔
 ”قطعی ایسے آنکھیں اور یہ گردن جھنکتے کا مخصوص انداز کنول ہی کا ہو سکتا ہے۔“ حمید اپنی ہمراہ
 سے اٹھتا ہوا بولا۔
 آرکشن اثر دفعہ ہو گیا تھا۔ لوگ رقص کے لئے اپنی گھبیں چھوڑ رہے تھے حمید جھپٹ کر از
 لڑکی کے قریب پہنچا۔
 ”کیا میں آپ سے رقص کی درخواست کر سکتا ہوں۔“ اس نے بڑے سلیقے سے جھک کر کہا۔
 ”جخ.... جی ہاں.... مجھے خوشی ہو گی۔“
 اس دوران میں آرکشن نے دھن بدلی اور واٹر بختے لگا۔ وہ دونوں رقصاؤں کی بھیڑ میں
 آگئے۔ لڑکی نے اپنا جسم تان کر تھوڑی آگے کی طرف نکالی اور کو لوہوں کو پیچھے ہٹا کر حمید
 کا نڈھوں پر زوال ڈال دیا اور حمید نے اسے گول گول چکر دینے شروع کر دیے۔
 ”آپ کو واٹر کا بڑا سلیقہ ہے۔“ حمید آہستہ سے بولا۔
 ”شکریہ۔“
 ”آپ کے بال بڑے حسین ہیں۔“
 ”اور آپ کی موچھیں۔“ لڑکی مسکرائی۔ ”حالانکہ نقی ہونے کی وجہ سے ایسی معلوم ہو
 ہیں جیسے کسی امرود پر گھاس آگ آئی ہو۔“
 ”اوہ....!“ حمید نے ہلاکا ساق تھوہہ لگایا۔ لیکن آپ کی آنکھوں کے کنول ہمیشہ شادا
 رہیں گے۔
 ”لڑکی ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”تو تم نے پہچان لیا... امرود بخت۔“
 ”دور ہی سے پہچان گیا تھا۔“
 ”تو پھر گرفتار کر دوتا۔“
 ”ہے ہے! تمہیں میں گرفتار کراؤں گا۔... تمہیں یلا لیلی کو....!“

”تم ایک محبت بھرے دل کے متعلق بہت کچھ جانتی ہو۔“ کنول نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم روز اپنے سکی لڑکی کو یوں توف بنتے ہو۔ ہر جائی ہوتا۔ ہری چک۔“

”میں نے آج تک کسی لڑکی کو بے وقوف نہیں بنایا بلکہ بتا دی رہا ہوں اور یہی وجہ ہے کہ اب تک کنوارا ہوں۔“ حمید کی آواز گلوکیر ہو گئی اور وہ یوں تارہا۔ ”بہتری لڑکوں نے مجھ سے دی کا وعدہ کیا۔ لیکن بعد میں کیڑے نکال دیے کسی نے کہا کہ تمہاری ایک ناگ چھوٹی ہے اور بڑی۔.... اچھا تمہیں بتاؤ۔.... اتنی دیرے سے ناچ رہا ہوں تم نے کچھ محسوس کیا؟“

”نہیں تو....!“

”اگر ایک ناگ چھوٹی ہوتی تو میں با قاعدہ پھردا کتا ہوتا۔ ایک لڑکی نے یہ کہہ کر میرا دل توڑ کر کھانی دیکھ کر میری راں پکنے لگتی ہے۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ میں بڑھاپے میں مل کوست معلوم ہونے لگوں گا۔“

”اور میں یہ کہتی ہوں کہ تم سے بڑا مکار آج تک میری نظر وہ سے نہیں گزرا۔.... وہ ڈول کی مار مجھے اب تک یاد ہے اور اس پر تمہارا رویہ۔ کوئی اور ہوتا تو اس کے منہ سے آواز بھی لکھتی۔“

”خوب یاد دلایا۔“ حمید نے کہا۔ ”وہ لڑکی نادرہ کہا ہے۔“

”پتہ نہیں۔.... اب میرے ساتھ نہیں ہے۔“

”کنول ڈار لنگ۔.... میں مرتے دم تک تمہیں یاد رکھوں گا۔.... ہائے وہ پہلی ملاقات وہ اندری رات اب بھی اکڑہ ہن کے تاریک گوشوں میں پھسل آتی ہے۔ کاش یہ کم بخت تمہارا لک در میان میں حائل نہ ہوتا۔ میں اسے کسی دن تھری زیر و پر فون کر دوں گا۔“

”بہت اچھے۔“ کنول نے قہقہہ لگایا۔ ”اس طرح تم مجھ سے یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ اب اس

سے رابطہ قائم کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔“

”چلو یہی سمجھو لو۔.... ویسے تم مجھے مکار تو سمجھتی ہی ہو۔“ حمید مخصوصیت سے بولا۔

”فی الحال پیغام رسائی کے لئے آدمی استعمال کئے جا رہے ہیں۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ

ان آدمیوں تک اس کے پیغام کس طرح بخپتھی ہیں۔“

رفعتا حمید کی نظر تاگر کی طرف اٹھ گئی جو میز پر سر اوندھائے بیٹھا تھا۔ اس نے رقص میں

”نہیں۔.... اب میں اسے چھانی کے تنخے ہی پر پہنچانا پسند کروں گی۔“

”یہ تبدیلی کیوں؟“

”محض اسٹلنے کو وہ آدمی نہیں جاؤ رہے۔ اسے بہتے ہوئے خون سے پیارہ ہے وہ بھیڑا ہے۔“

”جعفری کو جانتی ہو۔“

”کون۔.... وہی خوفناک آدمی۔.... جواہی کاؤٹر پر تھا۔“

”ہاں۔.... وہی۔“

”آج کل اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔“ کنول بولی۔

”لیکھاں ہے کہیں وہی تو تمہارا مالک نہیں۔“

”پتہ نہیں۔.... ویسے میں نے اسے اپنی لست پر رکھ لیا ہے۔“

”لست پر۔“

”ہاں مجھے بھی تو تمہاری ہتھی طرح مجرموں کی تلاش رہتی ہے۔“

”کیوں۔....؟“

”جس کے متعلق ذرا بھی شبہ ہوا کہ یہ کسی قسم کا جرم ہو سکتا ہے میں اس کے پیچھے لگ جائز ہوں اور پھر اس کے متعلق معلومات فراہم کر کے اپنے ماں کو اطلاع دیتی ہوں اور پھر وہ اسے بلیک سیل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیتا ہے۔“

”تمہاری بھی ذیبوٹی ہے۔“

”ہاں۔....!“

”فی الحال میری سب سے بڑی آرزو یہی ہے کہ۔....!“

”کیا۔....؟“

”ہم سے مل کر کام کرونا۔“ حمید نے اپنی آنکھیں نیلی بنا کر آہستہ سے کہا۔

”یہ کسی طرح ممکن نہیں۔“

”اوہ نہ۔.... چکر پورا نہیں ہو۔“ حمید نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”بیان پیر۔.... نھیک۔.... کنول ڈار لنگ تم تجھ بڑی پیاری ہو۔“

”تم سور ہو۔ مجھے بے وقف مت بناؤ۔“ کنول نے اس کے شانے پر چکلی لی۔

بھی شرکت نہیں کی تھی اور پھر اسے جعفری دکھائی دیا جو ناگر کے قریب ہی کھڑا کسی عورت سے باتمیں کر رہا تھا۔ عورت کی پشت حمید کی طرف تھی۔ اتنے میں آرکشن اینڈ ہو گیا تھا۔ راقم انہی میزوں کی طرف لوٹنے لگے۔ جعفری سے گفتگو کرنے والی عورت مجھے کی طرف مزدی اور بھر نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی۔

شریف بھیریا

رشیدہ اس وقت کسی طرح جعفری سے پچھا چھڑانا پاہتی تھی۔ اگر اسے ذرہ برا بر شہر بم ہوتا کہ جعفری اسے یہاں مل جائے گا تو وہ ادھر کارخانہ کرتی۔ دن بھر کی کوفت دور کرنا یہاں چلی آئی تھی۔ ویسے اسے یہاں جعفری کو دیکھ کر حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اسے معلوم ہے وہ بہت ہی خلک اور غیر سو شل قسم کا آدمی ہے اور پھر اسے بھول کر بھی یہ موقع نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرے گا۔ بہر حال وہ اس کے اس روایہ پر کھلک ضرور تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ شاید جعفری کو اس کی تلاشی والی حرکت کا علم ہو گیا تھا اور اب وہ طرح اسے کسی جال میں پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔

رشیدہ نے سر جنت حمید اور ناگر کو بھی دیکھا تھا۔ دوسرا اوٹھ شروع ہوتے ہی حمید پھر اڑکی کے ساتھ ناپنے لگا تھا جس کے ساتھ اس نے پہلے رقص کیا تھا۔ ناگر کو میز پر سر اوندوں دیکھ کر اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ شاید زیادہ پی گیا ہے۔ کیونکہ شراب کی بوتل اب بھی اس کی پر کھلی ہوئی تھی۔

”اوو.... لاونج میں چلن۔“ جعفری نے دوسرا اوٹھ شروع ہوتے ہی رشیدہ سے کہا۔ لاونج بالکل خالی تھی۔ وہاں بیٹھنے والے سب کے سب رقص میں شرکت کرنے چلے گئے تھے۔ جعفری نے بیٹھتے ہوئے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”لڑکی تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا۔“ رشیدہ کو اپنی روح جسم سے پرواز کرتی معلوم ہونے لگی۔ وہ اس سے آنکھیں چڑھتی تھی۔ ”تم شاید میری آنکھوں کی طرف دیکھنا پسند نہیں کرتیں۔“ جعفری نے خوفناک آواز مٹھنے کر کہا اور جیب سے تاریک شیشوں کی عینک نکال کر لگا۔ کچھ دیر رشیدہ کی گھبرائیت سے عا

بھی شرکت نہیں کی تھی اور پھر اسے جعفری دکھائی دیا جو ناگر کے قریب ہی کھڑا کسی عورت سے باتمیں کر رہا تھا۔ عورت کی پشت حمید کی طرف تھی۔ اتنے میں آرکشن اینڈ ہو گیا تھا۔ راقم انہی میزوں کی طرف لوٹنے لگے۔ جعفری سے گفتگو کرنے والی عورت مجھے کی طرف مزدی اور بھر نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ رشیدہ تھی۔

”لطف الدوز ہوتا رہا پھر نرم لبجھ میں بولا۔“ میں نے تمہارے متعلق سب کچھ پتہ لگالیا ہے۔“ پس پہنچ کر رہا تھا جیسے اس کا ہارت فیل ہو جائے گا۔

”بیڈہ کو ایسا لگ رہا تھا جیسے تم نے کہا تھا کہ تم نیو اسٹار کے زائد اسٹاف میں تھیں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں سے ایک رقم کو خرد برد کر دینے کے لوازم میں نکالی گئی ہو۔“

رشیدہ نے اطمینان کا سائنس لیا۔ حقیقتاً انور نے یہی چال چلی تھی۔ غالباً اس کے لئے اسے زیادی سے یہی مشورہ ملا تھا۔ رشیدہ کی علیحدگی کی وجہ غبن دکھائی گئی تھی۔

رشیدہ نے جلد ہی اپنی حالت پر تابو پالیا اور بوبے مسکین لبجھ میں بولی۔ ”پھر میں کیا کرتی۔“

”لابھوں کوں مرتی۔ اگر میں علیحدگی کی اصل وجہ ظاہر کر دیتی تو مجھے کون ملازم رکھتا۔“

”کتنی رقم تھی؟“

”صرف ساڑھے تین سو روپے جو میں نے ایک سوں ایجنت سے زر ہمنانت کے طور پر دھول کر کے بعض ضروریات پر صرف کر دیئے تھے۔ میرا راہدہ تھا کہ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی طرح ٹھیک کر دوں گی۔ مگر اچاک اس ایجنت کی ملاقات براؤ راست فیجر سے ہو گئی۔“

”غیر..... فکر نہ کرو۔ مجھے موقع ہے کہ تم کم از کم میرے ساتھ اپیانہ کرو گی۔ ویسے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم بڑی دلیر لڑکی ہو اور میں کم از کم ہر دلیر فرد کو دولت منڈ دیکھنا پسند کرتا ہوں۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“ رشیدہ نے کہا۔

جعفری نے ایک دیگر کو اشارے سے بلا کر کافی کے لئے کہا اور پھر رشیدہ کی طرف مڑک لالا۔ ”میں تمہیں دولت منڈ دیکھنا پاہتا ہوں۔“

”میں...!“ رشیدہ کا دل پھر دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن اس بار وجہ خوف نہیں تھی، بلکہ اپنے

تفصیل میں کامیابی کا خیال اس کے ذہن میں بیجان برپا کئے ہوئے تھے۔

”تمہیں دولت منڈ دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے مخصوص اسٹاف میں جگہ دینے کے متعلق غور کر رہا ہوں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ رشیدہ کی آواز کپکپا رہی تھی۔

”لیکن لڑکی! ایک بات ذہن میں کھنکی پڑے گی کہ تم مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہیں کرو گی۔“

”دھوکا! نہیں کبھی نہیں۔ دھوکہ تو میں نے انہیں بھی نہیں دیا۔ میری نیت درست تھی۔“

“میں دیہہ دانتہ اس پر سختی کرتا ہوں۔”
 ”کیوں؟“
 ”ہمیں خوبصورت لڑکی ہے اگر کسی جال میں پھنس گئی تو.... اس کا خاندان تباہ ہو جائے گا۔
 ”کیوں اندھی ماں...!“
 ”آپ جانتے ہیں۔“
 ”یکوں نہیں۔“ جعفری بولا۔ ”میں اسی لئے اس پر سختی کرتا ہوں کہ وہ سگھار کرنا چھوڑ دفتر کے کئی کلکروں نے اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن میں نے معاملات کو گئے نہ بڑھنے دیا۔“
 ”چیخ آپ فرشتہ ہیں۔“
 کار شہر کی ایک ویران سڑک پر جا رہی تھی۔
 ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ دفعتاً رشیدہ چوک کر بولی۔
 ”بُن اب دور نہیں ہے۔ میں دراصل ایک آدمی کی عدم موجودگی میں تمہیں اُس سے ملانا تباہ ہوں۔“
 رشیدہ خاموش ہو گئی مگر اس کا دل دھڑکنے لگا۔
 ”ہمیا تم ڈر رہی ہو۔“ جعفری نہ کر بولا۔ ”میری نظروں میں عورتوں کا بہت احترام ہے۔“
 اس نے یک بیک ایسی شکل بنائی ہیے کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ دفعتاً اس نے رشیدہ سے ملے۔ ”کیا کار ڈرائیور کرتا جانتی ہو۔“
 ”جی ہاں۔“

”اچھا تو چند منٹوں کے لئے اسٹریٹ گ سنجال اُو۔“
 رشیدہ نے اسٹریٹ گ پر با تھر رکھا اور وہ اچھل کر کچھلی سیٹ پر چلا گیا۔
 ”نگرمت کرو، اسٹریٹ گ کرتی رہو۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔
 وہ کچھلا شیشہ گرا کر اندر ہیرے میں گھورنے لگا۔ بہت دور سڑک پر ایک بہت بڑا اور متھر ک تاریک دھبہ ساد کھائی دے رہا تھا یہ دراصل ایک کار تھی۔ جس کے ہیئت لا یئس روشن نہیں تھیں۔ غالباً جعفری کی کار کا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ جعفری نے سیٹ کے نیچے با تھر ڈال کر ایک

میں کسی نہ کسی طرح وہ رقم ضرور پوری کر دیتی۔“
 جعفری تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تمہیں میرے لئے تھوڑی سی سراغ بر سانی کرنی پڑے گی۔“
 ”سراغ بر سانی۔“ رشیدہ چوک پڑی۔
 ”ہاں! دفتر ہی میں۔“ جعفری پر خیال انداز میں سرہلا کر بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ میرے دن میں بھیڑوں کی کھال میں کچھ بھیڑیے بھی گھس آئے ہیں۔“
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“
 ”اس شہر میں میرے کچھ حریف بھی ہیں جو مجھے نقصان پہنچانے پر تلمے رہتے ہیں۔ علاوہ والا واقعہ تم بھولی نہ ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب کچھ دفتر ہی کے کسی فرد کے اشارے پر ہوا تھا۔“
 ”اوہ.... لیکن....!“
 ”مجھے یقین ہے کہ یہی بات ہے۔“ جعفری با تھر اٹھا کر بولا۔ ”کل سے تمہاری تھوڑا پانچ رہو پے ماہوار لگے گی اور اس سراغ بر سانی کے سلسلے کے اخراجات الگ.... بولو! کر سکو گی۔“
 ”ضروز کر سکوں گی۔“ رشیدہ بڑا لائی۔ پانچ سورو پے۔ آپ بہت اتھجھے ہیں اور آپ اتنی بھی دیتے تو میرا فرض تھا۔ مالک کے نمک حراموں کو جہنم رسید ہی ہونا چاہئے۔“
 ”مجھے تم سے یہی توقع تھی۔“ جعفری مسکرا کر بولا۔
 ”دونوں خاموشی سے کافی پیتے رہے“ پھر جعفری بولا۔ ”یہ راؤٹ ختم ہونے سے پہلے ہو ہمیں اٹھ جانا ہے میں تمہیں اس وقت ایک ایسے شخص سے ملانا چاہتا ہوں جس کے پیچے تم کل کو سے لگ جاؤ گی۔“
 ”بہتر ہے۔“ رشیدہ نے جلدی جلدی کافی پی اور پھر جعفری میل ادا کر کے اٹھ۔ دونوں دوسرے دروازے سے باہر نکل آئے۔ جعفری کی کار قریب ہی کھڑی تھی۔ اُس نے اگلی سیٹ کی کھڑک کھولی اور رشیدہ اس کا شکریہ ادا کر کے اندر بیٹھ گئی۔ جعفری اُس کے برابر بیٹھ کر اسٹریٹ گ کر لگا۔ کار شہر کی سڑکوں سے گزر رہی تھی۔ رشیدہ نے موج میں آکر راحیلہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔
 ”میں جانتا ہوں وہ بڑی ایماندار لڑکی ہے۔“ جعفری بولا۔
 ”آپ سے ڈرتی بہت ہے۔“

رانفل نکالی جس کی نال میں نیچے کی طرف ایک بڑی سی تاریخ فٹ تھی۔
”چلتی رہو۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ڈر نامت میں فائز کرنے جا رہا ہوں۔“
”کیوں....؟“ رشیدہ کا پ کر بولی۔
”چھپورڈ کمپنی کا کوئی آدی ہمارا تعاقب کر رہا ہے۔“
”قتل! نہیں نہیں۔“ رشیدہ بوجھلا گئی۔

”اوہ....!“ جعفری غرایا۔ ”میں صرف اس کی کار کا ایک نائر پھاڑنے جا رہا ہوں۔“
اس نے رانفل سیدھی کی۔ ٹرینگر پر انگلی رکھتے ہی تاریخ روشن ہو گئی اور ساتھ ہی فائز ہم
ہوا۔ گولی تعاقب کرنے والی کار کے اگلے پیسے پر گئی تھی۔

غیر ادی طور پر رشیدہ کا ہاتھ گیئر پر جا پڑا۔ اور کار کی رفتار کم ہو گئی۔
”کیا کر رہی ہو۔“ جعفری غرایا اور رشیدہ کو رفتار پھر تیز کر دینی پڑی۔ جعفری پھر بولا
”بہت ڈر پوک ہوتا تھا۔“

”مجھے کشت و خون سے دلچسپی نہیں۔“ رشیدہ نے کہا۔
”تو کیا میں خونی ہوں۔“ جعفری بگز کر بولا۔
”جی نہیں۔“ رشیدہ نے جلدی سے کہا۔

جعفری پھر انگلی سیٹ پر آمدیا اور کار ڈرائیور کرنے لگا۔
”مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم پہلے کسی زمانہ میں پولیس سے مل کر کام کیا کرتی تھیں۔ اب بھی
کرتی ہو یا نہیں۔“ جعفری اس کی طرف گھورتے ہوئے بولا۔

”حالات پر منحصر ہے۔“ رشیدہ نے بے پرواہی سے کہا لیکن اس کا دل پھر دھڑکنے لگا۔
”اوور تمہارا شوہر ہے۔“

”نہیں صرف دوست ہے۔“

”بڑے کام کا۔... آدی ہے اگر اسے بھی میرے ہی فرم میں لے آؤ تو کیا حرج ہے۔“
”ہرگز نہیں۔ بلکہ میں آپ سے یہ استدعا کروں گی کہ میری تنواہ میں اضافے کا علم اُنے
ہونے پائے۔“

”کیوں....؟“

295
”میرے زیادہ تر روپے وہی ہضم کر لیتا ہے اور اب تو مجھے اس سے کچھ کچھ نفرت کی ہو چلی ہے۔
ڈسائر کے دفتر والی رقم دراصل اسی پر صرف ہوئی تھی۔ اس سورنے میری ذرا بھی مدمنہ کی۔“

”تو تم اس سے الگ ہونا چاہتی ہو۔“

”میں تو چاہتی ہوں لیکن وہ میرا بیچھانہ چھوڑے گا۔“

”اور اگر میں چھڑاؤں تو۔“

”عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔“

”اچھا میں کوشش کروں گا۔ ویسے وہ سو فیصدی پولیس کا پھوٹ ہے۔“

”ایسا تو نہیں.... وہ پولیس والوں سے رقم اینٹھنا خوب جانتا ہے۔ انہیں اس بڑی طرح بیک
بل کرتا ہے کہ خدا کی پناہ۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ جعفری نے کہا اور کاری کی رفتار مت ہو گئی۔ تھوڑی دور چل کر ایک
پکر راستے پر مڑی اور شاید آیکت یا ڈریٹھ فرائیں کی مسافت طے کرنے کے بعد رک گئی۔ جعفری
زپڑ رشیدہ بھی اتری لیکن سہی سہی سی نظروں سے اندر ہیرے میں گھور رہی تھی۔ یہاں
پاروں طرف جھاڑیاں ہی جھاڑیاں نظر آرہی تھیں اور سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا جس کی
لڑکیوں سے زرد رنگ کی ہلکی روشنی چھپنے رہی تھی۔ دونوں مکان میں داخل ہوئے اور جعفری
نے دروازہ بند کر کے ایک دھنعتاک قہقهہ لگایا۔

رشیدہ سہم کر پچھے ہٹ گئی۔ جعفری کی آنکھیں حدود رجہ بھیاںک نظر آنے لگی تھیں۔
”کیوں چڑھیا۔“ اس کی غراہت بلند ہو گئی۔ ”تو ایک بھیڑی یے کو راستہ دکھانے کی کوشش
لڑی تھی۔“

رشیدہ جیچ مار کر ایک صوفے پر گر گئی۔

جعفری نے پھر ایک قہقهہ لگایا لیکن یہ قہقهہ معنوی اعتبار سے قہقهہ ہرگز نہیں تھا۔ ایسا
علوم ہوا جیسے کوئی شیر دھاڑ کر رہ گیا ہو۔

رشیدہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے پڑی تھی۔

”فریدی ہی نے بھیجا تھا تجھے۔“

”نہیں.... نہیں.... یہ جھوٹ ہے۔“ رشیدہ خوفزدہ آواز میں چیختی۔

”مجھے جھوٹا کہتی ہے۔“
”ہاں...؟“
”کیا...؟“
”نہیں نہیں...!“

”تیرے جنم کا ایک ایک ریشدہ الگ کر دوں گا اور کسی کو کانوں کاں تک خبر نہ ہوگی۔“
رشیدہ کچھ بولی اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس پر غشی طاری ہو رہی ہو۔
” بتاؤ! فریدی کہاں ہے؟“ جعفری نے اس کی گردن ٹوٹے ہوئے کہا اور پھر اس کی اگر
خت ہو گئی۔

” بتاتی ہوں۔“ رشیدہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی اور جعفری نے اس کی گردن چھوڑ دی
”میں نہیں جانتی۔“ اس نے اپنی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”پانی... پانی۔“
”تم نہیں جانتی۔“

”ہاں اس نے مجھے ایک خط کے ذریعے آپ کے بیہاں ملازمت کرنے کا مشورہ دیا تھا،“
”اور تم نے ملازم ہوتے ہی انہا کام شروع کر دیا۔ کیوں کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ شہر میں جتنے
قتل ہوئے ہیں ان میں میرا ہاتھ ہے۔“
”یہ میں نہیں جانتی۔ اس نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں ہوشیاری سے سب کچھ دیکھتی ادا
رہوں۔“

” تمہارے علاوہ اور بھی کوئی ہے۔“
”میں نہیں جانتی۔“

” نہ صرف انور بلکہ حمید اور اس کے دوسرے ساتھی بھی اس کے لئے سرگردان تھے۔ البتہ
فریدی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اب تو حمید کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے؟ حمید کو یقین کامل تھا
کہ رشیدہ کو جعفری ہی نے غائب کیا ہے کیونکہ اس نے ان دونوں کو وقوعِ ولی رات کو آر لکھو
میں ساتھ دیکھا تھا۔ اسے اب رہہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ان دونوں پر نظر کیوں نہ رکھی۔
اس دوران میں بھی کئی حداثات رومنا ہوئے تھے۔ ذی۔ آئی۔ جی کی ہدایت کے مطابق ذاکر
ناگ نے اپنادیکی بغلہ خالی کر دیا تھا اور ذی۔ آئی۔ جی نے اس کی مگرانی کرنے کے لئے محکمہ
سراغ رسانی کے دوناں پکڑ مقرر کر دیئے تھے لیکن دوسری صبح ان دونوں کی لاشیں ملیں۔ اُن کے

” ہوئے تھے... اور.... وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔“
” تمہارے حماقی۔“ وہ گرج کو بولا۔ ”لیکن دیکھنا ہے کہ وہ تمہیں بیہاں سے کس طرح لے
بائکے ہیں۔ پولیس.... ہوں.... پولیس میرے نزدیک بے جان کھلوتا ہے، جس کی اسپر لگ
ب چاہوں توڑ دوں۔ تلاشی میں کیا ملا تھا انہیں اور تم نے کیا دیکھا تھا... پہنچے....!“

گرفتاری اور فرار

سر بڑی بے دردی سے کچلے گئے تھے اور لاشیں راستے پر ڈال دی گئی تھیں اسی رات کو ڈاکٹر نام کے پر ایک بار پھر حملہ ہوا۔ اس کے بیان کے مطابق جب وہ رات کا کھانا کھا کر پائیں باعث میں ٹھیک تھا تو کسی نے اس پر چھرے سے حملہ کیا اور اس کا دہنا بازو زخمی ہو گیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا اس نے بتایا کہ وہ حملہ آور کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اگر وہ لڑنے پر آمادہ نہ ہو گیا ہو تو حملہ اور دوسرا دار ضرور کرتا۔ اس کے نوکروں نے اس کی جیخ سن تھی۔

ان حادثات کے بعد ڈاکٹر نارنگ کے دیہی بیگنے اور شہری رہائش گاہ پر مسلح پولیس کا پورہ دیا گیا۔ لیکن ایک رات بیگنے کے پہرے داروں پر کسی نامعلوم آدمی نے دیسی بم پیچکے تیج کے طور پر ایک ہلاک ہو گیا اور تین کے گھرے زخم آئے۔ البتہ اس کی شہری رہائش گاہ پر پھر کوئی حادثہ نہیں ہوا۔

اب تو ڈی۔ آئی۔ جی کو بھی فریدی پر تاؤ آنے لگا تھا۔ مکملہ سراغ رسانی پر چاروں طرز سے بوچھاڑیں ہو رہی تھیں۔ حکومت نے پورے ملک کے بہترین دماغ ایک جگہ آنکھا کردیئے تھے لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ پھر یہ خبر بھی گشت کرنے لگی تھی کہ حکومت عنقریب برطانوی حکومت سے استدعا کر کے اسکات لینڈیارڈ کے نامور جاسوسوں کی خدمات حاصل کرنے والی ہے۔ ڈی۔ آئی۔ جی اپنے آفس میں بیٹھا بڑی طرح کھوں رہا تھا کہ چہرا اسی نے ایک کارڈ لا کر پیڑ کیا۔ ڈی۔ آئی۔ جی پیشانی پر شکنیں ڈالے اس کارڈ کو چند لمحے گھوٹا رہا پھر جنملائی ہوئی آواز میر بولا۔ ”آنے دو۔“

نیا ستار کا رام رپورٹ انور سعید جلت ہٹا کر اندر داشل ہوا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے مضطربانہ انداز میں کہا جس میں جھنجلاہٹ بھی شامل تھی۔ ”وہ لڑکی ملی یا نہیں۔“

”وہ تو نہیں ملی۔“ انور نے کہا۔ ”لیکن اس کا سراغ معمہ ثبوت مل گیا ہے۔“

”یعنی....!“ ڈی۔ آئی۔ جی نے گھوڑتے ہوئے پوچھا۔

انور نے جیب سے ایک تصویر نکال کر اس کی میز پر رکھ دی۔

”یہ کیا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس پر جھکتا ہوا اپلا پھر سیدھا ہو کر انور کو گھوڑے نے لگا۔ انور کچھ نہ بولا۔

”بولنے کیوں نہیں، یہ کون ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے جھنجلا کر پوچھا۔

”جیس ایڈ جعفری کا جزل میجر جعفری۔۔۔ اور دوسرا رشیدہ ہے۔“
”اوہ....!“ ڈی۔ آئی۔ جی کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”اور غالباً یہی مشر کیوں ہے۔“ انور بولا۔ ”اُسے کسی طرح علم ہو گیا کہ رشیدہ کو فریدی صاحب نے اس کی فرم میں ملازمت کرنے کی ترغیب دی تھی لہذا اس نے اُسے غائب کر دیا اور اس کی چالاکیوں سے تو آپ واقعت ہی ہوں گے کہ اس نے کس طرح پولیس پر ازالہ حیثیت ہی درج کر دی ہے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی اس تصویر کو بر ابر گھوڑے جا رہا تھا۔ یہ جعفری اور رشیدہ کی تصویر تھی جس میں رشیدہ کے دونوں ہاتھ اس کی پشت پر باندھ رہا تھا۔
”تمہیں یہ ملی کہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ایک خط کے ساتھ فریدی صاحب کی طرف سے موصول ہوئی ہے۔“

”فریدی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی چوک کر بولا۔ ”وہ ہے کہاں.... خطاو۔“

”پتہ نہیں.... وہ کہاں ہیں۔“ انور جیب سے خط نکالتا ہوا بولا۔ ”وستی خط.... آر لکھو کے پتہ سے ملا تھا۔“

کاغذ پر صرف دو سطریں تحریر تھیں۔

”تصویر بھیج رہا ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم صحیح نتیجہ پر پہنچو گے اُسے ڈی۔ آئی۔ جی صاحب کے پاس لے جاؤ۔۔۔“

”مالی گاڑ...!“ ڈی۔ آئی۔ جی حرمت سے بولا۔ ”تو یہی شخص مشر کیوں ہے۔“

”میرا تو یہی خیال ہے۔“ انور نے کہا۔

”چھا تو تم جاؤ۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ”خبر میں اس کے متعلق کچھ نہیں آنا چاہئے۔“

”بہتر ہے۔“ انور نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

دوسری الحجہ ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے انتہائی بیجان آفریں تھا۔ وہ خط اور تصویر لئے ہوئے

اُنل۔ جی کے دفتر کی طرف لپکا۔

پھر آدھے گھنے کے اندر ہی اندر جیس ایڈ جعفری کے دفتر کا محاصرہ کر لیا گیا۔ کسی کو سانس

لینے کی مہلت بھی نہ ملی لیکن خود جعفری کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پولیس نے عمارت کا گوشہ گوشہ پچال
مار۔ جعفری کے کمرے والا تھہ خانہ بھی دیکھا گیا لیکن لا حاصل... دفتر کا سارا عملہ حراثت میں
لے لیا گیا۔ ذی۔ آئی۔ جی کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے منہ پر تھپٹ مارے۔ جلدی میں اس نے ایک
زبردست غلطی کی تھی۔ محاصرے سے پہلے اسے معلوم کر لینا چاہئے تھا کہ جعفری دفتر میں موجود
بھی ہے یا نہیں۔ آئی۔ جی بھی اس کے سر الزام تھوپ رہا تھا۔ حالانکہ وہ خود بھی عقل رکھتا تھا
اس کش کش کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند لمحوں کے بعد وہ دونوں ہی متفقہ طور پر فریدی کو نہ اچھلا کر
رہے تھے۔

”کیا حماقت کی ہے اس لوٹے نے خود کو نہ جانے کیا سمجھ رکھا ہے۔“ آئی۔ جی بولا۔
”میں خود بھی یہی سورج رہا تھا۔ آخر اس کراہم روپرڑ کو تصویر بھینی کی کیا ضرورت تھی۔
ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔ ”خود آرائی کا نتیجہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔“

”بہت ہو چکا۔“ آئی۔ جی پھنکارا۔ ”پانی سر سے اوچا ہو چکا ہے۔ میں آج ہی اسے معطل کر
ہوں اور ساتھ ہی اس کی گرفتاری کا وارثت بھی جاری کراؤں گا۔ بہت سرچ چھالیا گیا ہے۔ میں کم
یہ آدمی کا وجود اپنے محلے میں برداشت نہیں کر سکتا جوڑ سپلن برقرار رکھ سکے۔“

ڈی۔ آئی۔ جی کچھ کہنے ہی جارہا تھا کہ میں فون کی گھنٹی بھی۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے رسیور اڑ
لیا۔ چند لمحے نہ اسامنے بنائے ہوئے ستارہ پھر ایک طیل ”اچھا“ کے ساتھ رسیور پیش دیا۔
آئی۔ جی سوالیہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”یہ تو جان ہی کو آگیا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی برو بولایا۔
”کون....؟“ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”ڈاکٹر نارنگ... اب نہ جانے کون سی آفت ٹوٹی ہے کہ بلارہا ہے۔“
”ابھی کیا ہے! یہ سارے لیڈر ناطقہ بند کر دیں گے۔ فریدی کے لوٹاپن کی وجہ سے بنا:
کھیل گر گیا۔“

ڈی۔ آئی۔ جی دو انپکڑوں کے ساتھ ڈاکٹر نارنگ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر نارنگ برآمدے میں کھڑا پائیں باغ میں پھیلے ہوئے کوئتوں کے لئے دانہ ڈال رہا تھا۔
”فرمائیے۔“ میں آج بہت مشغول ہوں۔ ڈی۔ آئی۔ جی اس کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔“

”میں نہیں سمجھا!“ ڈاکٹر نارنگ نے جھرت سے کہا۔
”آپ نے فون کیا تھا مجھے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھنگلا کر بولا۔
”میں نے... نہیں تو۔“

”پچھے سمجھ میں نہیں آتا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے بھی سے بولا۔ ”وہ مشر کیوں بھی ہاتھ آتے
تھے وہ گیا۔“

”میا کیسے... یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر چلتے۔“ ڈاکٹر نارنگ بولا۔
وہ لوگ ملا قاتی کمرے میں آکر بیٹھ گئے۔

”میں مشر کیوں شخصیت ظاہر ہو گئی۔“ ڈاکٹر نارنگ نے پوچھا۔

”جی ہاں! لیکن اسے فی الحال اپنے ہی تک مدد و درکھنے گا۔ سردوست تو وہ تک بھی گیا ہے۔
ن زیادہ دیر تک نہ فتح کے گا۔ سارے ملک میں واٹر لس کے ذریعہ اس کا حلیہ جاری کر دیا گیا ہے۔“

”کون ہے وہ؟“

”جیس ایڈ جعفری کا جہزل شیخ جعفری۔“ ڈی۔ آئی۔ بولا۔

قبل اس کے کہ ڈاکٹر نارنگ کچھ کہتا کمرے کے ایک گوشے میں غراہٹ سی سائی دی۔

”جعفری حاضر ہے۔“

”وہ سب چوک کر مڑے۔“

جعفری ایک دروازے میں کھڑا انہیں کی طرف تھا۔ وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔
اور تھا۔ جس کارخ انہیں کی طرف تھا۔ وہ چاروں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔

”کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے۔“ جعفری غریا۔ ”مشر کیوں پر ہاتھ ڈالنا آسان کام
مل۔“ ڈی۔ آئی۔ جی صاحب۔“

ایسا معلوم ہوا تھا جیسے سہوں کو سانپ سو گھنگیا ہو۔ البتہ ڈاکٹر نارنگ کے ہونٹوں پر عجیب
رس کی مسکراہٹ تھی۔ جعفری نے پتوں کی جب میں ہاتھ ڈال کر ہتھریوں کا جوڑا نکالا اور

سے ایک انپکڑ کی طرف اچھاتا ہوا بولا۔ ”اب پنے ڈی۔ آئی۔ جی اور ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھوں میں
اوو.... چلو.... جلدی کرو۔“

انپکڑ نے طوغاو کرہا ایک ہتھری ڈی۔ آئی۔ جی کے اور دوسرا ڈاکٹر نارنگ کے ہاتھ میں

بائیم روڑ پر نکلیں گے۔ موڑوں کے کارخانے کے پاس۔ گھبرا یئے نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بیں گیا ہو گا۔ موڑوں کا کارخانہ اسی کا ہے۔ اس نے دہاں سے ایک موڑلی ہو گی اور سیدھا سارگ ن گیا ہو گا۔ فریدی نے کہا۔

”مجھے تواب بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ مسٹر کیو ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔
”اس سرگ میں دوڑتے وقت بھی نہیں۔“ فریدی کے لجھ میں تمشیر تھا۔ آئی۔ جی کچھ نہ بولا۔
”آخر تا ادھم مچانے کی کیا ضرورت تھی۔“ ایک انپکٹر بولا۔

”اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا۔“ فریدی بولا۔ ”ذرار قمار اور تیز کجھنے۔“
توہوڑی دیر بعد انہیں روشنی دکھائی دی۔ پھر تین زینوں پر نظر پڑی دوسرے لمحے میں وہ باہر
ایک برا سا پتھر ایک طرف پڑا تھا جو غالباً ڈاکٹر نارنگ کے نکلنے سے پہلے سرگ کے دہانے پر
ارہا ہو گا۔ چاروں طرف کروندے کی کامنے دار اور بے ترتیب جھاڑیاں بکھری ہوئی تھیں۔
لے نے بروقت تمام راستہ بیانا اور باہر نکلے۔ سڑک زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے جزل
گیراج تک آئے۔ کم از کم ڈی۔ آئی۔ جی کے لئے تو یہ نئی اطلاع تھی کہ وہ گیراج ڈاکٹر نارنگ
لی ملکیت تھا۔ گیراج کا منتظم باہر ہی مل گیا۔

”ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔“ فریدی نے اس سے پوچھا۔
”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔

”تھا ہی تھے۔“ فریدی گھبرائے ہوئے لجھ میں بولا۔ گیراج کا منتظم دونوں انپکٹر وں کو
تے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ انہوں نے روپ اور کار تو سوں کی پیشیاں لگا رکھی تھیں۔ منتظم نے
بیٹھنے والی دیوار سے دیکھ رہا تھا۔

”اُف فود۔“ فریدی نے بے چینی سے کہا۔ ”انہیں منع کیا گیا تھا کہ تھا باہر نہ نکلیں۔ کتنا
ہے ان کے لئے... کدر گئے۔“
”ایک کار لے کر اوھر گئے ہیں۔“ منتظم نے ایک طرف اشارہ کیا۔
”کوئی اور گاڑی فال تو ہے۔“

”جی ہاں ہے۔“

”ونون بھی ہے یہاں.... اچھا ذرا گاڑی جلدی سے نکلوایے۔ ان کی جان کو خطرہ ہے۔“

ذال دی۔ دوسرے سب انپکٹر کا ہاتھ جیب کی طرف جاہی رہا تھا کہ جعفری نے اسے لالا
”خبردار میں سر سے پیر تک آنکھیں ہی آنکھیں رکھتا ہوں۔“

”یہ کیا الغوریت ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جھلا کر چینا۔

”سر کار ناراض نہ ہوں۔“ جعفری قدرے جھک کر بولا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کے پر پڑا
اس نے اپنے بال مٹھی میں جکڑے اور ایک جھر اناسا مارا۔ بالوں کے ساتھ چہرے کی کھال بھر
اتری چل گئی اور جب وہ سیدھا ہوا تو ڈی۔ آئی۔ جی اور دونوں انپکٹر بے ساختہ چیز پڑے۔ ”فریدی دی
وختنا ڈاکٹر نارنگ ڈی۔ آئی۔ جی پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں کے دہانے اور باکس ہاتھ ایک سارا
جکڑے ہوئے تھے اور دوسرے داکسیں آزاد تھے۔ دونوں ایک ساتھ زمین پر آ رہے۔ قما
اس کے کہ وہ لوگ سنبھلتے ڈاکٹر نارنگ اٹھ کر بجا گا۔ پہنچنے اس نے کس طرح اپنا ہاتھ جھکھڑ
سے نکال لیا تھا۔ جھکھڑی بدستور بند تھی۔ فریدی ڈاکٹر نارنگ کے پیچھے دوڑا۔ اس کے پیچھے
تینوں بھی بجا گے۔ وہ سارے کروں میں ناچتے پھر رہے تھے اور ڈاکٹر نارنگ کا کہیں پتہ نہ تھا۔
”میں بھی شاید پاگل ہو گیا ہوں۔“ فریدی نے کہا اور ایک سمت دوڑنے لگا۔ ایک کرنے پ
پہنچ کر وہ ایک لحظہ کے لئے رکا۔ یہاں ایک میز الٹی پڑی تھی غالباً وہ دیوار سے لگی رہی ہو گی۔

”یہ جھکھڑی لو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اپنے ہاتھ میں جھوٹی ہوئی جھکھڑی کی طرف دیکھ
کرہا۔ ایک انپکٹر نے آگے بڑھ کر جھکھڑی نکال دی۔
فریدی دیوار سے لگے ہوئے ایک ایک ریک پر زور آزمائی کر رہا تھا۔ وختا ریک اپنی جگہ
کھک کر ایک طرف ہو گیا۔ سامنے دروازہ تھا وہ چاروں دیوان و ار اندر گئے۔

”براغط طریقہ تھا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بڑا دیوار ہاتھا۔

”جناب والا۔“ فریدی نے مڑے بغیر کہا۔ ”آپ حاضرہ کر کے تو اسے پکڑی ہی نہیں
تھے۔ اس عمارت کے نیچے سر گنوں اور تہہ خانوں کا جاں بچتا ہوا ہے۔ گھبرا یئے نہیں! میں جا
ہوں کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔“

وہ ایک کشادہ سرگ میں دوڑ رہے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن
کے دم گھٹ رہے تھے۔ سرگ تاریک اور متعفن تھا۔

”لیکن سن تو سہی۔“ ڈی۔ آئی۔ جی ہانپتا ہوا بولا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

«ناریا پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہو گی۔» فریدی نے رفتار کم کرتے ہوئے کہا۔
«لیکن تم نے فون پر! اف فوہ... بڑی غلطی کی۔» ذی۔ آئی۔ جی بے چینی سے پیشانی
کرنے لگا۔

«جی.... کیسی غلطی۔»
«تم نے انہیں یہ نہیں بتایا کہ تارنگ کی مسٹر کیوں ہے۔ اگر وہ انہیں دھوکہ دے کر نکل گیا تو۔»
«مجھے یقین ہے کہ اگر وہاں پولیس پہنچ بھی گئی ہو گی تو ابھی شاید ہی عدالت میں داخل ہو سکی ہو۔»
«کیوں؟»

«وہاں مسٹر کیوں کے سامنے ستر آدمی رہتے ہیں اور ڈاکٹر تارنگ کا ذہنی توازن فی الحال بگزگیا
ہے ورنہ وہ اس طرح نہ بھاگتا۔ ظاہر ہے کہ وہ اتنا محظاۃ آدمی تھا۔ خود اس کے آدمیوں کو اس کا علم
نہیں کہ مسٹر کیوں کوں ہے۔ اس نے ہر طرح اپنی مضبوطی کر رکھی تھی۔ اگر وہ اس طرح نہ بھاگتا تو
اسے مجرم ثابت کرنے میں مجھے دانتوں پسینہ آ جاتا اور میں نے یہ ذرا مائی انداز مخفی اس لئے
اقبال کیا تھا کہ اسے اچاک ذہنی طور پر انتشار میں بنتا کر دوں اور وہ گرفتاری کے وقت رو عمل
کے طور پر کوئی اضطراری حرکت کر پڑھئے مگر مجھے اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بند چھکڑی سے
اتھنکال لے گا۔

«واقعی تم اس سے بھی زیادہ بھیکن ہو۔» ذی۔ آئی۔ جی فریدی کا شانہ تھکتا ہوا بولا۔ «اگر
خدا خواستہ کہیں تم بھی غیر قانونی راستوں پر نکل گئے ہوتے تو ہم لوگوں کے لئے ایک مستقل ذرود
رو جاتے۔»

فریدی ہنسنے لگا۔ وغناہس نے کار کی رفتار بالکل کم کر دی اور ذی۔ آئی۔ جی کی طرف دیکھ کر
آہستہ سے بولا۔ «سن رہے ہیں آپ۔»

«ارے! یہ تو مشین گنوں کی آوازیں ہیں۔» ذی۔ آئی۔ جی نے اچھل کر کہا۔
«وہ دیکھئے۔» فریدی نے سامنے اشارہ کیا۔ سڑک سنان پڑی۔ تھی اور ساگر میشن سے
چاروں طرف گولیاں برس رہی تھیں۔ پولیس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

فریدی نے بڑی پھرتی سے کار بیک کی۔ اگر وہ دوڑھائی سو گز اور آگے بڑھ گئے ہوتے تو کار
کو گلوں کی زد پر آ جاتی۔ فریدی نے کار کو الگی الگی میں موڑ دیا۔ ساگر میشن مقابلہ سمت کی لائن میں

فریدی مظہر باہر انداز میں ہاتھ ملٹا گا۔

«فون ہے! آئیے۔» منتظم گھبرا گیا تھا۔ فریدی نے فون پر ہاتھ ڈالا۔

«ہیلو... کو تو اولی... ذی۔ آئی۔ جی آف انٹلی جنس اسیکنگ... ساگر میشن کا حاضرہ فر
کر لیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ آدمیوں سمیت... فوراً... جلدی۔»
رسیور رکھ کر فریدی باہر بھاگ۔ کار باہر کھڑی تھی۔ اس نے جھپٹ کر اسٹرینگ سنھالا اور
اس کے ساتھی بھی بیٹھ گئے۔ کار تیزی سے بیلی روڑ کی طرف مڑی اور دونوں انپکڑوں کے
ایک دوسرے سے ٹکرائے۔

لاشوں کی بارش

«اُف فوہ! کتابے وقف بنے ہیں ہم لوگ... اس کی گرفتاری کے بعد بھی شاید کسی
مشکل ہی سے یقین آئے کہ وہ خود ہی مسٹر کیوں ہے۔» ذی۔ آئی۔ جی نے کہا۔
«میرے پاس بیوتوں کا انبار عظیم ہے۔» فریدی نے لاپرواں سے کہا۔
«حید کہاں ہے۔»

«پتہ نہیں! ہو گا کہیں۔» فریدی بولا۔ «اس بار میں نے انہیں بھی دھوکے میں رکھا۔
جنہیں خود ہی کام پر لگایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے خاموشی رہی پھر فریدی نے کہا۔
«حید تک کو اس کا علم نہیں کہ مسٹر کیوں کوں ہے۔ وہاب بھی جعفری کی تلاش میں ہو گا۔
لیکن... کیوں؟»

«اطینان سے عرض کروں گا۔ فی الحال تو میں بھی امید و ہم کی حالت میں ہوں۔»
«اگر نکل گیا تو بہت نہ ہو گا۔»

«ساگر میشن کے علاوہ اور کہیں نہیں جا سکتا۔» فریدی نے کہا۔
«یقین کی کوئی وجہ۔»

«ہیڈ کوارٹروہی ہے پانچ دنوں سے متواتر میں اسی پچر میں رہا ہوں اور یقین واٹھ ہو جانا
آن اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔ اُف فوہ! آج تو یہ فاصلہ کی طرح کم ہی نہیں ہو رہا ہے۔»
«دیکھو رفتار کم کرو۔ ہم شہر کے آباد حصے میں داخل ہو رہے ہیں۔»

تھی۔ گلی کے اندر سبھے ہوئے آدمیوں کا بجوم تھا اور پولیس والے بھی سرا سینگھ کا ھارکر یا دوہرے کی شکلیں دیکھ رہے تھے۔ فریدی کا رروک کر کوڈ پڑا۔ وہ سب بھی اترے، اور بھرپور میں گھستے چلے گئے۔

آگے چل کر ایں۔ پی سے ٹھبھیر ہو گئی۔ وہ ڈی۔ آئی۔ جی کی طرف چھپا۔

”ہمارے آنے سے قبل ہی گولیوں کی بادش ہو رہی تھی۔“ وہ گھر لے ہوئے لمحے میں بولا۔ ”میرے خدا نے جانے کتنی لاشیں ساگر میشن کے سامنے پڑی ہیں... اور... آئیے میرے ساتھ کوئی۔ ایس۔ پی انہیں لے کر ایک عمارت میں داخل ہو گیا۔ اوپری منزل پر پہنچ کر اس نے ایک کمرے کے روشنداں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سب روشندانوں سے جھاکنے لگئے۔ یہ عمارت ٹھیک ساگر میشن کے سامنے تھی اور یہ لوگ اس کے عقبی راستے سے داخل ہوئے تھے۔

روشندانوں سے آنکھیں لگاتے ہی فریدی اور اس کے ساتھیوں کے منہ سے بیک وقت ”ارے“ نکل گیا۔ گولیاں ساگر میشن کے ان نتوں سے نکل رہی تھیں جو غالباً بارش کا پانی نئے کے لئے لگائے گئے تھے۔ ایک ایک فٹ باہر لٹکے ہوئے ہیں جن کا جھکاؤ غالباً پچھر ڈگری کے زاویے سے سڑک کی طرف تھا۔

”ایسے ہی تھے۔“ اس۔ پی بولا۔ ”پوری عمارت میں چاروں طرف لگے ہوئے ہیں۔ غالباً چوڑھی سمت بھی گولیاں بر سر رہی ہوں گی۔“ ساگر میشن کے ٹھیک نیچے فٹ پا تھے پر لاشوں کے ڈھیر تھے۔

”مگر وہ لاشیں۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔ ”وہ تو گولیوں کی زد میں نہیں۔ وہاں ان کا ڈھیر کیا معمی رکھتا ہے۔“

”اور.... اف۔“ عمارت کا ایک مکین آگے بڑھ کر ہاتھا ہوا بولا۔ ”مجھ سے پوچھئے... میرے خدا.... میرے حواس درست نہیں۔ وہ لاشیں ساگر میشن بھی سے گری ہیں۔ لاشوں کا آبشار.... خدا کی قسم.... لاشوں کا آبشار۔ وہ اس طرح گر رہی تھیں جیسے بادش ہو رہی ہوں۔ سب سے پہلے لاشیں گریں اور پھر.... ان نتوں سے گولیاں نکلے گیں۔ میرا بھائی.... ہائے کہیں۔“ بھی.... نہ مارا گیا ہو.... میرے خدا.... اس کا کچھ پتہ نہیں۔“

وہ خاموش ہو کر اٹھ پا کیں دوڑتا ہوا نیچے چلا گیا۔ گولیاں برادر سے جا رہی تھیں۔ فریدی نے ایک بار پھر فٹ پا تھوں پر پڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھا اور نیچے اتر آیا۔ ”تو اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی مٹھکانے لگا دیا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”اب کیا کیا جائے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی پا گلوں کی طرح آنکھیں نکال کر بولا۔ ”ون..... یہاں اس عمارت میں کوئی فون ہے۔“ فریدی ایس۔ پی کی طرف مڑا۔ ”وہ تو ہو گا ہی! ایسے بتائیے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ ڈی۔ آئی۔ پی نے کہا۔ ”مشر کیوں۔“ فریدی مضطربانہ انداز میں بولا۔ ”وہ اس عمارت میں موجود ہے۔“ ایسا معلوم ہوا جیسے ایس۔ پی پر بیم گر پڑا ہو۔ وہ حرث سے منہ اور آنکھیں چھاڑے کھڑا رہا۔ ”کیوں بھی، اون ہے یہاں۔“ فریدی ایک آدمی کی طرف مڑا جو غالباً اسی عمارت کا کوئی فرد تھا۔ ”جی ہاں! آئیے میرے ساتھ۔“ وہ دونوں تیزی سے اترے۔ دوسرے لمحے میں فریدی کی انگلی ٹیکی فون کے ڈائیل پر چل ہی تھی۔ اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ ”بیلو... بیلو۔“ جواب میں ایک خوفزدہ سی نوانی آواز سنائی دی۔ ”ڈاکٹر نارنگ سے کہو۔“ فریدی گرجا۔ ”کب تک گولیاں چلیں گی۔“ ساگر میشن کا ایک نہ زندہ نہ پچے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ساگر میشن ایک سیدھی سادی کی عمارت ہے۔“ ”وہ پاگل ہو گیا ہے۔“ کھٹی گھٹی سی آواز آئی۔ ”مجھے بچاؤ... میں ایک کرنے میں پھنسی پڑی دل۔ دروازے پر ایک بڑی وزنی الماری آگری ہے۔ میں اسے ہٹانہیں پا رہی ہوں۔ مجھے بچائیے۔“ ”تم کون ہو؟“ فریدی نے حرث سے پوچھا۔ ”ایک بے بس بٹوکی۔ اسے نہیں معلوم کہ میں زندہ نہ گی ہوں۔ ورنہ وہ مجھے بھی نہ بھوڑے گا.... بچاؤ۔“ ”کیا ہد تھا ہے۔“ ”ہاں.... اس نے سکھوں کو مار ڈالا ہے اور اب ایک مرکزی مشین پر بیٹھا ساری مشین توں کو نزول کر رہا ہے۔ خدار کسی طرح آئے۔ وہ پاگل ہو گیا ہے میں نہیں جانتی کہ اس کا اس مقام سے کیا تعلق ہے۔“

”وہ.... وہی تمہارا مسٹر کیو ہے۔ تم کنول تو نہیں۔“

”جی ہاں.... جی ہاں.... آپ کون ہیں.... کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”فریدی.... چپ چاپ پڑی رہو۔ وہ کس کمرے میں ہے۔“

”لا بیری کے قریب والے میں جس میں مشینیں فٹ ہیں۔ فریدی صاحب خدا کے لئے مجھے بچائیے۔ اس نے سب کو مارڈالا نادراہ.... کرٹل کی بہن کو بھی۔“

”لیکن.... اس نے تھا۔ ان سکھوں کو کس طرح مارڈالا۔“

”اوہ.... بڑے خوفناک طریقے سے۔ اس نے عمارت میں داخل ہوتے ہی سکھوں کو اکو

کیا اور کہا کہ مسٹر کیو کا حکم ہے کہ تم سب اور چلو۔ پھر اس نے ان سکھوں کو اور پری منزل پر سا جا کر چھت کے سرے پر کھڑا کیا۔ خدا کی پناہ میں بھی انہیں میں تھی۔ پھر اچانک اس نے ایک برین گن اٹھائی اور گولیاں بر سانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں خون تھا اور وہ اندر ہا ہو رہا تھا۔ میں کوئی نہ کسی طرح نکل گئی اور اب میں اس کمرے میں۔ پھنسی ہوئی گولیوں کی آوازیں سن رہی ہوں۔ خ

کے لئے جلد پہنچو۔“

”اچھا لڑکی۔“ فریدی ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”چپ چاپ پڑی رہو۔ میں آر ہوں۔“ وہ رسیور رکھ کر جانے کے لئے مڑا۔

”ڈی۔ آئی۔ جی وغیرہ بھی اُسی کمرے میں آگئے تھے۔“

”کیسے جاؤ گے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے پوچھا۔

”جس طرح بھی بن پڑے گا۔ جانا تو ہے ہی۔ وہ تھا ہے اور ایک مشین کے ذمہ لا بندوقوں کو کنٹرول کر رہا ہے۔“

”نہیں.... اس حالت میں.... بھلا میں کیسے جانے دوں گا۔ اب میرے خیال سے ات تھکنے ہی دو۔ لوگ ہوشیدار ہو گئے ہیں اور اب کسی کے مر نے کامکان نہیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”وہاں ایک زندگی خطرے میں ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس سے ہمیں تھوڑی بہت مدد بھی نہ ہے۔ میں اُسے اس کے رحم و کرم پر کسی طرح نہیں چھوڑ سکتا۔“

”پاگل نہ بنو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی اس کا بازو پکڑتا ہوا بولا۔

”میں آپ کا حکم نہ مانتے پر مجبور ہوں۔“ فریدی نے پلٹ کر اُسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بہل۔ جی کی گرفت ڈھیل پڑ گئی اُسے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کسی پاگل کی دیری ان آنکھیں رہیں۔ بے حس اور خوفناک۔ فریدی ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھا۔ لیکن اسی پی دروازے میں حائل ہیا تھا۔

”براؤ کرم ہٹ جائیے۔ وہاں تک پہنچا کچھ مشکل کام نہیں۔ تھوڑی سی ہمت کی ضرورت میں جانتا ہوں کہ وہ کس کمرے میں ہے۔ عمارت میری دیکھی ہوئی ہے۔ وہ بس اندر ہوں اور دل کی طرح گولیاں بر سارا ہے۔“

”لیکن جاؤ گے کس طرح۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے چینی سے بولا۔

”وہ سارے غل دودو فٹ کے فاصلے پر لگے ہوئے ہیں۔ اگر میں کسی دن لوں کے درمیان میں کوڈ ہن میں رکھ کر چلوں تو گولیوں سے بچ سکتا ہوں۔“

”خطرناک! انتہائی خطرناک... بہرگ نہیں۔“ ڈی۔ آئی۔ جی جیخ کر بولا۔

لیکن اتنی دیر میں فریدی ایس۔ پی کو دھنکا دے کر باہر نکل چکا تھا۔

”پکڑو۔ اسے پکڑو۔ پاگل.... سور۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بے تاباہ اس کے یقینے دوڑا لیکن یہی لگلی میں بھرے ہوئے آدمیوں کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

وہ لوگ پھر کھڑکوں کے قریب آگئے اور پھر انہوں نے فریدی کو یقینے فٹ پا تھھ پر دیکھا۔

لے سے تھوڑے ہی فاصلے پر گولیاں گر گر دو غبار ازاری تھیں۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے اور پرے سے پھر آواز دی لیکن اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی بھی زحمت گوا را نہیں کی۔ اس کی نظریں پاپ بھی ہوئی تھیں اور پھر وہ چل پڑا لوگ چینخے لگے۔ پھر اس نے اتنی تیزی سے سڑک پار کی جیسے

لٹاچک گئی ہو۔ دوسرے فٹ پا تھھ پر یقین کروہ مڑا اور ڈی۔ آئی۔ کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلانے لگا۔

”ہے کوئی اس کی مکر کا۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نہیں پڑا۔ یہ ہنسی عجیب قسم کی تھی۔ کچھ گلو گیری

کیں میں شاید کچھ آنسوؤں کی نمی بھی شامل تھی۔ حقیقتاً اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

”زندہ باد بیٹے! زندہ باد۔“ وہ ہاتھ مل کر بڑھا۔

فریدی نے تغلے سارے دروازوں پر نظریں دوڑا میں لیکن سب کے سب بند تھے۔ تیسری تریل کی ایک کھڑکی کھلی نظر آرہی تھی اور اسی سے ملا ہوا ایک موٹا سا پاپ تھا جو بچے نکل چلا آیا

میں بغل کے نیچے آگیا۔ فریدی کی گرفت سخت ہوتی تھی۔ داشتے ہاتھ سے وہ کنول کو الگ کرنے کو شکر رہا تھا۔ جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے جلا کر نارگ کی گدی پر ایک گھونسہ پید کر دیا۔ اس نے کنول کو چھوڑ دیا اور وہ بے جان کی فرش پر آرہی۔ ڈاکٹر نارگ فریدی کی فتن سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ فریدی کا دوسرا گھونسہ اس کے پیٹ پر پڑا اور وہ بللا دوڑا ہو گیا۔ اس کا سر فریدی کی گرفت سے نکل گیا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ سنجھتا تیرا گھونسہ

لیکی تاک پر پڑا اور وہ کسی مرتبے ہوئے ہمینے کی طرح ذکر کا کرچت ہو گیا۔ دوسرا سے لمحے میں فریدی اس کے میئنے پر سوار تھا اور اس کے نہ رکنے والے ہاتھ نارنگ کے رنگ نہ سوں کی کہاں کا بارش کر رہے تھے۔

پولس آگئی۔ ذی۔ آئی۔ جی ساتھ تھا۔ فریدی نارگ کو چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ نارگ بے ش تھا۔ فریدی کسی شرابی کی طرح لا کھڑا رہتا۔ قمیض تار تار ہو گئی تھی۔ بال کھڑے تھے۔ رے پر کئی جگہ سے خون رس رہا تھا۔ ذی۔ آئی۔ جی نے اُسے یہاڑا دینا چاہا لیکن وہ جھٹ کر بول کے ماس پہنچا جو گے جس و حرکت فرش پر ٹھی ہوئی تھی۔

”یہ ابھی زندہ ہے۔“ فریدی پاگلوں کی طرح حلچ پھاڑ کر چینا۔ ”جلدی کرو۔ اسے ہسپتال لے جاؤ۔ جلدی۔۔۔ بعض کمزور چل رہی ہے۔“
بے ہوش نارنگ کے ہنگڑیاں رگادی گئیں۔ اسے اٹھانے سے پہلے کنوں کو دہاں سے ہٹا دیا گیا۔ فریدی نے فاتحانہ انداز سے نارنگ کی طرف دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل یادوی کے چیرے سے ہوئے خون میں ڈوٹی ہوئی تھی۔

ڈی۔ آئی۔ جی اسے سہارا دیتے ہوئے اینے روپاں سے اسکے چہرے کا خون خشک کر رہا تھا۔

”اے ہسپتال بھجوادیا۔“ فریدی نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں! ہاں! ... تم مطمئن رہو۔ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔“

”درندہ۔“ فریدی نے تارگ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”اور ایک ہاتھی سے بھی زیادہ طاقتور! پتہ میں اور کون کون سی حیوانی قوتیں رکھتا ہے۔ ایک زہر لیے سامپ کی طرح پوٹا نیز بھی کر سکتا ہے۔ کرکٹ کی بہن کو اس نے پینا ٹرم ہی کے اثر میں لے رکھا تھا اور وہ را انقل بھی سیئیں کہیں دو گل۔ وہ بے چاری لڑکی... اس کی لاش بھی سیئیں کہیں ہو گی۔“

تھا۔ فریدی نے اپنے جو تے اتارے کوٹ کی جیب سے ریو الور نکال کر پتلون کی جیب میں ڈالا اور کوٹ بھی اتار کر وہیں فٹ پا تھے پر پھینکا۔ اب وہ اسی پا سپ کو پکڑ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ اسے بد قسمی ہی کہنا چاہئے کہ جب وہ اوپر پہنچ کر کھڑکی میں داخل ہو رہا تھا تو ریو الور اس کی جیب سے نکل کر نیچے فٹ پا تھے پر جا پڑا۔ فریدی نے جھک کر دیکھا اور پھر بُرا سامنہ بنانے کا پروگرام لے لیا ”اوہ نہ ہے جہنم میں جائے۔“

کمرہ خالی تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ پردوں میں جوتے نہیں تھے۔ اس لئے وہ کوئی آواز پیدا کئے نہیں۔ آسانی نقل و حرکت کر رہا تھا۔

عمارت کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ وہ دوسری منزل پر آتی آیا۔ مشین گئیں اب تک چل رہی تھیں۔ لا ببری کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحت کے لئے رکا پھر آہستہ آہستہ اس کمر۔ کی طرف بڑھا جس کا پتہ کتوں نے دیا تھا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نارنگ کی پشت دروازے کی طرف تھی اور وہ جگونانہ انداز میں ایک پیٹے کو تیزی سے گھمائے جا رہا تھا۔ فریدی پنجوں کے چلنا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور پھر یکختن ڈاکٹر نارنگ پر ٹوٹ پڑا۔ ڈاکٹر نارنگ کسی زخمی سا پر کو طرح پلٹا اور پہیہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ دونوں گھٹے گئے تھے۔ ڈاکٹر نارنگ کسی پا گل کتے کو طرح فریدی کو بھینجوڑ رہا تھا۔ ایک تو دیے ہی کافی طاقتور تھا اور پھر اس وقت کا کیا پوچھنا دوسرے ہی لمحے فریدی کی قوت جواب دینے لگی۔ گولیوں کی آواز ہند ہو گئی تھیں۔ فریدی نے اپنی پورا قوت سے نارنگ کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد شروع کر دی۔

”خبردار نارنگ۔“ دفتدار دروازے کی طرف سے ایک نسوانی آواز آئی۔ ”الگ ہٹو درنہ گوا مار دوں گی۔“

کنوں دروازے میں روپا اور لئے کھڑی تھی۔ نارنگ کے حلق سے عجیب طرح کی ڈراؤن آواز نکلی اور فریدی کو بن اتنا محسوس ہو سکا جیسے وہ بھی نارنگ ہی سے پٹا ہوا کوئی فٹ اچھل گی۔ پھر اس نے کنوں کی گھٹی گھٹی سی چینی سنی۔ نارنگ ایک ہاتھ سے فریدی سے نپٹ رہا تھا اور دوسرے سے اس نے کنوں کو دیکھ رکھا تھا۔ کنوں کے ہاتھ سے روپا اور نکل کر دور جا پڑا۔ وہ کنوں کو بُری طرح دبارہ تھا اور کنوں کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کاوم گھٹ رہا ہو۔ فریدی نے باسیں ہاتھ سے ڈاکنے نارنگ کی ٹاک دبا کر ایک زور دار جھکتا دیا اور اس کا سر اس کا

ہو گیا۔ بہر حال مختصر ایسے کہ میں نے ان کے ٹھکانے کا پتہ تو لگایا لیکن نہ تو ان کے ٹرانسیپٹر کا
سراغ ملاؤ نہ خود ان کا۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں شاید مجرموں نے
ذمہ دی کر دیا۔ لیکن سیکرت سروس کا ہیڈ کوارٹر برادری کے جارہا تھا کہ وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ
انہیں تھوڑے بھی لے رہے ہیں۔ بات عجیب تھی۔ مگر میں اپنے ہی نظریے پر جمارا۔ آخر آج
اکٹر نارگ نے اس بات کا اعتراض کر دیا کہ اس نے ان پانچوں کو ختم کر کے ان کی چیزوں پر
بندہ کر لیا تھا۔ ایک طرف وہ انہیں اپنے جرام کا بھی آلہ کار بناتا رہا اور دوسرا طرف سیکرت
سروس کے ہیڈ کوارٹر سے بھی رابطہ قائم رکھا تھا کہ ان پانچوں کی تھوڑے بھی حاصل کرتا رہا۔
اس طرح وہ حکومت کے اہم رازوں میں بھی داخل ہوتا گیا۔

”لیکن اس کا مقصد کیا تھا.....؟“ کسی نے سوال کیا۔

”مقصد.... اس نے اپنے خلاف لگائے ہوئے الامات کا اعتراض کر لیا ہے لیکن مقصد
مقصد کے متعلق کہتا ہے کہ اس کا اظہار عدالت ہی میں کرے گا۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ ڈی۔ آئی۔ جی نے بے چینی سے پوچھا۔

”میرا خیال! میرا خیال یہ ہے کہ ان کے سارے جرام کے پیش مظہر میں کوئی اہم تعظیم نہیں
تھی۔ اگر اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے ایسا کیا تھا تو میدانی سیاست کے بہترین کھلاڑیوں کو
اپنے بیس میں کرنے کی کوشش کرتا یکن ان کے بر عکس اس کے آدمیوں میں بھی قانون کے
 مجرم نظر آتے ہیں۔ معمولی چور اچکے، قاتل، سازشی اور قانون ناجائز اشیاء کی تجارت کرنے
 والے۔ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ سب کچھ محض دہشت اور انتشار پھیلانے کے لئے
 تھا اور وہ بھی قطعی بلا مقصد! میں اسے ایک طرح کا جنون ہی سمجھنے پر مجبور ہوں۔ میرا دعویٰ ہے
 کہ ڈاکٹر نارگ کسی خفرناک کو مپلکس کا خاکار ہے۔“

”خیر یہ بات بھی کھل ہی جائے گی۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے کہا۔

”اس کے ساتھی ناگر کی مصنوعی خود کشی کے متعلق تو بتا ہی چکا ہوں۔ اگر ایسا نہ کرتا تو ڈاکٹر
نارگ اُسے کسی حال میں بھی زندہ نہ پہنچتا۔ اس کا طریقہ شروع ہی ہے یہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے
کسی ساتھی کے متعلق یہ محسوس کر دیتا تھا کہ وہ پولیس کے ہاتھ پڑ جائے گا تو وہ اسے زندہ ہی
نہیں چھوڑتا تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ مسٹر کیو کا نام بھی پر دہراز ہی میں رہے۔ بہر حال میری

”اچھا! اب تم چلو یہاں سے۔“ ڈی۔ آئی۔ جی بولا۔
”اوپری منزل پر کچھ لاشیں ضرور ہوں گی۔“

”اوہ... چھوڑو... سب دیکھ لیا جائے گا... چلو۔“ ڈی۔ آئی۔ جی نے اسے دروازے کی
 طرف دھکلتے ہوئے کہا۔ ”مگر نہیں پچھلی طرف سے چلیں گے۔ مسٹر ک پر مجھ تھیں اور مجرم کو
 دیکھنے کے لئے بے تاب ہے۔“

وہ دونوں پچھلے دروازے سے نکل کر دوسری سڑک پر پہنچ۔ ڈی۔ آئی۔ جی نے ایک سب
انپکٹر سے کار لانے کے لئے کہا۔

”میں شاید نہیں پیر ہوں۔“ فریدی نہ کر بولا۔ ”اور میرے جسم پر چیختے ہیں۔“

”مجھے افسوس ہے کہ تمہارا کوٹ اور جو تھے جانے کہاں ہوں گے۔ زیو اور تو اٹھایا گیا تو
 لیکن ان کی طرف دھیاں نہیں گیں۔“

اس سڑک اور ساگر میشن سے ایک سو پیس لاشیں اٹھائی گئیں۔ شہر میں ایک بار پھر غزوہ
وہر اس پھیل گیا تھا۔ لوگوں کو اس کی خوشی تو ضرور تھی کہ ایک اتنا خوفناک مجرم گرفتار کر لایا گیا
لیکن ساتھ ہی وہ دل گرفتہ بھی تھے کہ ایک دن میں ایک سو پیس جانیں چل گئیں۔ زیادہ تر لوگ
نے پہلے اسے افواہ ہی تصور کیا کہ مسٹر کیو ڈاکٹر نارگ تھا۔ لیکن پھر یقین تو کرتا ہی پڑا۔ سرجن
حید اور نارگ نے طالوت حصی اور نادره کی لاشیں شاخت کیں۔

مسٹر کیو عدالت میں

محکمہ سراغ رسمانی کا ہاں کچھ بچھ جبرا ہوا تھا۔ شہر کے سارے بڑے حکام موجود تھے۔ اور ادا
رشیدہ کو پہلی صفت میں جگہ ملی تھی۔ سرجن حید ناک بھوں چڑھائے پھٹا پھٹا پھر رہا تھا۔ فریدی

کی تقریر کے دوران میں ایک مرتبہ بھی اس نے ہاں میں قدم رکھنے کی رحمت گو اخیں کی تھی
کیس کی تمہید کے بعد فریدی ایک لمحے کے لئے رکا اور پھر مجھ پر ایک اچھی ہی نظر ڈال کر بولا

”ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مسٹر کیو کی شخصیت بڑے عجیب طریقے پر پر دہراز میں تھی۔ مجھ
پہلے ہی سے علم تھا کہ سیکرت سروس کے پانچ آدمی اس نام کو استعمال کر رہے ہیں۔ میں ان کے
ٹھکانے سے واقع نہیں تھا۔ لیکن اس اطلاع کے بعد ان کے متعلق چھان بین کرنا ضرور ہا۔“

باکہ ایسی صورت میں کسی ایک جگہ رہنا ممکن نہیں تھا ابھی میں شہر ہی تک حدا و تھا کہ ساجد اور رکے تجربات کا علم ہوا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مسٹر کیو پر ہاتھ ڈالنے کا ایک طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں بھی مجرموں کا روول ادا کر کے اس تک بچنپوں۔ کچھ ایسے جرام کروں جو مسٹر کیو کو نی طرف متوجہ کر لیں اور وہ مجھے بھی بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل ہونے پر مجبور رہے۔ میں اسی ادھیر بن میں مصروف ایک شام راجر و پ گر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ب کار ایشی ہوئی کار پر نظر پڑی۔ وہ غالباً ایک درخت سے ہٹکا کر ایشی تھی۔ وہ سڑک عموماً دیر انہار ہتھی ہے۔ اس لئے شاید ابھی تک کسی نے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ بہر حال اس کا رہا میں نے جیس ایڈ جعفری کا جز لیجیر جعفری دکھائی دیا جو بہت زیادہ زخمی ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے راب کی بو آرہی تھی۔ بس اسی وقت اچانک میری اسکم مرتب ہو گئی۔ جعفری دیکھنے میں خاصاً راہنماء معلوم ہوتا ہے اور کچھ جعلی سا بھی ہے۔ شہر میں نہیں رہتا۔ دیہاتوں اور غیر آباد مقامات اس نے چھوٹے چھوٹے مکانات بنا رکھے ہیں۔ انہیں میں اس کا قیام رہتا ہے۔ میری اس کی نی رکسی سی ملاقات تھی۔ میں نے سوچا اس سے کام لینا زیادہ مناسب رہے گا۔ میں نے اسے ایشی دی کار سے نکال کر اپنی گاڑی میں ڈالا اور راجر و پ گر کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے جعفری کو اپنے ایک دوست ڈاکٹر شوکت کے سپرد کیا اور اسے ساری باتیں سمجھادیں۔ مجھے توقع ہی تھی کہ جعفری کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا اور بھی ہو۔ وہ ہوش میں آنے کے بعد ڈاکٹر دکٹر ہی کا مہمان رہا۔ بہر حال اس کے دفتر میں کسی کو میرے متعلق ذرہ برابر بھی شہر نہ ہوا اور میان ہی کیوں دیتا۔ دفتر والے تو اس سے لرزتے ہی رہا کرتے تھے.... پھر میں نے رشیدہ کو اس کے دفتر میں جگہ دی۔ شروع ہی سے ارادہ تھا کہ اپنے جرام کے ذریعہ رشیدہ ہی کو بناوں گا۔ اسے سا کا ذرہ برابر بھی علم نہ تھا کہ وہ فریدی جس نے اسے وہاں ملازمت کرنے کی ترغیب دی ہے۔ بدی جعفری بھی ہے۔ اس طرح اس کے دل میں بناوٹ نہیں ہونے پائی۔ جس دن دفتر کی ااشی ہوئی اسی دن میرا نام مسٹر کیو کی لسٹ میں آگیا۔ اس کے آدمی میرے متعلق اور زیادہ طورات فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہے.... اس کے گروہ کی ایک لڑکی کنوں نے اس کا پہنچا لیا تھا کہ اس تلاشی میں رشیدہ ہی کا ہاتھ تھا۔ بہر حال میں رشیدہ کو لے اڑا۔ مسٹر کیو کا کوئی آدمی بڑی کار کا تعاقب کر رہا تھا میں نے اس کا ایک ناٹر چھاڑ دیا۔ محض اسے یہ باور کرانے کے لئے کہ

احتیاط سے اتنا تو ہوا کہ ناگر نئے گیا۔ لیکن مسٹر کیو کو اس کی خود کشی پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس لئے اس نے خود ہی اپنا نام اپنے ہی ذریعہ سے ظاہر کر دیا۔ اس میں بھی اس کی ایک گہری چال تھی۔ ”چاہتا تھا کہ وہ خود ہر طرح کے شبہات سے بالاتر ہے۔ جو کہ سب سے پہلے اس کا دیکھی بجلی مگر سراغ غرہ سانی کے ایک فرد سر جنت حید کو مشتبہ معلوم ہوا تھا اس نے اس نے ہر طرح سے اپنا صفائی ضروری سمجھی اور میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ اگر حید کو اس بنگلے میں وہ حادثہ نہ پیش آیا ہو تو ہم آج بھی ان سارے جرام کی روح روائی سے ناوافع ہوتے۔“ ڈاکٹر نارنگ نے اپنے ساتھیوں کی اس حمایت پر پرودہ ڈالنے کے لئے اتنے پاپڑ میلے کہ اس سے غلطیاں ہی سرزد ہوتی چلی گئیں اور نتیجے کے طور پر اسے قانون کی گرفت میں آ جانا پڑا۔... ہاں تو... کرٹل فریدی کے سیکریٹری ساجد اور نارنگ کے ساتھی ناگر کے بیان سے مجھے اس کے طریقہ کار کا علم ہوا جو بڑا عجیب تھا۔ وہ ایسے مجرموں کو بلیک میل کر کے اپنے گروہ میں شامل کر لیتا تھا جن کے جرام سے پولیس بھی لا علم ہوتی تھی اور اس کے لئے وہ سیکرٹ سروس والوں کا ٹرانسپرٹ استعمال کرتا تھا۔ اس طرح وہ اپنے ساتھیوں کے لئے بھی معہ بنا ہوا تھا۔ اس نے یہ چیز بھی ان کے ذہن نہیں کراوی تھی کہ اگر ان میں سے کسی... کبھی مسٹر کیو کی خصیت کار از معلوم کرنے کی کوشش کی تو ختم کر دیا جائے گا اور اس نے کئی... بیوں کے ساتھ ہی برتاؤ بھی کیا۔ صرف ساجد ہی ایسا تھا جو نئی گلی۔ وہ بھی اگر پاگل خانے کی ریلیتا تو اس کی زندگی بھی ناممکن تھی۔“

”بھی... وہ جعفری والا واقعہ۔“ ”ڈی۔ آئی۔ جی۔“ مضرط بانہ انداز میں بولا۔ ”ای کی طرف آ رہا ہوں۔“ فریدی نے مکراتے ہوئے تقریر جاری رکھی۔ جب مجھ پر اور حید پر حملہ ہوا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ روپوش ہو جائیں۔ مجھ سے دراصل ایک زبردست غلطی ہوئی تھی۔ اس مائنگر و فون والے واقعہ میں بھی مجھے رازداری ہی برتنی چاہئے تھی۔ بہر حال مجھ پر وہ حملہ ڈاکٹر نارنگ کی جھلاتھ ہی کا نتیجہ تھا۔ اس طرح میں نے اس کا ایک محیر العقول حرہ قطعی بیکار گر دیا تھا۔“

”وہ اڑنے والی رائفل کہاں ہے۔“ ”متعدد آوازیں آئیں۔“ ”ابھی تک نہیں برآمد ہو سکی۔ ڈاکٹر نارنگ نے ابھی تک اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ بہر حال میں اپنی روپوٹی کے لئے کسی اچھی سی جگہ کی تلاش میں تھا اسی دوران میں میں نے فیملے

ہرگز کی طرف سے فون کیا۔۔۔ اور پھر جو کچھ بھی ہوا آپ جانتے ہی ہیں۔۔۔“

تمام و اتفاقات صاف ہو چکے تھے لیکن لوگ نارگ کا بیان سننے کے لئے بے تاب تھے۔ جس نے عدالت میں ڈاکٹر نارگ کا بیان ہونے والا تھا کہیں تل رکھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ صرف ذمہ دی کا داخلہ ہو سکا تھا۔ عوام سڑک پر اور عدالت کے صحن میں بھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نارگ نے بڑی شرافت سے استدعا کی تھی کہ باہر والوں تک اس کی آواز پہنچنے کے لئے نائکرو بن کا انتظام کیا جائے۔ پہلے اس کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی لیکن جب اُس نے اس بات کا یہ دایا کہ ملک کے مفاد کے خلاف ایک لطف بھی نہیں کہے گا تو درخواست منظور کر دی گئی اس نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ کوئی ایسی بات شروع کرے تو مائکرو فون کا سلسلہ منقطع بھی کیا جاسکتا ہے۔۔۔ بڑی عجیب درخواست تھی۔

نارگ تین یوں کے کپڑے پہنے ہوئے کٹھے میں بیٹھا تھا۔ لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ پہلے سے بھی زیادہ تدرست نظر آرہا تھا۔ چہرہ سرخ تھا اور آنکھوں میں عجیب طرح کی چک طر آرہی تھی۔ جب وہ اپنا بیان دینے کے لئے کھڑا ہوا تو عدالت میں نشانا چھا گیا۔ پھر حلف دینے اور سم شروع ہونے والی تھی کہ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کسی موبوہم ہستی کو درمیان میں لانے ماض درست نہیں میں جو کچھ بھی کہوں گا کچھ ہی کہوں گا۔ البتہ میں پہنچے ہوئے خون کی قسم کھا سکتا ہم۔ کیونکہ خون ریزی ہی میرانہ ہب رہا ہے۔ لوگ میرے جامن کا مقصد جانے کے لئے بے ب ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو مقصد کسی نہ ہب کا ہو سکتا ہے وہی میری خوزیری کا بھی تھا۔ ہب انفرادی اور اجتماعی سکون کا ذریعہ ہے اور میں صرف انفرادیت میں یقین رکھتا ہوں مگر مالکے اجتماعی زندگی نے مجھے حرایی قرار دیا تھا۔

حراییاں میں حرایی ہوں۔۔۔ میری سمجھیدگی پر کئی مدد حیرت سے کھل گئے ہیں۔۔۔ کچھ سکرا کیا رہے ہیں اور آئریبل چف جسٹس یہ سوچ رہے ہیں کہ شاید اب میں پاگل پن کا ڈھونگ چلنے جا رہا ہوں۔۔۔ اپنے کپڑے چھاڑاں گا اور بھر اس وقت تک پہانی سے پھاڑوں گا جب سمجھے پاگل خانے میں قیام کرنا پڑے گا۔۔۔ نہیں میں باہوش و حواس کہہ رہا ہوں کہ میں حرایی نہیں۔۔۔ میں اپنی ماں کی شادی کے نھیک پانچویں میٹنے میں پیدا ہوا تھا۔ اس سانچے پر اس نے تو دل کر لی تھی لیکن وہ شخص جس سے اُس کی شادی ہوئی تھی۔۔۔ میں اس کا تذکرہ اتنے عامیانہ

میں اُسے پولیس کا کوئی آدمی سمجھا ہوں۔ جس مکان میں رشیدہ کو لے گیا تھا وہ جعفری ہی کا ہے اور ایک غیر آباد مقام پر واقع ہے۔ میں نے کئی دنوں سے دہیں بودو باش اختیار کر کھی تھی اور برادر یہ محسوس کرتا رہا تھا کہ اس کی مگر انہی ہو رہی ہے۔ لیکن میں بظاہر بے پروا نظر آتا ہے۔۔۔ ہل، توجہ میں رشیدہ کو باندھ رہا تھا تو ہم پر ایک تیز قسم کی روشنی ڈپنی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کسی فلیٹ کر رہے کی ہے۔ اس پر میں نے چین چلا کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ وہ کسی پولیس والے کی حرکت تھی۔ میں نے عدالت شیدہ سے ساری گفتگو اونچی آواز میں کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ جرہا تھا کہ کہیں اسے۔ مشریکو کے آدمی نہ اٹھا لے جائیں۔ کیونکہ انہیں کئی ایسے آدمی کی شدت سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی جو فریدی کا پتہ اور نشان جانتا ہو۔۔۔ دوسرے دن صحیح میں نے رشیدہ کو بے ہوش کر کے ایک سڑک میں ڈالا اور اس کے اوپر پیال لاد دیا۔ اس طرح اسے بھی راجروپ نگر پہنچا اس وقت میں جعفری کی شکل میں نہیں تھا۔ گرانی کرنے والے اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اس لئے میدان صاف تھا۔۔۔ دوسرے دن آفس میں بھے وہی تصویر ہی جو میں نے بعد میں انور کو بیچ ڈی تھی۔ تصویر کے ساتھ ہی مشریکو کا ایک دھمکی آمیز خط بھی تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اگر میں اس کے گروہ میں نہ شامل ہو اور اس کے احکامات کی تعلیم نہ کی تو وہ تصویر پولیس کے حوالے کر دی جائے گی۔ میرا جواب اس نے ایک دیران جگہ پر مانگا تھا۔ میں نے جواب لکھ کر وہاں رکھ دیا۔ خط و کتابت جاری رہی۔ جس کے ذریعے اس نے مجھے کئی جرام کی ترغیب دی۔ بہر حال میں پیغام رسائی کے طریقے کا راز جانے کا کوشش رہا۔ پھر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس کے خطوط کی ہاتھوں سے گذرتے ہوئے مجھ تک پہنچتے ہیں۔ اسی طرح وہ خط بھی کی ہاتھوں سے گزرتا ہوا ساگر میشن تک پہنچا تھا اور پھر وہاں سے اسے کوئی نامہ بر کو تڑا ڈاکٹر نارگ تک پہنچا دیتا تھا اور ڈاکٹر نارگ کا ناٹپ کیا ہوا خط کو تر ہی کے ذریعے ساگر میشن تک پہنچتا تھا۔ مجھے کئی دنوں تک ان کبوتروں کا تعاقب کرنا پڑا۔ جا کر یہ راز کھلا کر وہ ڈاکٹر نارگ کی کوٹھی پر اترتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی کئی راتیں چوروں کی طرح ساگر میشن اور نارگ کی کوٹھی کی علاشی لینے میں صرف کیس اور جب مکمل طور پر اس بات کا یقین ہو گیا کہ اصل مجرم نارگ تھا ہے تو میں نے وہ تصویر انور کو بیچ ڈی۔ جب جعفری کے دفتر کی علاشی ہو رہی تھی تو اس وقت میں سڑک ہی پر موجود تھا۔ لیکن دوسرے بھیں میں۔ ذہی۔ آئی۔ جی کی واپسی پر میں نے انہیں ڈاکٹر

بچے ہیں کہ حرای ہر حال میں مرنے سے قبل خود کو جہنم کا مستحق بنا لیتا ہے چلے حرای کو راہ مستقیم
خی بھی محروم کر دیا گیا۔ پھر آخر کیا کرے کہاں جائے۔ بتاؤنا... بولو... جواب دو۔“
ڈاکٹر نارنگ خاموش ہو کر مجھ کو کہا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”کوئی نہیں بولے گا۔“ اس نے زبر خند کے ساتھ تقریر پھر شروع کر دی۔ ”میں بہت
جگ بڑھ آیا۔ لوگ یہ جانے کے لئے بیتاب ہوں گے کہ ایک حرای ایم۔ پی کیسے بن گیا۔ اسے
عن کس طرح مل گیا۔ میں انہیں مایوس نہ کروں گا۔ ہاں تو میں اس ہوٹل سے فرار ہو گیا اور یہ
پر کریا کہ کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں مجھے کوئی جانتا نہ ہو۔ میں اس میں آج تک کامیاب رہا۔
سے گھنیا سے گھنیا مزدوریاں کیں مگر تعیین نہ چھوڑی۔ سیاست میں ایم۔ اے کرنے کے بعد
بابا قاعدہ طور پر میدان سیاست میں اتر آیا تیکن وہ حرای والا کو ملکس اب بھی مجھے بے چین کئے
رہے تھے۔ مجھے آدمی سے نفرت تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اگر کسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں حرای
ل۔ تو ساری عظمت آن کی آن میں ڈھیر ہو جائے گی۔ جھنجھلاتھ نے میری خون کی پیاس بوجھا
لہ کسی بھی آدمی کو بے بن کر کے مجھے پچی خوشی حاصل ہوتی تھی۔ میں ایک ایسے مبارک
ت کے خواب دیکھا کرتا تھا جب ایک ایسی قوت میرے ہاتھوں میں ہو کر لوگ اس کے آگے
بے بن ہو کر رہ جائیں۔ مجھے افتخار کی خواہش نہیں تھی۔ میں تو لوگوں کو خوفزدہ دیکھنا چاہتا تھا۔
نیوں کی کراہیں اور مرنے والوں کی بھیکیاں سننا چاہتا تھا۔ میں حرای خاص لئے خود کو جہنم کا
حق بنا رہا تھا۔۔۔ جہنم...!“

نارنگ نے رک کر قہقهہ لگایا۔ ”جہنم...! کیا شہر اس دوران میں جہنم نہیں تھا کیا میں اس
م کا مستحق ہرگز نہ بتا۔ میرا خیال ہے کہ دنیا کے نیک اور شرف آدمیوں میں کم از کم پائچ
مذی حرای ضرور ہوں گے لیکن وہ اس لئے قابل نفرت نہیں ہیں کہ ان کی ماڈل نے انہیں یہ
تھیا ہو گا کہ وہ حرای ہیں۔ لہذا وہ سو فصدی بہشت کے مستحق ہیں۔“

ڈاکٹر نارنگ کی آواز دھمکی پڑ گئی اور وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں نے اپنے حرایم کا اعتراف کریا
، اور ابھی میں بعض مصکنے خیز قسم کے فیصلے سنوں گا۔“
”آرڈر... آرڈر...!“ بخ میز پر ہاتھ بار کر بولا۔
”میں اب بھی وقت کا سب سے بڑا آرڈر ہوں۔“ ڈاکٹر نارنگ نے قہقهہ لگایا۔ ”اس مقدے

انداز میں کر کے اس کی توہین کر رہا ہوں... دو دنیا کا عظیم ترین شخص تھا میں تو اسے خدا مل کر
کے لئے تیار ہوں۔ اس نے مجھے اپنے بیٹے کی طرح پالا اور پھر دوسری شادی نہ کی۔۔۔ ہوش
سنجلے پر مجھے یہ سمجھایا گیا کہ حرای کہتے کے ہیں... میری ماں کا شوہر اس پر جھنجھلا تا اور اپنی
بوٹیاں نوچتا۔ گاؤں بھر سے اس نے دشمنی مولے لی لیکن پھر بھی وہ میرے لئے دوسرے دل سے
لڑتا رہا۔ عمر تین اپنے بچوں کو میرے ساتھ کھلینے سے روکتی تھیں میں بچپن ہی سے بڑا حس
تھا۔ مجھ پر عرصہ حیات نگہ ہو گیا۔ کچھ اور بڑا ہوا تو سوچنے لگا کہ آخر حرای ہونے میں میرا اپنے
صور ہے۔ میرے پالنے والے نے نجک آکر مجھے شہر کے ایک ہوٹل میں بیچج دیا۔ بچپن ہی سے
ذہین تھا۔ لکھنے پڑھنے میں دل زیادہ لگتا تھا۔۔۔ میں تعلیم حاصل کرنے میں مصروف ہو گیا لیکن
ہاں بھی مشکل سے ایک ہی سال سکون سے گزار پایا۔ دوسرے سال اسی ہوٹل میں میرے
گاؤں کے دو ایک لڑکے اور بھی آگئے۔ مجھے پھر وہی آوازیں سنائی دینے لگیں۔۔۔ ڈاکٹر نارنگ،
ایک لفڑ کے لئے رکا۔ عدالت میں نشانا چھا گیا تھا۔ وہ جند لئے مجھے کو گھورتا رہا پھر گرج کر بولا۔
”مجھے بتاؤ میں کیا کرتا۔۔۔ مجھے جواب دو؟ اگر کوئی مادرزاد لگنگا ہو تو لوگوں کو اس سے ہمدردی
نہوتی ہے۔ مادرزاد اندھے ہندوؤں میں سور داں اور مسلمانوں میں حافظ کہلاتے ہیں۔۔۔ لیکن
میں... کیا میں بذات خود ایک بہت بڑی مجبوری...۔۔۔ نہیں تھا، کیا میں ایک بیماری کی طرح نہیں
بیڈا ہوا تھا۔ اگر میں شاستر پڑھ لیتا جب بھی حرای ہی رہتا۔ اگر قرآن بھی حفظ کر لیتا تو لوگ مجھے
حافظ کہتے ہوئے بچکاتے۔ آخر کیوں! کیا میں بھی ایک لگنگے یا اندھے کی طرح اپنی بیڈاں کے
معاملے میں بے بن نہیں تھا۔۔۔ زانی اور زانیہ اگر تائب ہو جائیں تو خدا ان کے گناہ معاف کرنا
ہے لیکن میں تمہارے خدا سے پوچھتا ہوں کہ آخر اس نے حرای کو کیوں اپنے بندوں کے رحم
کرم پر چھوڑ دیا ہے۔۔۔ وہ جس کا میں لطفہ ہوں وہ اگر تائب ہو کر مولوی یا پنڈت ہو گیا ہو گا۔
لوگ اس کے قدم چوم رہے ہوں گے اور وہ بہشت یا سو رگ کی آس لگائے بیٹھا ہو گا۔
لیکن... میں... میں کس طرح خود کو بدلتا ہوں۔ میں حرای ہوں۔ کوئی عادت نہیں ہو ر
کہ بدلتا جاؤں... میں ماضی... حال... اور مستقبل تینوں سے محروم ہوں۔ حال مخفی از
لئے کامیاب رہا کہ میں خود کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا۔ اگر واقعی کوئی دوسری زندگی بھی ہے
تو... میں اس سے بھی مایوس ہوں کیونکہ بعض مذاہب حرای کو ہر حال میں جہنمی قرار دیتے ہیں

کے دوران میں میں نے کئی بار عدالت کی توہین کی ہے۔ اس لئے چھانی کے ساتھ توہین عدالت کے سلسلے میں چھ ماہ کی سزا ضرور رکھی گئی ہوگی۔ لہذا میں عدالت سے درخواست کروں گا کہ چھانی کے بعد ہی مجھے چھ ماہ کی سزا نے قید دی جائے۔“

حاضرین کے قبیلے کی طرح رک نہ سکے۔

عدالت نے پھر میز پر موگری بجائی شروع کر دی۔

عدالت برخواست ہونے پر فریدی بہت زیادہ سمجھیدہ نظر آرہا تھا۔ حمید کے چھیڑنے پر

آہستہ سے بولا۔

”اگر یہ غلط راستے پر نہ نگل گیا ہوتا تو بڑا عظیم آدمی ہوتا۔“

”اوہ نہہ...!“ حمید نے نہ اسامنہ بٹالیا۔ ”کنوں کا کیا رہا۔“

”وہ اور ناگر سرکاری گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں! ظاہر ہے کہ بری ہو جائیں گے۔“

”وہ را کلقل نہ جانے کیا ہوئی۔“

”کیا تم بچلی کاروایوں کے دوران سوتے رہے ہو۔ اُس نے اسے اسی وقت جاہ کر دیا تھا جب میں نے مائیکروfon کے انتشار کے لئے آرڈر نکلوائے تھے۔“

ڈاکٹر نارنگ کی چھانی کا منظر بھی عجیب تھا جنہوں نے اسے اس وقت دیکھا تھا ان کا بیان ہے کہ وہ گوشت و پوست کا آدمی تو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف یا اضلال کی ملکنگی تھی۔ جب اس سے اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو مسکرا کر بولا۔ ”پوچھنے سے کیا فائدہ جکبہ پوری بیانہ کی جاسکے۔ میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ جتنے بھی موبوڈ ہیں انہیں بڑے بے دردی سے قتل کروں۔ آخری خواہش پوچھنے کا ذکر سلسلہ بھی عجیب ہے! اچھا خبر چلا اگر پوچھنا ہی ہے تو ایک بڑی معمولی سی خواہش پوری کر دو۔ میرے سر نے سے پہلے یہی کہہ دو کہ ڈاکٹر نارنگ حرمتی نہیں ہے۔“

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی سے کھڑا اس مجمع کو دیکھتا رہا تھا گویا سانپ سو گھنے گیا تھا۔ پھر اس

نے ایک زہریلا سا قبیلہ لگایا اور بلا تکان چھانی کے تنخے پر چڑھ گیا۔

ختم شد